زمین پر برپا فساد سے گھبرائے خواتین و حضرات کے لئے ہنستی مسکراتی تحریروں کا مجموعہ

تیس روزہ

چاند

لاہور

اکتوبر 2012ء

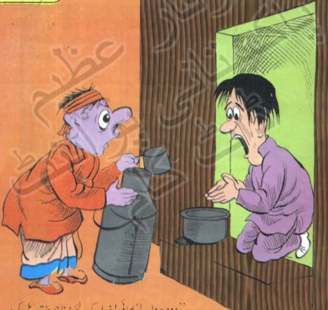

''دودھ والے بھائی! خدا کے لئے اپنا جوہڑ تبدیل کرو۔
ہمیشہ مینڈک ہی نکلتے ہیں' کبھی مچھلی بھی لاؤ نا---!''

قیمت: 50روپے

یہ وہاں ہے

کارٹون	ادارہ	5
نھی بیتیاں	مستقل عنوان	9
گلیاں رنگ رلیاں	ن۔م	11
خوناک لوڈشیڈنگ	حافظ مظفر محسن	13
نگاہ انتخاب	سعید خان	15
سوچ بچاری	شاہد اطہر	19
بکرے کی تلاش	ظفر ندیم وہرہ	29
قربانی کے بکھیڑے	نامعلوم	35
بھیں بھیں	کے۔ ایم خالد	45
لوڈشیڈنگ اور مخبری اطلاع	ڈاکٹر محمد یونس قریشی	50
نوخیز کرن	محمد فاروق انجم	51
زیست کی گلیاں	منظور احمد اعوان	57
آخری مشاعرہ	طارق شاہین وسیر	67
قصہ ایک ماتم کا	محمد ریحان	75
جان عالم	فاروق احمد انصاری	81
فیتیاں	گل نوخیز اختر	85
توہمات کی دنیا	ڈی۔ ریڈیفیش	89
دلچسپ سفر	عاطف	93

چاند نگر

کبھی ہاں، کبھی ناں	فصیح انجم	97
شوہروں کی اقسام	معراج یاسمین	98
کراچی	ڈرائیور عبدالرؤف	99
پھلیئر	پروفیسر محمد ظریف خان	101
ایک صبح	محمد اشفاق ایاز	103
دانت شکن	سید ابرار بخاری	104
روداد سفر	خادم حسین مجاہد	106
بھوکی ڈائری	محمد سعید خان	108
☆ ☆		
ٹکریں	ماہر ٹکریات	110
سندیسے	رقعہ باز	112

☆☆ ☆☆

روح اللہ روح، سید فہیم الدین، اکبر بخاری، ریاض احمد قادری، نوید ظفر کیانی، مرزا عاصی اختر، اکبر ملک، نعیم نیازی، محمود بابا اور پروفیسر ظریف خان کے خوش رنگ کلام کے علاوہ قہقہہ بار کٹ پیس، کارٹون اور دیگر مسکراہٹیں صفحہ بہ صفحہ!

برائے رابطہ: 0312/0333-4284875

قیمت: 50 روپے

بانی وحشی مارہروی

مہینہ بھر کے قہقہوں اور مسکراہٹوں کا راشن

تیس روزہ

چاند

لاہور

CPL-192

جلد نمبر: 65 شمارہ نمبر: 05

اکتوبر 2012ء

محرمار خصوصی

ناکھدائے اعظم، صدر الہام کنوارا کلب، انجمن ریش درازان پاکستان، دشمن عقل و عریانی، تاریک العورات، رقیب زن مریدگان و مجروح فیشن زدہ دوشیزگان

ابوالمزاح استی خواہ مخواہ

پیر جنگلی علیہ ماعلیہ (افریقہ پلٹ)

مدیر اعلیٰ خالد بن حامد

مدیران صباحت زیاد خالد

ناظم طباعت ○ رانا نذیر احمد ● کمپوزنگ ○ سیف اللہ

کاغذی گھوڑے دوڑانے کا پتہ

"چاند"

شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور

''ابے عقل کے اندھے ایسے جسے تو دھکا دے رہا ہے، یہ وہیل مچھلی ہے، جمہوری حکومت کی طرح یہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔۔۔بس اب تو اپنا شمار پاکستانی عوام میں سمجھ۔''

''تم مجھے بیوقوف مت بناؤ، بیٹی! یہ کوئی تمہاری کیلی نہیں، بوائے فرینڈ ہے۔۔۔لڑکے بھی تو اب یہی حلیہ بنائے پھرتے ہیں''

''یہ تم اتنے غور سے میرے منہ کی طرف کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔بتایا تو ہے کہ آفس میں بہت کام تھا اس لئے لیٹ ہوگیا۔۔۔''

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا" ۔۔۔ ہر لڑکے کا پسندیدہ جملہ! ☾ غزل رانی

"میں تو کہتی ہوں، اپنی اس چہیتی کو کسی طرح وزیر یا مشیر لگوا دو۔ لاڈلی کے سارے پچھن ان جیسے ہی ہیں۔۔۔"

"انسانوں کی خوراک تو بہت مہنگی ہوگئی ہے، بیگم! یہ کتوں کی خوراک پر سیل تھی، میں یہی لے آیا ہوں۔۔۔ ویسے بھی ہم اب انسان کہلانے کے قابل کہاں ہیں؟"

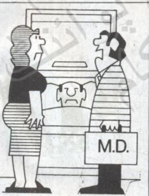

"صاحب کو ہوا کچھ نہیں، بیگم صاحبہ! بس آپ ان کو کچھ دنوں کے لئے یہاں ہسپتال میں تنہا چھوڑ دیں، ٹھیک ہو جائیں گے۔"

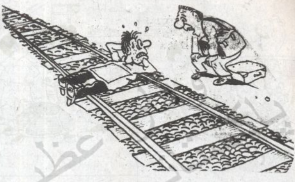

''خودکشی کرنی ہے تو بازار کا ایک چکر لگاؤ، قیمتیں سن کر ہی ہارٹ فیل ہو جائے گا--- یہاں تو سالوں لیٹے رہو گے مگر ٹرین نہیں آئے گی، بھائی!''

''میں تو سمجھا تھا کہ دفتر کے لوگ غصے میں باس کو کتا کہتے ہیں، یہ تو واقعی کتا ہے---''

''ہم تین سال بعد ملے ہیں، دوست! لیکن تمہارے پاس اب بھی و
چیزیں ہیں، حتیٰ کہ تمہاری ماں بھی وہی ہے--- کمال ہے!''

موبائل فون بیلنس کے بغیر اور مرد عورت کے بغیر ناکارہ ہی سمجھے جاتے ہیں ☾ یمنٰی احمد

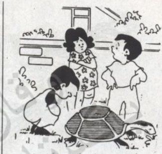

''بابا کہتے ہیں، یہ ہمارے ریلوے کا محکمہ ہے۔ منزل کی طرف چل پڑتا ہے۔ کب پہنچے گا، پتہ نہیں---''

''سنا ہے، بھائی! دنیا میں تو ایک ملک پاکستان ایسا بھی ہے جہاں کے لوگ ہماری زندگی پر رشک کرتے ہیں---''

''چار بچے--- یہ ایک تو میرا ہو گیا، باقی تین کا باپ کون ہے--- بتاؤ؟''

''لگتا ہے، آپ کے دماغ کی طرح دل کا خانہ بھی خالی ہے، بھائی! اب اس عمر میں تو کوئی آپ کو دل بھی نہیں دے سکتی--- ہا، ہا، ہا!''

مس غزالہ ثاقب کو "دیومالائی" حسن کی بناپر "عینک والا جن" میں کرنانی کے رول کی پیشکش! 😜 نازرزن 421

ہنس بیتیاں

کبھی کوئی مکالمہ، کسی کی معصومیت یا بدحواسی پر بے ساختہ قہقہے وارد ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی واقعہ پر بے تحاشہ ہنسی آئی ہو تو ایک کاغذ پر ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم ان صفحات پر اسے آپ کے نام سے جگہ دیں گے اور چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اس واقعہ سے لطف اٹھا سکیں، ہنس سکیں۔ کسی لطیفے کو توڑ مروڑ کر واقعہ بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ واقعہ کاپی سائز کے دو صفحات سے زیادہ نہ ہو، اخلاق سوز نہ ہو۔ سب سے زیادہ قہقہہ آور واقعہ پر سال بھر کے لئے چاند مفت بطور انعام دیا جائے گا۔ واقعہ اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج "ہنس بیتیاں" تمیں روزہ "چاند" 31-F "شمع پلازہ" فیروز پور روڈ لاہور 54600

مطلب	مہک خان

میں اپنی چھوٹی بھتیجی کا ٹیسٹ لے رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "it" کا مطلب بتاؤ، کیا ہے؟---وہ کہنے لگی۔

"آپی مجھے نہیں پتہ---"

میں نے غصے سے کہا۔ "الو! ابھی تک تجھے it کا نہیں پتہ؟"

پاس ہی میری نانی بیٹھی تھیں، وہ جلدی سے بولیں۔

"مہک! کیوں ڈانٹ رہی ہو بچی کو---it کا مطلب اینٹ ہوتا ہے۔"

یہ سن کر ہم سب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

بات تو سچ ہے	محمد محبوب ملک، مظفر آباد

یہ ڈرامہ میں نے اپنے دوست شکیل کے ساتھ کیا، آپ شکیل کی زبانی سنیں۔

میں جمعہ کی تیاری کے لئے نہا رہا تھا کہ اچانک میری ماں نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا اور مجھے فوراً سے پیشتر باتھ روم سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے کپڑے پہنے اور کنڈی کھولی تو ماں ہاتھ میں کپڑے دھونے والا ڈنڈا پکڑے کھڑی تھی، ماں کے پیچھے نارزن (نوید) تھا۔

"کہاں ہے وہ مردود صبا---؟"

ماں نے مجھے تقریباً گھسیٹ کر باتھ روم سے باہر نکالا۔ اس دوران نارزن جو مجھ سے ملنے آیا تھا، آگے بڑھا اور صابن کا ریپر اٹھا کر بڑے فخر سے بولا۔

"یہ دیکھیں ماں جی! میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا، یہ اندر صبا کے ساتھ نہا رہا تھا۔"

اب میں نے جو ریپر دیکھا تو میرے قہقہے ابل پڑے، وہ صبا سوپ کو اپنی مرضی کا رنگ دے رہا تھا--- اب وہ سارے برآمدے میں آگے آگے اور ماں ڈنڈا لہراتے اس کے پیچھے تھی۔

ریفلیکشن	محمد فیضان، ہری پور

یہ واقعہ میرے سکول کا ہے۔

ایک دن میں کسی کام سے سٹاف روم گیا۔ وہاں پر ہمارے انگلش کے سر اظہر (جن کے سر پر بہت کم بال تھے) اور فزکس کے سر مختار صاحب بیٹھے تھے۔ یہ دونوں گہرے دوست بھی تھے---اظہر صاحب نے مجھے کہا۔

"بیٹا! ذرا کھڑکی بند کر دو، دھوپ آرہی ہے۔"

اس پر مختار صاحب نے ان کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دھوپ تو ان کو لگ رہی ہے پر ریفلیکشن ہمیں ہو رہی ہے۔"

ان کا یہ جواب سن کر سٹاف روم میں موجود تمام ٹیچر ہنسنے لگے اور اظہر صاحب کی صورت دیدنی تھی۔

دوست	توصیف احمد، میانوالی

میں آفس میں بیٹھا تھا کہ اچانک میرے دوست فیصل کی کال آگئی، بولا۔

"میری ایک دوست ہے روبی، آج کل بہت تنگ کرنے لگی ہے۔ پلیز اس کا نمبر بلاک کر دو۔"

میں نے کہا۔ "تم مجھے ایس ایم ایس کر دو، میں ذرا مصروف ہوں۔ فری ہوتے ہی کر دوں گا۔"

تھوڑی دیر میں ایس ایم ایس پھر آگیا۔

"یہ نمبر بلاک کر دو---" آگے نمبر لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ اس کی کال آگئی۔ بولا۔

"یار! پلیز، وہ نمبر بلاک مت کرنا۔"

"کیوں بھائی! کیا ہوا، ارادہ کیوں بدل گیا؟" میں نے حیرانی

سے پوچھا۔

یار! کیا بتاؤں، جو ایس ایم ایس تمہیں کیا تھا وہ میں روبی کو بھی بھیج بیٹھا ہوں۔"

اس کی یہ بات سن کر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور وہ شرمندہ ہوگیا

دعا	✿ ظفر ندیم وہرہ، حیدر آباد

نماز کی ادائیگی کے بعد ہماری مسجد کے پیش امام دعا مانگ رہے تھے۔ اس وقت حسب معمول بجلی غائب تھی اور نمازی پسینے سے نہار ہے تھے۔ ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔

"اس پر امام صاحب مسکرائے اور بولے۔

"بھائی! میں دعا تو مانگ دوں گا لیکن اگر اللہ میاں نے اوپر سے بجلی گرادی تو لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟"

جوابی حملہ	✿ ایم نعیم نوشاد

ہم چند دوست پکنک منانے جار ہے تھے۔ بس میں بھیڑ بہت تھی، مجبوراً مجھے گیٹ پر ہی کھڑا ہونا پڑا۔ بس اور لوڈ ہونے کے باوجود کنڈیکٹر چیخ رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے بس چلی ہی تھی کہ ایک اڈھیر عمر کے صاحب آ کر بس میں چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے انہیں کہا۔

"محترم! بس میں جگہ نہیں ہے، دوسری بس میں آجایئے گا۔"

انہوں نے جواب دیا۔" دل میں جگہ رکھو، بس مین بہت جگہ ہو جائے گی۔"

میرا دوست عارف بھی کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اسے شرارت سوجھی، کہنے لگا۔

"دل میں تو جگہ حسینوں کے لئے ہوتی ہے، آپ اس لائق کہاں۔"

اتنا کہنا تھا کہ پوری بس قہقہہ زعفران بن گئی۔

آدم خور	✿ محمد بخش بھٹی

میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا کہ ٹرین ایک سٹیشن پر رکی اور ایک ان پڑھ برات معہ دولہا میرے ڈبے میں سوار ہوگئی۔ میری نظر اچانک دولہا پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ دولہا نے سہرا الٹا پہنا ہوا ہے۔ ماتھے والا حصہ دوسری طرف تھا۔ اس کی پشت پر جو اس وقت اس کے ماتھے پر تھی، ایک اردو اخبار کا کاغذ چسپاں تھا جس کے اوپر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"آدم خور---!"

یہ شاید کسی فلم کا اشتہار تھا جو اس وقت دولہا میاں کا عنوان بنا ہوا تھا۔

لکھنو سے	✿ ایثار احمد

پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ میں پانچویں جماعت میں تھا۔ ماسٹر صاحب حساب کا سوال بورڈ پر سمجھا رہے تھے۔ قاسم کو اونگھتا دیکھ کر کہنے لگے۔

"قاسم! یہ دس کدھر سے آئے؟"

قاسم نے بدحواسی کے عالم میں جواب دیا۔

"لکھنو سے---"

وہ سمجھا کہ شاید ماسٹر صاحب پوچھ رہے ہیں کہ تم کہاں سے آئے ہو۔

جوش	✿ سید عارف علی

گزشتہ انتخابات کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب اپنے امیدوار کے حق میں ایک پر جوش تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"ہمارا امیدوار سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھنے والا شخص ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہی نہیں، اسے کوئی اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ آج تک جو کوئی بھی اس کے راستے میں آیا، اسے ایسا کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگانی پڑی ہے اور---"

پیچھے اسے ایک گرجدار آواز آئی۔" وہ ٹرک ڈرائیور ہے کیا؟"

استقبالیہ	✿ مختار احمد

صوبائی الیکشن کا بڑا زور شور تھا، خاص طور پر ہمارے محلے میں تو ان خدائی فوجداروں نے جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ ماسوا ایک دو حضرات کے باقی تمام ان پڑھ ہیں۔ انہوں نے مل کر باہمی طور پر ایک شیر فروش کو امیدوار نامزد کر دیا ہے۔ حسن اتفاق سے مجھے ان کا ایک کارندہ مل گیا اور اپنے ساتھ ممبر صاحب کے ڈیرے پر جہاں چائے کا دور چلتا ہے، لے گیا۔ اتنی دیر مین ممبر صاحب اندر سے برآمد ہوئے۔ معاً ایک کرتا دھرتا صاحب چلا اٹھے۔

"سارے بھرا تشریف کھڑی کر دیو ممبر صاحب آگئے نیں۔"

☆☆

گلیاں رنگ رلیاں

نامعلوم

گلیاں دراصل عاشقوں کے دلوں کی رنگ رلیاں ہیں۔ یہ نہ ہوتیں تو اہلِ دل نادان نہ ہوتے، شاعروں کے دیوان نہ ہوتے، رنگ تغزل نہ ہوتا، کوئی عاشق خجل خوار نہ ہوتا۔ غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے عاشقوں کی ساری آشفتہ سری اور اُن کے دلوں کی بے کلی دراصل ایک نہ ایک گلی ہی کی مرہونِ منت ہوتی تھی۔ گلی میں محبوب ہوتا تھا جہاں عاشق کا گزرنا معیوب ہوتا تھا بلکہ اُس سمت کا رُخ کرنے کے تصور ہی سے عاشق کے دل پر قیامتیں ٹوٹتیں اور ملامتوں کی آنکھیں گھورتی تھیں۔ اُس کی ایک ہی تمنا ہوتی تھی کہ محبوب کے پاؤں کی خاک ہو جائے، اُس کا اپنا انجام المناک ہو جائے البتہ عشق کامیاب ہو جائے، سُرخرو اور عزت مآب ہو جائے لیکن یہ تو بہت پُرانے دنوں کی گلیوں کی باتیں ہیں۔ اَب تو گلیاں بھی کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہیں، نامحرموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتی ہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں ہر انسان کے باطن اور دل کی گلیاں بھی ہوتی ہیں، ہر شخص کے لاشعور میں گلیوں کا بے انت آسیب ہوتا ہے، ہر انسان کی ذات کا ایک اپنا فریب ہوتا ہے۔ گلیوں کا فریب بہت دلفریب ہوتا ہے۔ یہاں بچپن اور لاشعور ہوتا ہے، لاشعور میں فتور ہوتا ہے، فتور میں غرور ہوتا ہے۔ غرور کو اَنا بھی کہتے ہیں کہ آدمی حق کی سمت چل پڑے تو اناالحق بن جاتا ہے ورنہ حق کو بجھتے بجھتے سلفیورک ایسڈ کی بوتل---لیکن میں یہاں خودی کو بنانے کا نسخہ نہیں بتانا چاہتا، میرا موضوع گلیاں ہیں جن میں صدیوں سے مستور رنگ برنگ کی پریاں ہیں۔ اِس کے باوجود یہاں جنوں بھوتوں کا ڈیرہ نہیں ہوتا، کسی کے فکر نظر کا اندھیرا نہیں ہوتا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے مکان ہوتے ہیں جن میں رہنے والے انسان ہوتے ہیں۔

گلیاں انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ یہاں خوشی کی زبان میں محبتیں بھی گڑی ہوتی ہیں۔ محبتیں ناکام ہوں تو دلوں میں صلیبیں اُترنے لگتی ہیں۔ اَن گنت صدیوں کے طلسمات کے خلاف بغاوتیں مچلنے لگتی ہیں۔ ریشم، اطلس، کمخواب کے خلاف احتجاج کے طور پر عاشق کھدر پوش بن کر ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے۔ طوق سلاسل سے اُلجھتا ہے اور یوں کوئے یار سے نکل کر سوئے دار جاتے جاتے نوکری سے ہی نکل جاتا ہے۔ اَب ایسے اہلِ جنوں بھلا گھروں سے ہی کب نکلتے ہیں؟ گھر کی دہلیز سے نکل کر گلی کے موڑ تک آنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بعض اہلِ دل کو ایسا کرنے سے پہلے اک عمر تک غور کرنا پڑتا ہے لیکن گلیوں کا معاملہ صرف دلوں سے ہی نہیں جڑا ہوتا، دُنیا داری کے سارے راگ رنگ بھی انہی گلیوں میں پروان چڑھتے ہیں۔ گو گلیاں اپنے مکینوں کی آہستہ خرامی سے مانوس ہوتی ہیں۔ اُن کے دلوں کا فانوس ہوتی ہیں لیکن دُنیا داری کے سارے دھندے اور پھندے بھی گلی کے ایک کونے سے دوسرے سرے تک پھیلتے چلے گئے ہوتے ہیں۔ یہاں کسی پھٹے پر نائی بیٹھا ہے تو کسی کونے میں حلوائی نے ڈیرہ لگایا ہے۔ کہیں قصاب نے دکان سجائی ہے تو کہیں نانبائی نے آفت ڈھائی ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں۔ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی ریل پیل گلی میں ہر دم جاوداں، ہر دم رواں رہتی ہے۔ کپڑا بیچنے والوں سے لے کر چھان بُورا خریدنے والوں تک کے قافلے اپنے بے تکلفانہ اسلوب کی نواؤں سے کائنات کے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بھالو اور کتے کا تماشا دکھانے والا بھی ڈگڈگی بجاتا اِدھر آنکلتا ہے جسے دیکھ کر پھٹوں کے نیچے آرام کرنے والے کتے اپنے کلچر اور اقدار کے تشخص کی حفاظت کے لئے بہرحال احتجاج ضرور بلند کرتے ہیں اور ننھے سے بچے دروازے کھول کر باہر نکل آتے ہیں۔ بزرگ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ بھالو کے تماشے گلی میں دیکھنا بُری بات ہے۔ جب سارے تماشے گھر پر ہی دکھائے جاسکتے ہیں تو گلی میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟---لیکن گلیاں بھی تو اِنسان کے بچپن سے پیار کرتی ہیں۔ یہ عاشقوں کو نرگسی اور بیمار کرتی ہیں۔ اُن کی جوانی کو خراب وخوار کرتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، گلیاں دراصل مادری سماج کی باقیات ہیں۔ یہ اہلِ دل کے لئے آبِ حیات ہیں۔ ان کا رشتہ غاروں کی تہذیب اور جنگلوں کے کلچر سے ملا ہوا ہے۔ رند ہو کہ ساقی، صوفی ہو کہ خراباتی، یہ ہر قسم کے انسانوں کی پناہ گاہیں ہیں۔ گلیوں میں بازار ہوتے ہیں، بازاروں میں کاروبار ہوتے ہیں۔ کاروباری عموماً دیانت دار ہوتے ہیں، دیانت داری یوں تو عموماً عقل کی کمی کی وجہ سے فروغ پاتی ہے لیکن گلیوں کے دکاندار دیانت دار ہوں یا نہ ہوں، ہوشیار ہوتے ہیں لیکن میرا موضوع تجارت اور اُس کی پوشیدہ شرارت نہیں بلکہ محض گلیاں ہیں۔

بعض گلیاں کشادہ اور فراخ دل ہوتی ہیں، بعض تاریک اور تنگ دل ہوتی ہیں لیکن ہر گلی کا ایک اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اسلوب تو پگڈنڈی کا بھی ہوتا ہے اور ممکن ہے آپ سوچیں کہ اس پوری بحث میں پگڈنڈی کو نظر انداز کر کے دیہاتی معاشرت سے ناانصافی کر رہا ہوں۔ میں پگڈنڈی

کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ پگڈنڈی کا اپنا کلچر ہوتا ہے۔ یہ دیکھنے میں ناتواں لیکن درحقیقت موٹی مسٹنڈی ہوتی ہے۔ دیہاتی بھائی شہر آتے ہیں تو اُن کے لاشعور میں پگڈنڈی ہی آباد ہوتی ہے۔ تھوڑی سی رقم دھوتی کے ڈب میں باندھ کر ضروریاتِ زندگی کو گٹھڑی میں لپیٹ کر اور اُس کے دوسرے سرے پر گھر کی پلی مُرغی کے بچوں کو باندھے ہوئے گلی میں لڑکھڑا کر چلنے کا ایک علیحدہ لطف آتا ہے۔ شہر کی افراتفری میں دیہاتی بھائی یوں گڑبڑاتا ہے جیسے دلہن پہلی بار اپنے سُسرال میں۔ کبھی وہ لڑکھڑاتا ہے اور کبھی مُرغی کُڑکڑاتی ہے کیونکہ مرغا ہو تو کڑکڑاتا ہے۔ دیہاتی بھائی مُرغی کو سستے داموں بیچتا ہے اور خود مُرغِ بسمل بنا بس اڈے کا راستہ پوچھتا ہے اور یوں واپسی پر جیب کٹوا بیٹھتا ہے یا سرِ عام بوس وکنار کے الزام میں کسی ایس ایچ او کے روزنامچے کا ایندھن بن جاتا ہے۔

گلیاں اس کے برعکس اپنے مکینوں کی آمدورفت سے آگاہ ہی نہیں ہوتیں بلکہ اُن کی سوانح سرگزشت کی پرچھائیں کا بھی آسیب ہوتی ہیں۔ گلی میں کوئی واقعہ ہو یا سانحہ، کوئی قصہ ہو یا حادثہ ایک جمہوری انداز کے تبصروں کا ریلا چل نکلتا ہے۔ غرض گلیاں تو اپنے مجرموں کو بھی پناہ دینے کے لئے آغوش وا کر دیتی ہیں---گلیوں کی اسی عجیب وغریب تہذیبی اہمیت اور انسان کے اجتماعی لاشعور سے اُن کے پُراسرار تعلق کا ایک صاحبِ نظر دوست سے تذکرہ کیا تو کرشن چندر کے افسانے کی طرح جذبات سے دہک کر گویا ہوئے۔ اُن گلیوں پر تمہاری نظر کیوں نہیں جاتی جہاں عزتیں نیلام ہو جاتی ہیں اور جنہیں ساحر لدھیانوی نے ''کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ عرض کیا کہ جہاں تک نیلام کا تعلق ہے، وہ ضروری نہیں کہ کوچے یا نیلام گھر ہی میں ہو لہٰذا خوانخواہ نیام سے باہر ہونے کا کیا فائدہ ہے؟---شدتِ جذبات سے پہلے ہلکان اور پھر غضب ناک ہو کر بولے کہ حقیقتِ حال سے آنکھیں نہ چراؤ۔ یہ کوچے، یہ نیلام گھر دیکھ آؤ۔ ثناخواں، تقدیسِ مشرق کو لاؤ، بلاؤ---کہا کہ تقدیسِ مشرق کا چپڑاسی نہیں لگا ہوا---انہوں نے انقلابی جذبات کے موج تلاطم سے مغلوب ہو کر رُندھی آوازیں ایسی باتیں کیں کہ بندے کے جذبہ حریت کو مستی چڑھ گئی اور شدتِ احساس کی ہچکی بندھ گئی۔ چنانچہ ایک شام کو کرائے کے تانگے میں سوار ہو کر کوچہ عیش طرب روانہ ہوا اور یہ طے کیا کہ وہاں جا کر تقدس کے ثناخوانوں اور خودی کے محافظوں کو بیچ چوراہے میں طلب کیا جائے، ضمیر انسانی کو للکارا جائے اور اپنے نفس کو پھٹکارا جائے سو تانگے سے اُتر کر ٹانگوں کے لرزے پر قابو پاتے ہوئے ایک راہگیر سے آگے جانے کا راستہ پوچھا تو بوکھلا کر بولا کہ میں تو شریف آدمی ہوں، گنڈیریاں خریدنے آیا تھا---اس جواب سے اعتماد بڑھا۔ جوانی مُفلس ہونے کے ساتھ مشتعل ہو تو پھر اُسے جذبہ حریت ہی میں جھونک دینا چاہئے، اپنے ہی جہنم کو سونپ دینا چاہئے۔ اپنے باطن کی گلیاں بذاتِ خود بھول بھلیاں ہوتی ہیں۔ غرض دیوانہ وار قدم آگے بڑھائے۔ نگاہ بلند، سینے میں سخن دل نواز اور جاں جذبہ حریت کو اُبھارنے اور جذبہ جنس کو سُلانے کی سعی شہوانی خواہشات کو دبانے میں آدمی کی شکل حیرت پسندانہ ہو جاتی ہے۔ غرض اس عالمِ غرض اور عالمِ وجد کے تصادم میں بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا کہ ایک بانکا سا نوجوان ایک گوشے سے نکل کر پہلو کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور پھر یکدم گویا ہوا۔

''کیوں، بابو! اِدھر کیا لینے آئے ہو؟''

پلٹ کر اُسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں اس کوچہ بازار کی تاریخ بدلنے آیا ہوں۔ اب میں یہ دیکھ نہیں سکتا کہ عصمتیں ریشمی پردوں میں چُھپ چُھپ کر رلیں---''

رازدارانہ لہجہ سے قریب آ کر کان میں بولا۔

''محکمہ تعلیم میں ملازم ہو؟''

اس بیان سے کرنٹ سا لگا لیکن حواس باختگی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں داخلی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں یہاں ایک حق بات کہنے آیا ہوں کہ ہزاروں سال سے نرگس اپنے بے نوری پر رو رہی تھی، اَب میں ایک دیدہ ورانہ بات کہنے آیا ہوں۔ علامہ اقبال نے بھی فرمایا تھا---

اٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو''

اس نوجوان نے گریبان پکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ، کاخ کا مطلب تمہیں آتا ہے؟''

اس سوال سے میرا جوش، ولولہ کافور ہو گیا۔ عرض کیا۔ ''گریبان چھوڑو تو میں ابھی ڈکشنری دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ کاخ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔''

وہ گریبان کو مزید رگڑے دیتے ہوئے بولا۔ ''یہاں ڈکشنری دیکھنے آئے ہو؟''

گھبراہٹ اور لرزے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''حق گوئی کبھی ڈکشنری کی محتاج نہیں ہوتی۔''

اَب تو یہ قصہ پارینہ ہوا۔ میں اپنے باطن کی گلیوں ہی میں گم رہتا ہوں۔ باہر کی سب گلیاں ڈراؤنی لگتی ہیں۔

☆☆

خوفناک لوڈشیڈنگ اور سہانا خواب

حافظ مظفر محسن

میں حاکمِ وقت کے سامنے باادب کھڑا تھا اور حاکمِ وقت مجھے شفقت بھرے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ یکدم ایک خفیہ (شاید) کال آگئی اور حاکمِ وقت نے موبائل تقریباً کان میں گھسیڑ لیا۔ شکر ہے' کان کا سوراخ پروردگار نے خاصہ چھوٹا رکھا ہے ورنہ شاید پورا موبائل فون وہ کان میں گھسیڑ لیتے---شاید بُش صاحب کی کال تھی اور وہ کہہ رہے تھے کہ میاں! یہ کیا روز روز مذاق کر رہے ہو۔ پیٹرول کی قیمت پانچ پانچ دس دس روپے فی لیٹر بڑھا رہے ہو۔ یکدم جو ہدف دیا ہے' پورا کرو۔ یہ جو قسطوں پر بڑی بڑی گاڑیاں بینکوں سے لیز پر لے کر سڑکوں پر گھوم پھر رہے ہیں' ان کی تو بولتی بند ہو--- حاکمِ وقت---''سر سر'' کرتے جا رہے تھے' پسینہ آئے چلا جا رہا تھا۔ مجھے اکبر بادشاہ کا دربار یاد آگیا--- کیا خوش قسمت تھا اکبر بادشاہ! نہ موبائل فون کا جھنجھٹ' نہ بُش کی کال کا ڈر اور نہ اُس کنڈا لیزا کا خوف (آجکل مصروف ہُوں---کل کو جب میں بچوں کے لئے نیا ناول ''چڑیل اور بلبل کا بچہ'' لکھوں گا تو اس کی ہیروئن انشاءاللہ یہ محترمہ ہی ہوں گی) اکبر بادشاہ کے دور میں ویسے اگر بش ہوتا تو بھی اکبر بادشاہ نے اُسے پچھاڑ دینا تھا' زیادہ سے زیادہ اُسے اس کام کے لیے تیس چالیس امریکن عورتوں سے شادیاں ہی تو کرنا پڑتیں---؟ حکم وصول کر کے پسینہ پونچھتے ہوئے حاکمِ وقت میرے طرف متوجہ ہوئے۔

''میاں! سُنا ہے' لکھاری بھی ہو اور اپنی تحریروں میں نسخے بھی تجویز کرتے ہو--- کیا تعلیم ہے تمہاری؟''

''جی' جناب! میں نے سیاسیات میں ایم۔ اے کیا ہوا ہے---'' میرے جواب پر وہ بولے۔ ''پھر تو تمہیں کسی بینک کا منیجر ہونا چاہیے۔ یہ تم نے کیا لکھنا لکھانا' پڑھنا پڑھانا شروع کر رکھا ہے؟''

میں نے پھر عرض کی۔ ''حضور اگر میں نے ایم ایس سی حساب میں کی ہوتی تو پھر---؟''

وہ گرجے۔ ''پھر ہم تمہیں ڈاکٹر بننے کا مشورہ دیتے---'' خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''کیونکہ ڈاکٹر جب اپنی میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں آتا ہے تو پھر اُسے باقی کی زندگی حساب کتاب ہی کرنا ہوتا ہے۔ صبح چار بجے سو کے اٹھنا' ساڑھے چار بجے بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں راؤنڈ کرنا جس کے بیس ہزار ملیں گے۔ سوا پانچ بجے اُس سے بھی بڑے ہسپتال راؤنڈ پہ جانا جس کے تیس ہزار ملیں گے۔ پونے چھ بجے سب سے بڑے ہسپتال جانا' راؤنڈ بھی کرنا اور مسکرا مسکرا وی آئی پی مریضوں کو جھانکنا۔ میاں مریض دیکھنے کے پچاس ہزار ملیں گے اور مسکرا مسکرا کے دیکھنے کے مزید سوا لاکھ--- پھر گاڑی میں ہی ناشتہ۔ پندرہ منٹ میں سرکاری ہسپتال کی تیاری اور ساتھ ساتھ بیگم کی جھاڑ میں اور جھاڑوں کے بدلے میں بیگم کو آج کے خرچے کیلئے مسکرا کر دس پندرہ ہزار ادا کرنا اور جھاڑوں کے جواب میں شکریہ شکریہ کہتے ہوئے--- سرکاری ہسپتال بھاگم بھاگ جانا کہ کہیں شہباز شریف دورے پر نہ آئے ہوں اور اگر آئے ہوں تو گڑگڑا کے بتانا کہ سر گاڑی پنکچر ہوگئی تھی اور اگر شہباز شریف نہ آئے ہوں تو ماتحتوں کو ڈانٹنا--- یہ ماتحتوں کو ڈانٹنا بھی ایسے ہی ہے جیسے آپ کو ہائی بلڈ پریشر ہو اور آپ نے دس ایم جی کی بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کی گولی کھالی ہو---! ویسے بیوی کی ڈانٹ سے صبح جو بلڈ پریشر ہائی ہوتا ہے' ماتحتوں کو ڈانٹنے سے وہ نارمل ہوسکتا ہے البتہ اس پر ریسرچ جاری ہے۔ اُمید ہے' جلد رزلٹ سامنے آجائے گا---'' لمبی گفتگو کے بعد حاکمِ وقت پھر سے بولے۔ ''میاں! جلدی سے مختصراً بتاؤ کہ اگلے سو دن ہم کیا کام کریں کہ ہماری نام نہاد عوامی حکومت کو عوام میں پذیرائی حاصل ہو جائے؟---ذرا جلدی کیونکہ اصل حاکمِ وقت کی لندن یا دبئی سے کال آنے والی ہے اور اگر میرے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر گر جائے تو تم فوراً بھاگ جانا کیونکہ یہ صدر پرویز مشرف کی کال ہوگی---'' ہم نے جواب دیا۔ ''حضور' حاکمِ وقت صاحب! بہتر ہے کہ آپ اگلے سو دن سوئے رہیں۔ نہ باہر نکلیں' نہ آپ کو بلٹ پروف گاڑی میں ڈرتے ڈرتے سفر کرنا پڑے۔ نہ عوام کو مزید خوفزدہ کر دینے والے فیصلے کرنا پڑیں' نہ بدھ گارڈن (منگل باغ ٹائپ) کسی طالبان سے آپ کا واسطہ پڑے اور نہ ہی آپ عوام کو یا ''اُن'' کو جوابدہ ہوں۔''

وہ غصے میں آگئے اور گرجے۔ ''میں نے سُن رکھا تھا کہ جو لکھاری یا شاعر اپنی تحریر یا نظم میں پھولوں کی باتیں کرتا ہے یا محبوبہ سے عشق و محبت کے تذکرے چھیڑتا ہے۔ وہ سچ تھا کہ وہ لکھاری یا شاعر اندر سے ایسا نہیں ہوتا۔ وہ جب محبوبہ بیاہ کر گھر لاتا ہے اور محبوبہ بیوی بن جانے کے بعد نئے ماڈل کی کار کا مطالبہ کرتی ہے تو وہ اُسے بیلن سے پیٹتا ہے یا اپنی نئی کتاب کا مسودہ اُس کے مُنہ پر دے مارتا ہے اور جواب میں محبوبہ اور حال کی بیوی اُسے چمٹے سے پیٹتی ہے اور جلی کٹی سناتی بھی

ہے---"!

میں چپ ہو گیا کیونکہ ڈر تھا کہ حاکمِ وقت میرے پٹائی نہ کر دیں ورنہ میں دوٹوک کہہ دیتا کہ حضور! آپ بھی تو ایک عدد کتاب کے مصنف ہیں۔ ویسے مصنف ہونے کا روج بھی آجکل عام ہے--- حاکمِ وقت کا لہجہ نرم ہو گیا۔ انہوں نے پیار سے کہا۔

"یہ سب آف دی ریکارڈ ہے--- آپ ہمارے صحافی بھائی ہیں--- یہ جو جمہوری سرکل چل رہا ہے' اس بار یہ وکلاء برادری یا صحافی بھائیوں کی تحریکوں کے باعث قوم کو ملا--- ہم نے اگر پانچ سال مکمل کر لیے تو اپنے اگلے دور حکومت میں ہم ایک وزیر وکلاء میں سے رکھیں گے اور دوسرا وزیر صحافی برادری سے لیں گے--- بس تھوڑا اور صبر کر لیں تھوڑا اور انتظار کر لیں---"

"تو" حضور! پھر آپ یوں کریں کہ اعلان کر دیں کہ سردیوں کے تین مہینے دسمبر جنوری فروری لوڈ شیڈنگ نہیں ہو گی--- آپ جتنا چاہیں' اُن مہینوں میں پنکھے چلائیں' ایئر کنڈیشنر چلائیں وغیرہ وغیرہ---" میں نے عوام میں مقبول ہونے والی نئی اسکیم کا ابھی پہلا پوائنٹ ہی بیان کیا تھا کہ اُس کا سیکرٹری بول اُٹھا۔

"حضور والا! اس ماہر سیاسیات سے بچیں اور اسے کسی چینل پر ایک گھنٹے کا پروگرام دلوا دیں جس میں یہ اہم ترین سیاسی ایشوز پر بات کیا کرے---"

حاکمِ وقت سوچ میں پڑ گئے اور مسکرانے لگے جیسے کوئی نیا آئیڈیا آیا ہو پھر بولے---

"کیوں نہ ہم گھڑیاں مزید دو گھنٹے آگے کرنے کا حکم دے دیں---؟"

"اس سے کیا فرق پڑے گا---" ہم نے پوچھا---

ہنس کر بولے۔

"پہلے ایک گھنٹہ بڑھانے سے کیا فرق پڑا ہے جو دو گھنٹے مزید بڑھانے سے فرق پڑ جائے گا؟--- بس ذرا عوام کو اِک نیا متنازعہ سا موضوع مل جائے گا اور اُن کی توجہ منگل باغ قسم کے معاملوں سے ہٹ جائے گی؟"

سب لوگوں نے اس نہایت اچھی تجویز پر خوب تالیاں بجائیں--- شکر ہے' یہ بیان سیاسی جلسے میں نہیں دیا گیا ورنہ عوام دو گھنٹے آگے بڑھانے کی خوشی میں خوب نعرے بازی کرتے--- اِس دوران اُن کے فون کی گھنٹی کی بجائے "ٹون" کی جگہ یہ گانا بجنے لگا---

چل چھیا چھیا چھیا چھیاں
چل چھیا چھیا چھیا چھیاں

فون اُن کے ہاتھ سے گر گیا ہم نے سمجھا وہ فون آ گیا جس کا اُنہوں نے کہا تھا کہ وہ فون آتے ہی تم بھاگ جانا۔ ہم بھاگنے لگے تو اُنہوں نے روکا' بولے---

"ارے یہ وہ "کال" نہیں ہے' یہ تو سیکریٹری غلطی سے صبح اپنے بچے کا کھلونا سیٹ اٹھا لایا اور اُس نے مجھے بھی غلطی سے وہی تھما دیا--- دس بجے دفتروں میں آنے والے افسروں کو جب صبح آٹھ بجے آنے پڑ جائے تو ایسی غلطیاں تو سرزد ہو کے رہیں گی---"

ہم نے ماحول بہتر ہوتا دیکھا تو جیب سے ایک درخواست نکالی اور اُن کو تھماتے ہوئے التجا کی۔ "حضور والا! ہم تو آپ کو عوام میں پذیرائی حاصل کرنے کا نسخہ تو نہیں بتا سکے' وہ آپ عزت مآب جناب مشیرِ داخلہ سے پوچھ لیجئے گا البتہ یہ درخواست ہے۔ ایک عزیز بچہ جس نے بیس سال پہلے بی۔ اے کیا تھا' ابھی تک بے روزگار ہے' اُسے ملازمت تو دلوا دیں آپ کے بچوں کو دعائیں دے گا اور اگر ضرورت پڑی تو جلد ہونے والے الیکشن میں ووٹ بھی دے گا---"

اُنہوں نے اس بات کا بُرا منا لیا۔ مجھے ڈانٹا اور گرج کر بولے۔ "میاں! مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا' چل بھاگ!"

ہماری آنکھ کھل گئی۔ لوڈ شیڈنگ تھی۔ شدید گرمی میں ہم ٹوٹی چارپائی پر پسینے سے شرابور گھڑی تلاش کر رہے تھے کہ ہم نے صبح دفتر آٹھ بجے پہنچنا تھا۔ پتہ چلا کہ ابھی تو رات کے دو بجے ہیں اور لوڈ شیڈنگ کا دوسرا وقفہ ہے' ابھی دو مزید گھنٹے گھنٹے کے وقفے ہوں گے اور پھر کہیں جا کر صبح ہو گی۔ جب سے رات چار گھنٹے لوڈ شیڈنگ کی نذر ہونے شروع ہوئے ہیں' یہ پہلا خواب تھا جو تکلیف دہ نہ تھا ورنہ خواب آتے ہیں' روند جاتے ہیں۔ طالبان کی آمد' آٹے کا بحران' بجلی خوفناک لوڈ شیڈنگ' ججوں کی بحالی (جو شاید اب اک خواب ہے؟) ہر روز مہنگائی--- خوفناک مہنگائی اور ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹروں کی کمی۔ یہ سب باتیں خودکشی کا باعث بن رہی ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ عوام پر رحم فرمائے ذہنی تناؤ کے شکار لوگوں کو تلاش کرے۔ ناظم کی سطح پر گلی محلے میں ذہنی تناؤ کے شدید شکار لوگوں تک ڈاکٹر پہنچائے تاکہ روزانہ ہونے والی بیسیوں خودکشی کی وارداتوں میں کمی ہو سکے کیونکہ اِن بحرانوں کا تو صدر مشرف کے پاس حل تھا' نہ موجودہ حکومت کے پاس اِن کا حل دکھائی دیتا ہے۔ اب ہمیں اِن سب مسائل کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے اور ذہنی تناؤ کا شکار بھی ہوتے جانا ہے اس لیے عوامی حکومت عوامی سطح پر علاج معالجہ کی سہولت پہنچائے۔

☆☆

دوستو! پلاؤ آپ کو کیسا لگتا ہے؟---- ارے' ہمارے اس سوال پر تو آپ سب یکلخت یوں سنبھل کر بیٹھ گئے کہ جیسے گرما گرم پلاؤ کی بھاپ اُڑاتی "کھونک" پلیٹ آپ کے سامنے آیا ہی چاہتی ہے---- جی نہیں' منہ دھو رکھیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ فی الوقت ہمارے پاس آپ کے ملاحظے کے لیے ایک نظم بہ عنوان "پلاؤ" موجود ہے۔ یعنی کہ اب تک تو آپ پلاؤ کو کھاتے آئے ہیں جبکہ آج پلاؤ کو آپ پڑھیں گے۔

پلاؤ---- شاعر: نذیر احمد شیخ

پلاؤ دلآویز' دلکش' دل آرا
شہاں راں گدارا' ہمارا تمہارا
یہاں تک پلاؤ کی لذت نے مارا
خیالی پلاؤ پہ اب ہے گذارا
صد آفت رسیدہ مگر یہ عقیدہ
کہ ایمان لاؤ تو کھاؤ پلاؤ
ملایا' مراکش' خراسان' یہ ہے
جہاں میں جہاں مسلمان' یہ ہے
نشان تمدن بہرخوان یہ ہے
مسلمان دُنیا کی پہچان یہ ہے
مہک بھینی بھینی رہے' دارچینی
پڑاؤ' پڑاؤ ملے گا پلاؤ
جہاں گھر میں قسمت سے مہمان آیا
تکلف پہ فوراً مسلمان آیا
بڑے دیگچے میں وہ طوفان آیا
کہ چاول میں ڈنبہ پریشان آیا
نہ بستر' نہ کرسی' نہ احوال پرسی
مگر رکھ رکھاؤ سے حاضر پلاؤ
بہ تقریب شادی مکاں رہن رکھ دیں
جو چہلم منائیں' دوکان رہن رکھ دیں
آڑے وقت میں داڑھیاں رہن رکھ دیں
اگر بس چلے' دوجہاں رہن رکھ دیں
ویسے عقیقے ہزاروں طریقے
وہی "ایک" چاؤ' اُڑا پلاؤ
جو بکرا ہے' یوں سرفرازا ہوا ہے
کہ گھی چاولوں میں گدازا ہوا ہے
نیازوں میں اتنا نوازا ہوا ہے
ہزاروں کا ایمان تازہ ہوا ہے
جبیں پہ پسینہ' شکم بے قرینہ
یہ حمزہ' وہ واؤ' رواں ہے پلاؤ
سڑک پر جو بیٹھے "پلاؤ" بیچتے ہیں
اسے بس بزور صدا بیچتے ہیں
چھپی موت کو برملا بیچتے ہیں
نہ دیکھو' نہ بھالو چلو
وہ آنے کا پاؤ' لگا ہے پلاؤ
جہاں بھی پلاؤ بگھارا گیا ہے
زمیں سے فلک تک بھپارا گیا ہے
اسی غم میں شیطان مارا گیا ہے
کہ مومن پہ یہ کیا اُتارا گیا ہے
چہ شاہی' چہ خرقہ' وہی ایک فرقہ
جسے ورغلاؤ کہے گا پلاؤ
جہاں پیٹ میں تھال پر تھال بیٹھے
مسلماں وہاں سال ہا سال بیٹھے
شکم خوب ابھرے' خدوخال بیٹھے
یہاں تک کہ غازی سپر ڈال بیٹھے
نہ ہمسایہ ہے' نہ رومانیہ ہے
میاں! اب پکاؤ' خیالی پلاؤ

☆☆

☺ سٹوڈنٹ: یار میرے ساتھ بہت بُرا ہوا۔
دوست: کیوں کیا ہوا؟
سٹوڈنٹ: میں نے گھر والوں سے کتابوں کے لیے پیسے منگوائے تھے' انہوں نے کتابیں ہی بھیج دیں۔

☆---- عاصم محمود' فیصل آباد 0314-9500420

☺ اگر موبائل فون پاکستان میں ایجاد ہوتا تو اس میں اس طرح کے Templates ہوتے۔

۱۔ اوئے کال کر!
۲۔ ابے کہاں ہے؟
۳۔ ایسا کرو گے تو کون آئے گا؟
۴۔ کھلے لیتا ہوا آئیو۔
۵۔ تیری امی بلا رہی ہیں۔
۶۔ یار دُسے اسپرس کرتا ہے دو چار نائٹ قسم کی غزلیں بھیج۔
۷۔ ابھی کال مت کریں' امی بیٹھی ہیں۔

☆..... عزیز عارش' کراچی 0344-2071554

☺ سوال: شوہر اپنے پرس میں اپنی بیوی کی تصویر کیوں رکھتے ہیں؟
جواب: کسی مصیبت کے اچانک پیش آنے پر دل کو تسلی دینے کے لیے کہ اس مصیبت کو میں جھیل سکتا ہوں تو پھر کسی بھی مصیبت کو جھیلنا کیا مشکل ہے۔

☆..... رُوح اللہ رُوح' مردان 0300-5713018

☺ جب کوئی دوست اپنے دوست کے لیے خلوص سے دُعا کرتا ہے تو وہ دُعا اُس دوست کے حق میں بعد میں اور خود اُس کے حق میں پہلے قبول ہوتی ہے لہٰذا میری دُعا ہے کہ آپ کی شادی جلد از جلد ہو جائے۔

☆..... شعبان گیلانی' پنڈی 0302-5025393

☺ پیر جنگلی کے لیے خوشخبری

پرانی مشینری اور مرد ہروقت مرمت طلب ہی نظر آتے ہیں ☾ یمنیٰ احمد

کال ریٹ اب عقل کے حساب سے ہوں گے۔ جتنی چھوٹی عقل، اُتنے ہی کم کال ریٹ --- مبارک ہو پیر جی! آپ کی کالز تو فری ہو جائیں گی۔

☆...... اشفاق شاہین، کراچی 0345-2118945

😊 جس طرح بوڑی بوڑھیاں رکشے والے تک کو اپنی بہو کے مظالم سنانے بیٹھ جاتی ہیں بالکل اسی طرح sms میسج رکھنے والے اپنا کھایا پیا بھی بتا دیتے ہیں۔

☆...... مسٹر ڈب کلاس 0333-6108120

😊 ڈاکٹر: سگریٹ نوشی انسان کو آہستہ آہستہ مار دیتی ہے۔
سگریٹ نوش: تو ٹھیک ہے نا' ڈاکٹر صاحب! مجھے بھی ایسی کون سی جلدی ہے۔

☆...... ایم فیضان، ہری پور ہزارہ 0334-9649684

😊 لڑکا: لڑکیاں اور بسیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ایک جاتی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔
لڑکی: رکشے اور لڑکے بھی سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک کو بلاؤ تو چار دوڑے آتے ہیں۔

☆...... عظیم سلیم، کراچی 0334-3718244

😊 جیتے جی تو کوئی حال تک نہیں پوچھتا' شیراز مرتے ہیں تو دُنیا والے بریانی کھانے آ جاتے ہیں

☆...... جہانزیب، کراچی

😊 سگنل پر کار رُکی تو ایک بچہ کار والے سے بولا۔ "اللہ کے نام پر مدد کرو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"
کار والے نے ڈانٹا۔ "ابے تیرے بچے ہیں؟"
بچہ معصومیت سے بولا۔ "نہیں بچے تو اماں کے ہیں۔"

☆...... ظفر شیخ، کراچی

😊 ایک سکول کی عمارت کو آگ لگی ہوئی تھی اور سب بچے ایک سائیڈ پر کھڑے ہنس رہے تھے کہ چلو' سکول آنے جانے کی مصیبت تو ٹلی لیکن ایک بچہ بے حد مغموم کھڑا تھا۔ ایک بچے نے اُس سے پوچھا کہ بھئی تم کیوں اُداس ہو؟ یہ سن کر مغموم بچہ بولا۔
"ٹیچرز تو سارے کے سارے بچ گئے یار!"

☆...... عمیر مرزا، فیصل آباد 0334-6634990

😊 پپو ڈیم فول کو ٹیلی نور میں جاب ملی لیکن پہلے ہی دن اُسے مار پیٹ کر نکال دیا گیا بھلا کیوں؟ --- کیونکہ بھئی' اُسے پہلی کال ملی۔
"سر! میری ٹیلی نور کی سم بلاک ہو گئی۔"
یہ سن کر پپو صاحب اطمینان سے بولے۔ "تو' یار! تم زونگ کی سم لے لو۔"

☆...... ریاض خان، ڈیرہ اسماعیل خان 0346-2118945

😊 جن: کیا حکم ہے میرے آقا؟
آقا: میرے گھر سے امریکہ روڈ بنا دو۔
جن: یہ ناممکن ہے میرے آقا! کچھ اور بولیں۔
آقا: میری بیوی کو میرا فرمانبردار بنا دو۔
جن: روڈ سنگل بنانا ہے کہ ڈبل' میرے آقا؟

☆...... رضوان طاہر، ملتان 0332-6056896

😊 ایک سردار دوست کے گھر سے اپنے گھر جانے لگا تو دوست بولا کہ یار! باہر بارش بہت تیز ہو رہی ہے آج یہیں رُک جاؤ۔ سردار جی بولے اچھا --- یہ کہہ کر دوست اُن کے سونے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ خاصی دیر بعد جب وہ واپس بیٹھک میں آیا تو دیکھا کہ سردار جی پانی سے شرابور کپڑوں میں بیٹھے کانپ رہے ہیں۔
دوست: کہاں گئے تھے بھئی؟
سردار: او یار پاپے! گھر بتانے گیا تھا کہ بارش کی وجہ سے آج میں گھر نہیں آؤں گا۔

☆...... عامر اقبال، ڈیرہ اسماعیل خان 301-8081820

😊 روزے دارو' اللہ نبی کے پیارو! سحری کے وقت ہاتھ ذرا ہولا رکھا کرو کہ یہ سحری ہے' کوئی ولیمہ نہیں ہے۔

☆...... عاشر نثار احمد، دادو سندھ 0334-2203725

😊 پرانی کہاوت ہے کہ سوتے وقت کوئی ٹینشن لے کر نہیں سونا چاہیے پھر بھی لوگ بیوی کے برابر پڑ کر سو رہے ہیں۔

☆...... فیصل شبیر 0314-5500810

😊 پپو ڈیم فول بس میں بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔ سامنے سیٹ پر بیٹھی عورت بار بار اپنے بچے سے یہی کہہ رہی تھی کہ بیٹا! جلدی سے یہ بسکٹ کھا لو ورنہ میں یہ بسکٹ سامنے والے انکل کو دے دوں گی۔ عورت نے جب یہی جملہ چوتھی بار دُہرایا تو پپو زچ ہو کر بولا۔
"باجی! جلدی فیصلہ کرو۔ آپ کے بسکٹ کے چکر میں میں پہلے ہی چار سٹاپ آگے آ گیا ہوں۔"

☆...... سعادت علی ساحل 0314-6951272

😊 چوری چوری آنا جانا چھوڑ دو
چپکے چپکے یوں نظر ملانا چھوڑ دو
کسی دن بہت پٹو گے اُن سے تم
مسجدوں سے جوتیاں چرانا چھوڑ دو

☆...... سید ابرار بخاری، گوجرانوالہ 0346-6051885

😊
میٹرک' ایف اے' ایف ایس سی' آئی کام' بی کام یا بی اے کے پیپروں میں اگر آپ میں سے کسی نے بھی اپنے نمبر بڑھوانے ہوں تو مجھے اپنا نام اور رول نمبر فی الفور send کر دیں۔ میں ایسے تمام بہن بھائیوں کے لیے --- دُعا کروں گا۔

☆...... محمد طلحہٰ، مظفر گڑھ 0342-72422458

😊 ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا۔ "بتاؤ' ناکام محبت کا انجام کیا ہوتا ہے؟"
دوسرے دوست نے کہا۔ "لڑکا ماموں بن جاتا ہے اور لڑکی پھوپھو---"

☆...... فہیم صدیقی، ملتان 0300-8303131

😊 کرکٹ میچ دیکھنے والی ایک لڑکی نے اپنے چہرے پر پاکستان کا جھنڈا پینٹ کروا رکھا تھا ایک شریر لڑکے نے دیکھا تو اُس کی طرف ایک ہوائی بوسہ روانہ کیا اور بولا۔
"میرا پیارا پاکستان' سب سے پہلے پاکستان"

☆...... وسیم بلوچ، ڈیرہ اسماعیل خان

😊 سردار جی کے ایک ہی جملے نے فوٹو گرافر کو پاگل کر دیا۔ "یار پاپے! میری ایک پاسپورٹ سائز تصویر تو نکال لیکن اُس میں میرے شوز بھی آنے چاہئیں۔"

😊 وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی' شیراز پر اماں بولیں' جاؤ بیٹا' باجی کے لیے بوتل لے آؤ

☆...... ایم ایاز، لاہور 0332-6362676

😊 سردار جی یورپ گئے' وہاں اُنہیں پولیس نے روکا اور Investigation شروع کر دی۔ سردار کو انگلش نہیں آتی تھی سو اُنہوں نے Sick Leave کی Aplication سنا دی۔ پولیس نے اُنہیں پاگل سمجھ کر چھوڑ دیا۔
سردارنی: واہ سردار جی تسی تے گریٹ او۔
سردار: اے تے کج وی نہیں' حالے تے میں اوہناں نوں Thirsty Crow دی سٹاری سی۔

☆...... پارس جی 0334-84844075

😊 وہ ہٹا رہے ہیں پردہ' سرِعام چپکے چپکے
کوئی قتل ہو رہا ہے' دربام چپکے چپکے
یہ جھکی جھکی نگاہیں' یہ حسیں حسیں اشارے
کہیں لے نہ جائیں شاید' میری جان چپکے چپکے
کبھی شوخیاں دکھانا' کبھی اُن کا مسکرانا
یہ ادائیں کر نہ ڈالیں میرا کام چپکے چپکے

یہ جو ہچکیاں مسلسل مجھے آرہی ہیں' یارو!
کوئی لے رہا ہے شاید میرا نام چپکے چپکے

☆...... وسیم حسن بابر' حیدرآباد 0301-3810750

☺ تمام سٹوڈنٹس سے اپیل ہے کہ وہ اپنے اپنے رزلٹ سے پہلے گھر کی چپلیں جھاڑو اور وائپر کہیں چھپا دیں۔

منجانب: تحفظ سٹوڈنٹ فیڈریشن

☆...... حافظ محیب احمد 0334-51096983

☺ نفسیات کا پریکٹیکل ہو رہا تھا پروفیسر نے ایک چوہے کے لیے ایک طرف کیک اور دوسری طرف ایک چوہیا رکھ دی۔ چوہے کو چھوڑا گیا تو وہ فوراً کیک کی طرف لپکا۔ دوسری بار کیک کو ہٹا کر روٹی رکھی گئی تب بھی چوہا روٹی کی طرف گیا۔ اسی طرح بار بار کھانے کی چیزیں بدل بدل کر رکھی گئیں اور ہر بار چوہا خوراک کی جانب ہی گیا۔ اس تجربے کے بعد پروفیسر نے کہا۔

"پس ثابت ہوا کہ بھوک ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔"

یہ سن کر پچھلی سیٹوں سے ایک سٹوڈنٹ کی آواز آئی۔

"سر! ایک بار چوہیا بھی بدل کر دیکھ لیں۔"

☆...... مبشر شاہ' لاہور 0333-4565897

☺ پٹھان نے مکھی کے دونوں پر کاٹ کر کہا' اڑ جا۔ جب وہ نہ اڑی تو فرمایا کہ تجربے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے' اگر مکھی کے دونوں پر کاٹ دیے جائیں تو پھر وہ سن نہیں سکتی۔

☺ کسی نے دل بدل لیا
کسی نے دھڑکن بدل لی
کسی نے نظریں بدل لیں
آپ کے پاس کچھ نہ تھا بدلنے کو
سو آپ نے مسجد میں جا کر چپل بدل لی

☆...... مہک خان' پشاور

☺ سردار نے سردارنی سے کہا۔ "آج شام چار بجے گدھوں کی ریس ہو رہی ہے میں نے وہاں لازمی جانا ہے۔"

سردارنی بولی۔ "بس رہنے دیں' چلا تو آپ سے جاتا نہیں' ریس میں حصہ آپ نے خاک لینا ہے۔"

☆...... اُمید' لاہور

☺ لڑکا' لڑکی سے ملنے اس کے گھر آیا۔ لڑکی نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود چائے بنانے چلی گئی۔ سامنے ہی صوفے پر لڑکی کا موبائل پڑا ہوا تھا۔ لڑکے نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی میرے نام کے ساتھ کون سا پیارا سا القاب لکھا ہے۔ جانو' جان یا جانی؟--- یہ سوچ کر اس نے مس کال دی تو سکرین لکھا آیا۔

"بیوقوف نمبر 5 کالنگ"

☆...... منیرہ منیر' کراچی

☺ پیاری بہنو! بازار میں سر ہرگز نہ کھجائیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ کوئی نوجوان اسے سلام سمجھ کر آپ کی جان کو آ جائے۔

☺ کسی محلے کے اوباش لڑکوں کی تعداد معلوم کرنی ہو تو کسی ایسے مکان کے پاس بیٹھ جایئے کہ جس میں کوئی نوجوان لڑکی رہتی ہو۔

☺ کنواروں کے کمروں میں اور کچھ ہو نہ ہو' فلمی اداکاراؤں کی تصاویر بکثرت ہوں گے۔

☺ فی زمانہ ہر لڑکے کی خواہش رانجھا' مہینوال اور مجنوں بننا ہے۔

☺ بھیڑ میں دھکا مار کر گزرنے والے! ہو سکتا ہے کہ تیری بہن بھی اسی بازار میں دھکے کھا رہی ہو۔

☆...... کبیرا شاہ اینڈ حمیرا شاہ' لاہور

☺ ایک توجہ طلب مسئلہ!

سائنس کہتی ہے کہ پانی بوائل کرنے سے پانی میں موجود جراثیم مر جاتے ہیں لیکن سائنس کو کوئی یہ تو بتائے کہ جراثیموں کی لاشیں تو پانی میں ہی موجود رہتی ہیں نا---!

☺ آنکھوں میں شرافت' چال میں نزاکت' دل میں سچائی اور چہرے پہ "صفائی" پھر--- پھر کیسے نہ بولے ہر لڑکی آپ کو "اور میرے پیارے بھائی!

☆...... عمارہ عباس' لاہور

☺ ٹیچر: ٹیسٹ یاد ہے؟

سٹوڈنٹ: سر! جیسے ہی پڑھنے بیٹھتا ہوں لائٹ چلی جاتی ہے' بعد میں اس ڈر سے پڑھنے نہیں بیٹھتا کہ پڑھنے بیٹھا تو پھر لائٹ چلی جائے گی۔

☆...... عطیہ عباس' اسلام آباد

☺ میراثی کا لڑکا سکول میں داخل ہوا تو ٹیچر نے کہا کہ دو کا پہاڑا سناؤ لڑکا بولا۔

"تے فیر نال ڈھولکی وجاؤ"

☆...... شان علی روبوٹ 0313-5805870

☺ ایک عجیب سوال: جس کا جواب نہ ہاں میں دیا جا سکتا ہے اور نہ ناں میں--- سوال ملاحظہ ہو۔

کیا آپ نے مسجد سے جوتیاں چرانا چھوڑ دی ہیں؟

جواب دے کر دکھائیں۔

☆...... محسن' ڈیرہ اسماعیل خان

☺ اگر موجودہ دور کی فیشنی لڑکیاں بغیر میک اپ کے حکومت کے خلاف جلوس نکالیں تو پورے ملک میں لوڈشیڈنگ ختم ہو سکتی ہے۔ "ایسی" تمام لڑکیوں سے اپیل ہے کہ پلیز حرکت میں آئیں۔

☆...... گگی ڈیئر' لاہور 0334-6297414

☺ باپ: شادی بچوں کا کھیل نہیں۔

منا: پاپا مجھے پتہ ہے۔

باپ: کیا پتہ ہے؟

منا: یہی کہ شادی بڑوں کا کھیل ہے اور بچوں کے لیے کھیلا جاتا ہے۔

☆...... بابو جان' کراچی 0313-9274836

☺ زندگی کے لیے دل کی ضرورت ہے' دل کے لیے خوشیوں کی ضرورت ہے' خوشیوں کے لیے دوست کی ضرورت ہے اور اچھے دوست کے لیے آپ کو یقیناً میری ضرورت ہے۔

☆...... سید محمود گیلانی' باغ آزاد کشمیر 0315-9411789

☺ دوستی: پھول اور خوشبو کا رشتہ' زندگی اور سانس کا رشتہ' گلابوں اور بہاروں کا رشتہ' دکھوں اور سکھوں کا رشتہ' مسافروں اور منزلوں کا رشتہ' پیار اور محبت کا رشتہ' قسموں اور وعدوں کا رشتہ! اتنا خوبصورت جتنا تیرا میرا رشتہ!

☆...... ایم یٰسین' لاہور 0321-4311086

☺ لڑکی: کیا کر رہے ہو؟

لڑکا: مکھیاں مار رہا ہوں۔

لڑکی: کتنی ماریں؟

لڑکا: 3 میل اور 2 فی میل!

لڑکی: جنس کیسے معلوم ہوئی؟

لڑکا: تین سگریٹ کے پیکٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور دو فون سے چپکی ہوئی تھیں۔

☆...... مبشر شاہ' لاہور 0333-4565897

☺ کچھ اس طرح ہم وعدہ نبھائیں گے
نوکری نہ ملی تو بالکل نہیں گھبرائیں گے
ریلوے اسٹیشن پر چائے کا کھوکھا لگائیں گے
تم چائے بنانا ہم "چائے' چائے" چلائیں گے

☆.....عمر خان، بہاولپور 0313-6959580

😊 تم بھی شاعری کرو میری طرح
ایک دن تمہارا بھی نام ہو جائے گا
لوگ پھینکیں گے انڈے اور ٹماٹر
شام کی سبزی کا انتظام ہو جائے گا

☆.....سید بادشاہ 0344-5439223

😊 خوشی سال بھر کی منا کر ملے
کر وہ عید بھی کسما کر ملے

☆.....حفیظ گجر، سرساوہ آزاد کشمیر 0302-5250521

😊 رات شیطان کو خواب میں دیکھا
ساری صورت جناب کی سی تھی

☆.....احسان مرتضیٰ، تلہ گنگ 0302-6350708

😊 ویگن میں ہوں سوار تو سر پہ کفن بھی ہو
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

☆.....شبیر بلوچ، حب چوکی 0313-2125266

😊 عشق قاتل سے بھی، مقتول سے ہمدردی بھی
یہ بتا کس سے محبت کی جزا مانگے گا
سجدہ خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عبادت کا صلہ مانگے گا

☆.....توصیف احمد، میانوالی 0333-9835840

😊 شکوہ شاعرہ

میرے پاس سے گزر کے میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

جواب شاعر

تیرے پاس سے جو گزرا تو نشے میں چور تھا میں
ذرا دور جا کے سنبھلا تو ذرا ذرا سا رویا

☆.....ظفر اقبال، ڈیرہ اسماعیل خان 0314-6932424

😊 ساس نے اپنے تین دامادوں کی محبت آزمانے کے لیے اُن کے سامنے دریا میں چھلانگ لگا دی ایک داماد نے فی الفور دریا میں کود کر اُسے بچا لیا جس کے نتیجے میں انعام کے طور پر اُسے کار مل گئی۔ دوسرے دن یہی کھیل کھیلا گیا۔ اس بار دوسرے داماد کو موٹر سائیکل دی گئی۔ تیسرے دن تیسرے داماد کے سامنے ساس دریا میں کودی تو تیسرے داماد نے سوچا کہ ترتیب کے لحاظ سے مجھے تو سائیکل ہی ملے گی لہٰذا کیا ضرورت ہے بچانے کی؟---یوں ساس صاحبہ ڈوب گئیں لیکن پھر بھی تیسرے داماد کو مرسیڈیز کار مل گئی (سسر کی طرف سے)

☆.....ایم ذیشان، لاہور 0345-4450309

😊 باپ: اگر اس دفعہ تم پاس نہ ہوئے تو پھر مجھے پاپا مت کہنا۔

باپ: (کچھ دنوں بعد) تمہارے رزلٹ کا کیا بنا، بھئی؟

بیٹا: سوری بشیر صاحب!

☆.....ڈاکٹر عامر، کوئٹہ 0332-7829614

😊 سردار ایک پارک میں بینچ پر لیٹا ہوا تھا۔ پاس سے ایک انگریز گزرا تو اس انگریز نے سردار سے پوچھا۔ آر یو ریلیکسنگ Are you relaxing? سردار بولا کہ نو آئی ایم سرجیت سنگھ---اسی طرح دوسرا انگریز گزرا تو اس نے بھی یہی پوچھا۔ سردار نے اُسے بھی وہی جواب دیا اور غصے میں بھرا بینچ پر اٹھ کر اپنے سے کچھ فاصلے پر ایک بینچ پر لیٹے ایک انگریز سے بولا آر یو ریلیکسنگ؟ انگریز بولا کہ یس، آئی ایم ریلیکسنگ۔ یہ سن کر سردار غصے سے بولا۔

"اوئے پاگلا لوکی تینوں لب لب کے جھلے ہو رہے نیں تے توں ایتھے لمبا پیاں ایں۔"

☆.....حسان ملک، بھکر 0301-7950110

😊 چل چلئے مسجد دی اس گھرے
جتھے جوتیاں دی لمی قطار ہووے
اک توں چک لے اک میں چک لاں
ساڈی عید بڑی مزیدار ہووے
(منجانب: جوتی چور گروپ)

☆.....ایم راشد، ہری پور کا گجراں 0313-5878225

😊 کر دیا اس نے بجٹ کا کام سارا ایک دن
نوٹ ہاتھوں میں تھمایا جب گزارا ایک دن

☆.....جان محمد، لاہور 0312-4204063

😊 ماڈرن ڈکشنری

محبت: جس کے دم سے رسٹورنٹ آباد ہیں

سٹوڈنٹ: مستقبل کا بے روزگار طبقہ

کتاب: وقت ضائع کرنے کا ایک ذریعہ

دل: بغیر آپریشن کے بھی کسی کو دیا جا سکتا ہے

پردہ: جسے اب لڑکیاں کھڑکیوں پر ڈالتی ہیں

☆.....ایم سلیم ساغر، میانوالی 0333-7258143

😊 جاگیردار: اگر میں صبح اپنی کار میں نکلوں تو شام تک اپنی آدھی زمین بھی نہیں دیکھ سکتا۔

سردار: ہمارے پاس بھی پہلے ایسی ہی ایک کار تھی۔

☆.....ممتاز علی خان، باغ آزاد کشمیر 0312-5100551

😊 سردار نے اپنا گھر تعمیر کروایا، بنوانے کے بعد اوپر والے کو خوب اچھا کلر کروایا اور نیچے والے حصے پر لکھوایا "Same as above"

☆.....ہارون حسرت جالندھری، سرگودھا

😊 سوال: Mangoes کا کیا مطلب ہے---آم کا درخت؟ نہیں--- فروٹ کی دوکان؟ نہیں--- تو پھر؟---سمجھی جہاں جہاں Woman goes وہاں وہاں Man goes

☆.....وقاص عدیل، جھنگ 0314-3403141

😊 ایک سٹوڈنٹ دوسرے سے: آج کچھ ایسا کام کرنا چاہیے جو ہم نے پہلے کبھی نہ کیا ہو۔

پہلا سٹوڈنٹ: تو چلو پھر آج تھوڑا سا پڑھ لیتے ہیں۔

☆.....بلال احمد، کھاریاں 0333-9653781

😊 بیوی: آپ نے پچھلے سال مجھے لوہے کا بیڈ بنوا کر دیا تھا، اس بار کیا ارادہ ہے؟

شوہر: اس سال اس میں کرنٹ چھوڑنے کا ارادہ ہے۔

☆.....منظور احمد اعوان، مدینہ منورہ سعودی عرب 00966508793617

😊 وکیل: طلاق دلوانے کے پچاس ہزار ہوں گے۔

شوہر: پاگل ہو گئے ہو کیا، مولوی صاحب نے تو نکاح پڑھانے کے 500 روپے لیے تھے؟

وکیل: تو پھر دیکھ لیا نا، سستے کام کا نتیجہ؟

☆.....اصغر لطیف، میرپور آزاد کشمیر 0345-5454540

😊 سوال: وہ کون سا ڈیپارٹمنٹ ہے جہاں خواتین کام نہیں کرتیں۔

جواب: فائر بریگیڈ--- کیونکہ خواتین کا کام تو آگ لگانا ہے، بجھانا نہیں۔

☆.....علی عمران جونیئر، کراچی 0345-3098891

دوستو! نگاہ انتخاب مجموعہ ہے ایسی نوع بہ نوع دلچسپیوں کا کہ جنہیں ہماری نگاہ نے آپ کے لیے انتخاب کیا۔ مزید براں آپ کی جانب سے موصول شدہ دلچسپ مزاحیہ آئٹمز (لطائف، اشعار، قطعات) بھی اس انتخاب عمل کی "زد" میں آ سکتے ہیں لہٰذا اپنے مکمل تعارف کے ساتھ آپ اپنا انتخاب اس ایڈریس پر روانہ کریں۔

دفتر تیس روزہ چاند (انچارج نگاہ انتخاب)
F-29 شمع پلازہ فیروز پور روڈ لاہور

☆ شاہد اطہر

سوچ پٹاری

اولادِ حاضرہ: حالات حاضرہ سے آپ سب واقف ہیں تو پھر موجودہ دور کی اولاد کو اولادِ حاضرہ کہنے میں قطعی کوئی حرج نہیں--- اولاد کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں مگر یہاں کسی کی اہمیت پر بات کرنا مقصود نہیں بلکہ عنوان کے مطابق "اولادِ حاضرہ" کا جائزہ لینا ہی مقصد ہے۔

بچپن سے ہی ہر شخص کا فقیروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہر شے کی طرح پہلے زمانے کے فقیر بھی "حلال" کی بھیک مانگا کرتے تھے اور ایسی ایسی دُعائیں دیتے تھے کہ جسے سن کر جیب ڈھیلی کرنا لازم ہو جاتا تھا--- اُس وقت کے اِنسان شناس فقیر غیر شادی شدہ جوڑوں کو جو سب سے زیادہ دُعا دیا کرتے تھے وہ یہ تھی کہ "اللہ تجھے چاند سا بیٹا دے"--- لڑکی یہ دُعا سن کر شرماتی اور لڑکا گھبرا جاتا اور پھر لڑکی لڑکے سے کہتی کہ بیچاری کو کچھ دے دو--- یہ دُعا پھر اتنی عام ہو گئی کہ خاندانی منصوبہ بندی پر سختی سے عمل کرنے والوں کو بھی یہ دُعا دی جانے لگی اور وہ سوچ میں پڑ جاتے کہ حفاظتی اقدامات پر بھروسہ کیا جائے یا فقیر کی دُعا سے ڈرا جائے--- دوسری مقبولِ عام دُعا کا سرا بھی اولاد سے ہی ملتا تھا کیونکہ اُس میں اللہ سے چاند سے دُلہن دینے کی درخواست کی جاتی تھی اور دُلہن کا مطلب ہوتا ہے--- بہرکیف' ممکنہ دُلہن اِن دُعاؤں سے بہت مسرور ہوتی--- اولادِ حاضرہ کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے ہمیں ماضی میں بھی جھانکنا پڑے گا۔

پہلے زمانے میں شادی کا اوّلین مقصد اولاد ہوتا تھا۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی ساس بہو کی جاسوسی شروع کر دیتی کہ متلی کب ہوتی ہے۔ اب بیچاری بہو کو اگر فوڈ پوائیزن کی وجہ سے ہی متلی ہو جاتی' محلے میں 20'10 کلو لڈو تقسیم ہو جاتے تھے--- اب شادی کا اوّلین مقصد ساس بہو کا جھگڑا ہوتا ہے۔ لڑکیاں سیانی ہو گئیں ہیں اور روزِ اوّل سے "حفاظتی اقدامات" پر عمل پیرا ہو جاتی ہیں مبادا اولاد نہ ہو جائے تا کہ وہ اولاد کے جھنجھٹ میں پڑ کر لائف "انجوائے" کرنے سے محروم نہ ہو جائیں--- ساس بھی اِس وقت تک بے حد خوش رہتی ہے جب تک بہو کو متلی نہیں ہوتی۔ اگر قدرتی پاؤں بھاری بھی ہو جائے تو روتے ہوئے اہلِ محلّہ کو بتائے گی کہ آج نگوڑی نے اپنا بنایا ہوا کھانا کھا لیا تھا جس سے فوڈ پوائیزن ہو گیا ہے--- پہلے بہو کا پاؤں بھاری ہوتا تو خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی' اب خرچے کی فکر لگ جاتی ہے۔ اُس وقت پاؤں بھاری ہوتے ہی دُلہن کو مہارانی کی طرح برتاؤ کیا جاتا اور اب نوکرانی والا سلوک کیا جاتا ہے۔ پہلے دُلہن کو ساس کہتی۔

"اے دُلہن! قسم ہے تم کو جو پاؤں بھی زمین پر رکھا۔ مَیں ہوں' نا! جتنا آرام ہو سکے کرو' جو کام ہو ہم سے کہو۔ جو دل چاہے کھاؤ اور جو دل چاہے پکواؤ--- دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو۔"

آج کی ساس کہتی ہے۔

"بچے ہم نے بھی پیدا کئے ہیں' نخرے کرنے کی ضرورت نہیں۔ بے نظیر وزیرِ اعظم ہو کر بچے پیدا کر سکتی ہیں تو تم کیا شے ہو--- اب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے نہ دوں گی' کام کرو کام۔"

بہرحال' اولاد پہلے بھی پیدا ہوتی تھی' اولاد اب بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن پہلے دائی اماں تشریف لاتی تھیں۔ ایک جوڑا کپڑے' تھوڑی سی مٹھائی اور بہت تھوڑے سے پیسوں کے عوض اپنا کام نمٹا کے یہ جا وہ جا' اور اب--- اِدھر دُلہن کا پاؤں بھاری ہوا' اُدھر ڈاکٹر کی تجوری کا منہ پیسے بٹورنے کے لئے کھل جاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر اِس اَمر کو لازم کر دے

3/4

گی کہ ہر ہفتے چیک اَپ کروایا جائے اور ہر مرتبہ بھاری فیس وصول کی جانے لگتی ہے اور انجام یہ ہوتا ہے کہ بڑا آپریشن کر کے ہی چھوڑتی ہے' یوں عام آدمی کو بچہ 50 ہزار میں پڑتا ہے--- اولاد پیدا ہوتے ہی دوسری آواز آذان کی سنائی جاتی تھی' پہلی آواز دُنیا کا ہر بچہ اپنے رونے کی سنتا ہے' اب موبائل کی رِنگ ٹون سنتا ہے۔ پہلے بچہ ماں باپ' نانا نانی' دادا دادی کو دیکھ کر مسکرانا سیکھتا تھا۔ اب پیدا ہوتے ہی ٹی وی دیکھتا ہے اور ظاہر ہے' وہی کچھ سیکھے گا جو اِس معصوم کو ٹی وی پر دِکھائی دے گا--- پہلے اولاد قابلِ مطالعہ ہوتی تو اُسے قرآن پاک پڑھایا جاتا' اب انگریزی نظم یاد کروائی جاتی ہے۔ پہلے نماز سکھائی جاتی تھی' اب ڈانس سکھایا جاتا ہے--- اِن حالات میں جب اولاد جوان ہوتی ہے تو بس پھر اللہ ہی اللہ۔ ساحر لدھیانوی نے کیا خوب کہا تھا---

''تیرے بچپن کو جوانی کی دُعا دیتی ہوں
اور دُعا دے کے پریشان سی ہو جاتی ہوں''

مزاح کے شہنشاہ' مشتاق یوسفی ایک جگہ اِسی بات کو کچھ اِس طرح لکھتے ہیں۔

''اب میرا پاؤں میرے بیٹے کے جوتے میں فٹ آ جاتا ہے۔''

ہمارے جیسے معمولی آدمی کا ایک مقولہ بھی دوستوں میں بڑا ہٹ ہوا ہے کہ ''ابا کی تے نخرا کی'' --- اپنے اطراف میں نظر دوڑائیں' ہماری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

اولادِ حاضرہ میں جیسے ہی اولاد جوان ہوتی ہے' سب سے پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انہیں باپ بے وقوف اور دوست سیانے نظر آنے لگتے ہیں۔ دوست جو بھی کہے گا' وہ صحیح ہوگا اور باپ جو بھی کہے گا' وہ غلط--- عمرانی ارتقا کے مقلید اِس کو جنریشن گیپ کہتے ہیں۔ ہم اِس بات سے قطعی متفق نہیں' یہ جنریشن گیپ پہلے کیوں نہیں تھا؟

پہلے باپ ایک بارعب اور ڈراؤنی چیز ہوا کرتا تھ۔ اب اولاد سے ڈر لگتا ہے۔ پہلے باپ کی عزت ہوا کرتی تھی' اب اولاد کے ہاتھ میں باپ کی عزت ہے۔ آج کل کی اولاد ماں باپ کو گھاس صرف اور صرف اِس وقت ڈالتے ہیں جب کوئی مقصد ہو۔ دوستوں میں خوش گپیاں لگانے والے والدین کے سامنے اتنے روکھے ہوتے ہیں کہ بیان کرتے ہوئے بھی جی جلتا ہے۔ بازاروں میں لوگوں کی آنکھ کا تارا' یعنی آپ کا راج دلارا گھر میں فقط شرارہ ہوتا ہے--- ماں تو ہر دور میں ماں ہی ہوتی ہے مگر باپ کے لئے یہ سب کچھ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وللہ کسی نے اولادِ حاضرہ کے لئے کیا خوب کہا ہے کہ ''ایک باپ دس بچوں کو پال لیتا ہے مگر دس اولادیں ایک باپ کو نہیں پال سکتیں'' --- پھر ایک سہانے دِن اولادِ حاضرہ عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ یہ وقت والدین کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اولاد لڑکا ہو تو عزت اور دولت جاتی ہے اور اگر لڑکی ہو تو سب کچھ ہی چلا جاتا ہے۔

لیجئے' پیر جنگلی کا فون آ گیا' ذرا بات کرلوں۔

''ہیلو' شاہد میاں! کیا لکھ رہے ہو؟''

''پیر جی! ''اولادِ حاضرہ'' پر کچھ لکھ رہا ہوں۔''

''مت لکھو بھائی! اولاد نے پڑھ لیا تو اِس سے بھی جاؤ گے۔''

''پیر جی! مسئلہ یہ ہے کہ اب اولادِ حاضرہ جوانی میں قدم رکھتے ہی سگریٹ پی کر عیاشی کا آغاز کرتی ہے' اب ہم کیسے خاموش رہیں؟--- لڑکی ہو تو 16 سال کی عمر میں بوائے فرینڈ بنا چکی ہوتی ہے۔''

''اب سمجھ آیا کہ مَیں نے شادی کیوں نہیں کی؟--- مجھے یہ حالات پہلے ہی نظر آ گئے تھے۔ مَیں تو اب بھی تمام کنواروں کو مشورہ دوں گا کہ شادی ہرگز مت کرنا' چاہو تو شیخ رشید کی طرح زندگی گزار دو۔''

''پیر جی! آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ اولادِ حاضرہ سے ہٹ کر بھی ہمارا خیال ہے کہ سب کو خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا چاہئے۔''

''کیوں' میاں! سارے مولویوں کو اپنے خلاف کرو گے؟''

''جن میں ایمان کی کمزوری ہوتی ہے' وہی ایسی باتیں کرتے ہیں--- اب دیکھیں' نا! جس رُوح نے دُنیا میں آنا ہے' اُس نے تو آنا ہی ہے۔ لوگ احتیاط کریں' پھر بھی جو اللہ کی مرضی ہوگی' وہ تو ہونا ہی ہے۔ یہ ہمارے معاشی اور دیگر مسئلوں کا واحد حل ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں' نا!''

''بھائی میاں! مَیں تو سمجھ رہا ہوں مگر یہ قوم ہرگز نہ سمجھے گی--- تم لگے رہو' مُنا بھائی!''

''پیر جی! آپ بھی ماموں ہیں؟''

''اچھا بھئی' مضمون لکھنے کی کوئی ذاتی وجہ تو نہیں؟''

''نہیں مگر اپنے اطراف جو کچھ دیکھ رہا ہوں' جی جلتا ہے۔''

''مت جلاؤ جی--- لوڈ شیڈنگ کرو' بجلی پہلے ہی کم ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اخلاقی اقدار بہت کم بلکہ ختم ہی ہوتی جا رہی ہے۔''

''ہا' ہا' ہا--- اخلاقی اقدار؟--- فون بند کرنے سے پہلے اولادِ حاضرہ کا نچوڑ سن لیں۔ ایک لڑکے نے اپنے والد کو آواز دی کہ ''ابا! اِدھر آ--- اوئے ابا! اِدھر آ'' --- والد نے صاحبزادے کو کہا کہ ''مَیں تمہارا باپ ہوں' مجھے عزت سے بلاؤ'' --- جانتے ہیں کہ لڑکے نے کیا کہا؟--- ''اوئے ابا! چل فوراً عزت سے آ جا۔'' اچھا' پیر جی! خدا

حافظ---!"

"خدا ہی حافظ میاں! سب کا خدا ہی حافظ ہے۔"

اولادِ حاضرہ اپنے والدین سے سیانی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہوتے ہیں' سمجھتے ہیں ساری دُنیا اندھی ہے حالانکہ وہ خود اندھے ہوتے ہیں اور ساری دُنیا دیکھ رہی ہوتی ہے---اولادِ حاضرہ کی لڑکیاں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ اللہ معاف کرے' 7 سال کی بچی سے آپ پوچھیں بڑی ہو کہ کیا بنو گی؟ تو جواب ملے گا کہ ایشوریہ رائے---ڈراموں اور فلموں نے اِن لڑکیوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ وہ ہر فیشن اپنایا جاتا ہے جو اسٹار پلس کے ڈراموں میں نظر آتا ہے۔ موبائل فون نے اِن لڑکیوں کے اخلاق کی قبر میں آخری کیل بھی ٹھونک دی ہے۔ پہلے جو کام گھر میں رکھے کمپیوٹر سے چیٹ کے ذریعے ہوتا ہے' اب شریف بیبیاں موبائل سے لے کر کر رہی ہیں۔ عام والدین موبائل کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے لہٰذا لڑکیاں لڑکوں کو پھانس کر ایزی لوڈ کرواتی رہتی ہیں' اس چکر میں کبھی نہ کبھی اُن کا بھی "ایزی لوڈ" ہو جاتا ہے۔

اولادِ حاضرہ کے لڑکے اپنے اخراجات کو مکمل کرنے کے لئے گھر سے چوریاں شروع کرتے ہیں' پھر دس لڑکیوں سے ایک ہی وقت میں دوستیاں کرنے کے نتیجے میں اخراجات بہت بڑھ جاتے ہیں اور اِن اخراجات میں موبائل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں اور اِن کا حل بھی موبائل سے ہی نکالا جاتا ہے۔ یعنی موبائل چھین کر--- ہمارے ملک میں روزانہ کم سے کم ایک ہزار موبائل فون چھین لئے جاتے ہیں۔

تعلیم وہ چیز ہے جسے 95 فیصد اولادِ حاضرہ پسند نہیں کرتی۔ معیارِ تعلیم' نظامِ تعلیم پر تو بات کرنا بھی فضول ہے مگر نہ جانے آج کل کی اولاد کو کون سا وائرس لگ گیا ہے' سمجھتے ہیں کہ بغیر ہنر اور تعلیم کے زندگی گزار سکتے ہیں۔ اب زندگی تو ٹنٹے کی بھی گزر جاتی ہے' پھر اشرف المخلوقات کے گھر میں پیدا ہونے کا کیا فائدہ؟--- کھانے پینے کا شعور ہے' نہ شوق۔ برگر فیملیوں کو دیکھ کر سب ہی برگر ہو گئے ہیں۔ گھر کے صاف ستھرے کھانوں سے موت پڑتی ہے۔ ہمارے ہمزاد بھولے نے ایک دن حالاتِ حاضرہ سے تنگ آ کر ہم سے پوچھا۔

"آخر ہم سب کہاں جا رہے ہیں؟"

ہم نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا۔ "بس' خوشی کی بات یہ ہے کہ سارے پاکستانی جنت میں جائیں گے کیونکہ ہم سب نے جہنم یہیں بھگت لیا ہے۔"

☆☆

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا: قارئین کرام! زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اُس رات ہم اچھے بھلے سوئے تھے' خواب بھی دیکھا اور صبح کو ہم فوت شدہ پائے گئے---اللہ ہماری مغفرت کرے' آمین! بے غم نے ایڈیٹر چاند کو خبر دی اور چاند کی ایڈیٹری (عصمت ضیاء) نے "میل ملاقات" میں لکھ دیا۔

"قارئین! انتہائی افسوس کے ساتھ آپ کو یہ خبر دی جاتی ہے کہ "چاند" کے چاند' سورج راجا' مہاراجہ' شاہد اطہر قضاء الٰہی سے وفات پا گئے ہیں---اب چونکہ وہ ہمارے آپ کے کسی کام کے نہیں رہے لہٰذا اُن پر مزید لکھنا بیکار ہے مگر اُن کی خدمات کے اعتراف میں بعد از مرگ اگلے شمارے میں "سندیسے" ہم اُن کے نام کر رہے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کھل کر اپنی آرا کا اظہار کریں---!

مرنے کے باوجود ہمیں کوفت ہو رہی تھی کہ پھر سے "چاند" کا انتظار کرنا پڑے گا۔ بہر کیف' ایک نہ ایک دن انتظار ختم ہوا۔ ہم سیدھے سندیسوں کے کالم پر جمپ مار کر پہنچ گئے۔ "آہ" اور "واہ" نکل گئی۔ قارئین نے واقعی کھل کر بے لاگ تبصرے فرمائے تھے۔ بوجہ فوتگی ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے' قارئین خود ہی ملاحظہ فرما لیں۔

خالد بن حامد: لیجئے' اپنے شاہد اطہر بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ادارہ افسوس کا اظہار کرتا ہے اور لواحقین کو مبارکباد دیتا ہے کہ اُن کی جان چھٹ گئی--- قارئین! مرحوم کے کردار و گفتار پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مثلاً وہ مجھ سے کبھی ملنا نہیں چاہتے تھے حالانکہ میرے دروازے ہمیشہ اُن کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ اگرچہ اُن کی لکھائی پروفیسر ظریف خان کی طرح باریک نہیں تھی مگر کمپوزر کو دُشواری ضرور ہوتی تھی۔ مجھے اُن کی وفات پر یوں بھی افسوس ہے کہ اب میں کس کے مضمون کی نوک پلک اِس تواتر سے سنوارا کروں گا؟--- مرحوم کی معلوماتِ عامہ بے پناہ تھی۔ "آج" ٹی وی کے مشہور کمپیئر کو "فرحت حسین" لکھ دیتے تھے جسے مَیں مسکرا کر "طلعت حسین" کر دیا کرتا تھا۔ اُن کی ناگہانی موت سے مَیں اِس لئے بھی دُکھی ہوں کہ مَیں نے اُنہیں چھوٹا موٹا لکھاری بنانے میں بڑی مدد کی تھی۔ مجھے اِس بات کا بھی ملال ہے کہ وہ ڈاک بڑے ہی زبردست لفافے میں بھیجا کرتے تھے۔ ڈاک کو چھوڑیں' وہ لفافے میرے بڑے کام آیا کرتے تھے--- مرحوم فون کم کم ہی کرتے مگر جب بھی کرتے' مَیں کاٹ دیتا تا کہ اُن کا بے جا خرچہ بچا سکوں۔ مَیں نے اُن کی تحریروں کو تقریباً دوبارہ لکھ کر شائع کیا۔ لوگوں نے شاہد اطہر کو پسند کیا۔ "چاند" میں سب سے زیادہ شائع ہونے پر بعد از مرگ مَیں اُنہیں تمغۂ حسنِ کارکردگی عطا کرتا ہوں۔

پروفیسر ظریف خان: شاہد اطہر کی وفات میرے لئے انتہائی صدمے کا باعث ہے کہ مرحوم مجھے بڑا بھائی اور اپنی ناقص ترین اُردو کا اُستاد سمجھا کرتے تھے۔ موصوف کیسا لکھتے تھے' اس پر کیا کہوں مگر حق ہے میں اُن کی اِس بات سے بڑا ہی متاثر تھا کہ ایک بندہ جو اُردو سے قطعی نابلد ہو وہ لکھ کیسے لیتا ہے؟ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تحریریں مجھے ارسال کیا کرتے تھے اور میں ہزاروں انگریزی کے الفاظ کو مسلمان کر کے اُردو میں لکھا کرتا تھا--- بڑے باصلاحیت تھے اور دُوسروں سے کام نکلوانے میں ماہر تھے جیسے مجھ سے اُردو کی درستگی وغیرہ کرواتا۔ ''میل ملاقات'' میں میں نے اُن سے زیادہ نااہل شخص کبھی نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ تو گوجرانوالہ کے گیٹ تک آ کر واپس چلے گئے۔ جب جب میں اسلام آباد گیا اور اُن کے موبائل پر رابطہ کیا تو اپنا فون خود ہی اُٹھا کر بولے کہ ''شاہد صاحب لاہور گئے ہوئے ہیں'' --- میرے خیال میں اُن کی ایک غلطی نے اُن کو تمام لوگوں سے ملنے پر دُور کر دیا اور وہ یہ کہ ''چاند'' میں اُنہوں نے اپنے چچے کی تصویر اپنے نام کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی تھی۔ بہرحال' اسلام میں فوتگی کے بعد مرنے والے کو بُرا نہیں کہتے لہٰذا اگر وہ بدشکل بھی تھے تو بھی اللہ اُن کی مغفرت کرے۔

شکیل عادل: شاہد اطہر کی وفات کی خبر میرے موبائل پر بجلی کی طرح گری۔ مرحوم روزانہ مجھے 50 میسج ضرور کیا کرتے تھے جس کے لئے اُن کے موبائل پر میں بیلنس ڈلوایا کرتا تھا (یہ بات میں صرف مرحوم اور اپنے درمیان محبت کا اندازہ کروانے کے لئے بیان کر گیا ہوں) مرحوم اپنی تمام کی تمام سہیلیوں کے بارے میں نہ صرف مجھے بتایا کرتے تھے بلکہ اُن سہیلیوں کے تمام میسج بھی مجھے ارسال کیا کرتے تھے--- میسج کرنے میں وقت کا خیال نہ رکھتے' یہ اُن کی بے پناہ محبت ہی تھی کہ رات دو' تین بجے بھی میسج کر کر کے تنگ کرتے رہتے تھے--- بہت اچھے اِنسان اور لکھاری تھے۔ مجھ سے اکثر پوچھا کرتے کہ کس ٹاپک پر لکھوں اور پھر میرے بتائے ہوئے آئیڈیاز پر لکھا دیا کرتے اور ہمیشہ میرا شکریہ ادا کیا کرتے۔ کئی مرتبہ تو میری اُن تحریروں کا چربہ بھی لکھ مارا جو ابھی شائع بھی نہیں ہوئیں تھیں' پھر مجبوراً ایڈیٹر نے میری تحریروں کی اشاعت سے گریز کیا--- اپنی بے غم کی وجہ سے موبائل کال گرلز سے بہت تنگ تھے اور اکثر اُن کے نمبرز مجھے دے کر فرمائش کرتے کہ ''پلیز' سب کو سو سو کے ایزی لوڈ کروا دوں اور میں صرف اُن کی عقیدت میں ایسا کر بھی دیا کرتا تھا--- ہائے' اُن کے جانے کے بعد میں یہ سب کیسے کروں گا' کون مجھے میسج کر کر کے عاجز کرے گا؟ خدا اُن کو جہنم سے بچائے' آمین!

سید ابرار بخاری: مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شاہد اطہر کو ''چاند'' میں اگر کچھ مقام ملا تو وہ میری وجہ سے ملا۔ جب انہوں نے سالوں پہلے ''چاند'' میں اپنی پہلی تحریر ''لے پالک'' لکھی تو غلطی سے میں نے اُن کی کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی۔ میں نے لکھا تھا ''عرصے بعد ہم مزاح کے دلدادہ لوگوں کو کوئی اچھی تحریر پڑھنے کو ملی ہے'' --- پتہ نہیں اِس حوصلہ افزائی نے مرحوم میں کیسی چابی بھر دی کہ پھر جو لکھنا شروع کیا تو لکھتے ہی چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے مستر تنقید نگار بن کر بھی اُن پر نرم ہاتھ ہی رکھا جس سے مرنے تک وہ لکھنے سے باز نہ آئے--- آئندہ میں کسی بھی لکھاری کی سوچ سمجھ کر ہی تعریف کروں گا۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ مرحوم مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے اور بطور سینئر میری عزت بھی بہت کرتے تھے۔ اکثر کہتے کہ میں نے جو بھی سیکھا ہے' وہ سید ابرار بخاری سے سیکھا ہے--- مجھے صرف اُن کی ایک بات اچھی نہیں لگی کہ انہوں نے میرے پروگرام ''آمنا سامنا'' کو پسند کرنے کے باوجود شرکت نہیں کی۔ شاید اِس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ ''چاند'' کے بڑے لکھاری بنے تھے۔ کاروباری تو وہ تھے مگر اُن کی سائیکلوں کی چھوٹی سی دوکان تھی--- بہرحال میں نے زندگی میں اُن کی تعریف کی تو مرنے پر بھی کروں گا۔

سیما جان: اللہ رے یہ کیا ہو گیا--- ہائے' کیوں ہو گیا--- میری دُنیا اُجڑ گئی' میرا پیار لٹ گیا بلکہ قبر میں جا لیٹا--- قارئین! آج مجھے کوئی نہ روکے' میں دِل کی بھڑاس نکال کر رہوں گی۔ میں مرحوم سے اور مرحوم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ ہمیشہ مجھے ''سیما--- جان'' کہتے۔ ''جان'' ہمیشہ علیحدہ سے کہتے' کبھی نام کا حصہ نہ بنایا۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے' انکار مجھے بھی نہ تھا مگر چونکہ شادی سے محبت کا جنازہ نکل جاتا ہے' اِس لئے ایسا نہ ہو سکا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اِن کا اپنا ہی جنازہ نکل جائے گا ورنہ میں تھوڑی دو بول پڑھوا ہی لیتی--- میرے معاملے میں بڑے حساس تھے' حکیم عنایت اللہ شاہد کو رقیبِ روسیا سمجھا کرتے تھے۔ مجھ سے ہمیشہ کہتے کہ اِس نیم حکیم سے بچ کر رہنا اور اِس کی دواؤں کو بھی استعمال نہ کرنا ورنہ یہ تم کو جلن کی وجہ سے لڑکا بنا دے گا--- ہائے' شاہد اطہر! آپ کہاں غرق ہو گئے' اب میں کہاں جاؤں؟ اب مجھ سے کون اتنی محبت کرے گا۔ آپ کے جانے سے میری دُنیا لٹ گئی ہے--- حکیم عنایت اللہ شاہد! پلیز' مجھے لڑکا بنا دیں' اُن کے جانے کے بعد شاید میں پروفیسر ظریف خان کا ہی منظورِ نظر بن سکوں۔

منیر احمد شہزاد بلوچ: (ہمارے فوت ہونے سے صرف ایک ماہ پہلے کا اِن کا سندیسہ ملاحظہ فرمائیں)

''محترم شاہد اطہر صاحب! دوسروں کو خوش رکھنے کا منشور تو بہت ہی نرالا ہے لیکن ہمیں خوش رکھنے کے لئے کبھی کبھار تو اپنے بے چارے

قلم کو بھی زحمت دے دیں' نا! چاند کی اکلوتی چکرم اور شاہد اطہر کی جان (سیما جان)! ہم تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ اپنا خیال رکھیں کہ آپ سب سے جدا ہیں--- (ہمارے مرنے کے بعد لکھتے ہیں) شاہد اطہر کی وفات ہم پر بجلی بن کر گری ہے کیونکہ مرنے سے پہلے وہ سیما جان کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں تھما گئے تھے کیونکہ اُن کو اپنی زندگی کا پتہ نہیں بھروسہ تھا یا نہیں مگر سیما جان پر بھروسہ ہرگز نہ تھا--- مرحوم نے مرنے سے صرف دو دن پہلے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم پر ایک لو اسٹوری لکھیں گے مگر افسوس! وہ اپنا وعدہ وفا نہ کر سکے۔ بس اس غم میں ہم نے کسی سے لو نہ کرنے کی قسم کھالی ہے اور اپنی سابقہ چار عدد محبوباؤں کو قبل از شادی طلاق دے دی ہے۔ ہمیں جہاں "چاند" کے اس عظیم بلکہ قدیم لکھاری کے مرنے کا افسوس ہے' وہاں اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اب دوسروں کو بھی شائع ہونے کا موقعہ ملے گا۔ بہر حال' مرحوم نے جتنے کاغذ کالے کئے' اس کے لئے انہیں خراجِ تسکین۔

نازیہ ناز نازی: قارئین! اگرچہ میَں خود بہت بڑی لکھاری ہوں اور ہر ماہ تین چار لائنیں "چاند" میں لکھا کرتی ہوں مگر "خس کم جہاں پاک" کے محاورے کا مطلب مجھے شاہد اطہر کے جانے کے بعد ہوا--- مرحوم جو "پیشانیوں" میں ہم جیسی معصوم خواتین کے خلاف زہر اُگلا کرتے تھے' اُس کی وجہ سے میَں نے CDA اسلام آباد والوں کو درخواست دی ہے کہ مرحوم کو کسی ایسے قبرستان میں جگہ بھی نہ دی جائے جہاں خواتین بھی دفن ہوں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو موصوف کو جلا کر راکھ گنگا میں بہا دی جائے--- مغفور مجھ سے ملنے کے بہت خواہشمند تھے' اکثر اپنے جاسوس کو بھی میرے پیچھے لگائے رکھتے تھے مگر اُن کو کچھ نہ ملا' اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ چند لوگوں نے اُن کو بانس پر چڑھا دیا تھا ورنہ مزاح لکھنا تو دُور کی بات ہے' محترم کو تو ٹھیک سے قلم بھی پکڑنا نہیں آتا تھا۔ تصدیق شدہ اطلاع ہے کہ ایک عورت جو بدقسمتی سے اُن کی بے غم بھی تھیں' اُن کے لئے لکھ دیا کرتی تھیں۔ (قارئین چاہیں تو خالد بن حامد صاحب سے اِس اَمر کی تصدیق کر سکتے ہیں) مجھے ذاتی طور پر اُن سے کوئی دُشمنی نہیں لیکن میَں اُن کو لکھاری ماننے پر تیار نہیں۔ اپنے جھوٹے قصوں کو نمک مرچ لگا کر پیش کرنے کو مزاح نہیں کہتے۔ چاند والے فکرمند نہ ہوں' اب میَں مرحوم کی کمی پوری کر دوں گی۔

بابر احمق: مرنا سب کو ہی ہے لیکن افسوس! شاہد اطہر میرے لئے کچھ اچھی یادیں نہیں چھوڑ کر گئے۔ قارئین! آپ خود فیصلہ کریں' میَں چار سال سے مسلسل ہر روز اُن کو کئی ای میل کرتا ہوں مگر وہ کبھی جواب نہیں دیتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ میرے پیغامات میں وائرس ہے۔ مرحوم یہ بھی بھول گئے کہ میَں نے انہیں لکھاری بنانے میں بڑی محنت کی' اُن کی معمولی تحریروں کی اتنی تعریف کی کہ وہ خود کو رائیٹر سمجھنے لگے حالانکہ اُن کو میرا شکر گزار ہونا چاہئے تھا--- قارئین! اب وہ دُنیا میں نہیں رہے لیکن افسوس! کہ مرحوم نے ایک مرتبہ بھی اعتراف نہیں کیا کہ میَں ای میلز میں اُن کو اچھے اچھے آئیڈیاز دیا کرتا تھا۔ اِسی وجہ سے اُن کو ٹی وی تک میَں لکھنے کی آفر ہو گئی۔ یہ اُن کی نااہلی تھی کہ وہ صرف "چاند" سے ہی چپکے رہے۔ اُنہوں نے کچھ اچھی تحریریں بھی لکھیں' وہ سب میری ہی بتائی ہوئی تھیں۔ بہتر ہوتا کہ میَں خود ہی لکھ لیتا--- مرحوم لڑکیوں کے سلسلے میں بہت دل پھینک تھے۔ پرانے قارئین کو یاد ہو گا نازک پریاں کا قصہ' بے چارے اُن پریوں کی خاطر سخت جن بن گئے تھے۔ سندیسوں میں مردوں کو جواب دینے میں اُنہیں مزہ نہیں آتا تھا' لڑکیوں کو بہت اچھے اچھے سندیسے لکھتے۔ بہر حال' مرنے والے کو معاف کر دینا چاہئے اِس لئے میَں اُن کو معاف کرتا ہوں اور مغفرت کی دُعا کرتا ہوں۔

حکیم عنایت اللہ شاہد: شاہد اطہر' اللہ کو پیارے ہو گئے' یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ چار سال سے میَں اُن کو اُدھار دوائیں دے رہا تھا۔ مجھے اس

شگوفے

ایک صاحب اپنے دوست کے بے حد اصرار پر ایک اسٹیج ڈرامہ دیکھنے چلے گئے اسٹیج پر ایک سے ایک حسینہ آ کر ایکٹ کرتی رہی مگر ہر حسینہ کو دیکھنے کے بعد وہ صاحب یہی کہتے۔

"لعنت ہے۔"

آخر دوست سے رہا نہ گیا اُس نے کہا۔ "کمال ہے یار! تمہیں یہاں حسین سے حسین لڑکیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں اور پھر بھی تم کہے جا رہے ہو لعنت ہے۔" وہ صاحب بولے۔

"میَں اِن حسیناؤں کے بارے میں نہیں اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

☆☆

ایک دلکش چہرے کی خاتون بہت تیز رفتاری سے کار چلا رہی تھیں اور کئی مرتبہ اُنہیں جرمانہ ادا کرنا پڑ چکا تھا۔ ایک مرتبہ پھر ایسا ہوا تو اُنہوں نے ایک پولیس آفیسر سے کہا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مجھ سے جرمانہ وصول کیا جاتا ہے جبکہ اکثر لوگوں کو صرف وارننگ کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا اس کی وجہ میرا چہرہ ہے؟"

"نہیں میڈم؟" پولیس آفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اس کی وجہ آپ کا پاؤں ہے۔"

☆☆

ایک کسان ہنسی والی بات پر تین مرتبہ ہنستا تھا کسی نے اس سے پوچھا۔

"بھائی! تم ہر مذاق پر تین مرتبہ ہنستے ہو' آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "ایک مرتبہ میَں لوگوں کے ساتھ ہنستا ہوں' دوسری مرتبہ جب میری سمجھ میں آتا ہے اور تیسری مرتبہ اپنی بے وقوفی پر ہنستا ہوں۔"

نازیہ احمد' گجرات

کا افسوس نہیں کہ میری دواؤں نے اُن کو مرنے سے کیوں نہیں بچایا کیونکہ موت کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا' پھر مجھ غریب حکیم کے پاس کیسے ہو سکتا ہے؟ البتہ پریشانی اس بات کی ہے کہ اب میرے ایک لاکھ چھپن ہزار تین سو بارہ روپے کیسے وصول ہوں گے۔ کاش میں اُن پر اعتبار نہ کرتا اور نقد دوائیں ہی دیا کرتا ---- مرحوم گفتار کے بادشاہ تھے اور سامنے والے کو بوتل میں اُتارنے کا فن جانتے تھے۔ اپنی چکنی چوپڑی باتوں سے مجھے رام کیا اور میں اُن کے چکر میں پھنس گیا۔ ایک مرتبہ میں نے تین ماہ کے لئے اُن کی دواؤں کی سپلائی روک دی تو اُنہوں نے سیما جان کو استعمال کیا اور سپلائی بحال کروالی۔ (اب سیما جان میں تھوڑی سی شرم ہو تو وہ میری ڈوبی ہوئی رقم ادا کریں) جہاں تک مرحوم کی تحریروں کا تعلق ہے' وہ مجھے کبھی سمجھ نہیں آئیں۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ کہ وہ اتنی لمبی لمبی تحریریں لکھتے تھے کہ مجھے پڑھنے میں دس دن لگ جاتے تھے جس سے تسلسل نہ رہتا۔ ویسے بھی زیادہ جھوٹ مجھ سے ہضم نہیں ہوتا اور اختلاج قلب ہونے لگتا ہے ---- مرحوم میری شادی میں بھی آئے تھے اور اتنا کھایا اتنا کھایا کہ مجھے سہاگ رات اُن کی تیمارداری میں گزارنی پڑی۔

بہرحال' صاحب! بڑے سندیسے تھے' اب سب کے۔ سب تحریر کر دیں تو پھر مزید کچھ لکھنے کا وقت ہی نہ بچے گا۔ بس لگے ہاتھوں کچھ اختصار سے بیان کر دیتے ہیں۔ کراچی سے ڈاکٹر ارم نے لکھا ---- "مرحوم اچھے لکھاری تھے مگر ذہنی امراض کی ڈاکٹر ہونے کے ناطے میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں کہ مرحوم نفسیاتی مریض تھے۔" ---- ڈاکٹر تسیم جاوید سید نے کہا۔ "شاہد اطہر نے سعودی عرب مجھے "چاند" رسالے بھیجے' پھر اسلام آباد میں مجھے وصول کرنے سے انکار کر کے ناراض کر دیا۔ وہ اب دُنیا میں نہیں رہے' میں نے بھی ناراضگی ختم کر دی۔" ---- زاہد حسین زاہد نے بھی بھڑاس نکالی۔ "یہ شاہد اطہر ہی تھے جن کی وجہ سے میری تحریریں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ اب میں اُن سے زیادہ شائع ہوا کروں گا۔" ---- عاشر نثار نے لکھا۔ "شاہد اطہر میرے sms کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں sms کرنے بند کروں گا تو اُن کا سانس ہی بند ہو جائے گا۔" ---- اس طرح کے ڈھیروں سندیسے اور تھے لیکن آخری سندیسہ پڑھ کر تو ہماری روح بھی بھڑک اُٹھی اور وہ سندیسہ ہماری بے غم عفیفہ شاہد کا تھا' آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

"قارئین چاند' آداب عرض! قضاء الٰہی سے میرے شوہر نامدار وفات پا گئے ہیں۔ اِنسان کو ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ مرنے والے نے ساری عمر مجھے ایک پل بھی چین سے جینے نہ دیا مگر اس ظلم میں بھی خدا نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ وہ اِس طرح کہ مرحوم کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا' شاید 8 جماعت تو پاس تھے مگر خود کو الیکٹرونکس کا انجینئر اور ایم اے ایل ایل بی مشہور کر رکھا تھا ---- بہرحال' اب مر گئے ہیں اور مردے الیکشن میں حصہ نہیں لیا کرتے لہٰذا دو مرتبہ 8 جماعت پاس کرنے کی وجہ سے انہیں زیادہ تعلیم یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔ میں آپ کو بتا رہی تھی کہ لکھنا پڑھنا کچھ خاص نہ آتا تھا مگر چاہتے تھے کہ اُن کا نام شائع ہوتا رہے۔ مجبوراً میں نے "چاند" میں لکھنا شروع کیا اور اُن کے نام سے تحریریں شائع کروانی شروع کروا دیں۔ محنت میری اور نام اُن کا ہونا شروع ہو گیا۔ خوشی میں گھر کا ماحول زیادہ خراب نہیں رہا ---- بہرحال' اب وہ اطمینان سے جہنم میں بیٹھے بجلی کی لوڈشیڈنگ کو رو رہے ہوں گے۔ میں روزانہ قبرستان جا کر چیک کرتی ہوں کہ قبر مکمل طور پر ٹھیک ہے' کہیں فرشتوں کو چکر دے کر پھر باہر ہی نہ نکل آئیں ---- مرحوم کو قرضے لینے کا بڑا شوق تھا لہٰذا میں اِس تحریر میں اعلان کرنا چاہتی ہوں کہ کوئی ہمارے گھر اِس سلسلے میں نہ آئے بلکہ H-8 اسلام آباد کی قبر نمبر 420 قطار نمبر 10 سے رابطہ کریں۔ میں اپنے نانہجار شوہر کے لئے ساری دُنیا سے معذرت کرتی ہوں اور درخواست کرتی ہوں کہ اُن کے موبائل پر میسج کرنا بند کر دیں۔ 1500 میسج روزانہ کے ڈیلیٹ کرنا بھی عذاب ہے۔ حرف آخر کہ دِل چھوٹا نہ کیجئے گا' لکھنے کے لئے میں ہوں' نا!

☆☆

برقعہ: برقعہ کو موجودہ دور میں جو شہرت لال مسجد کی وجہ سے ملی ہے' وہ گزشتہ 60 سال میں نہ ملی تھی۔ یعنی وجودِ پاکستان سے لے کر تادم تحریر لیکن موجودہ دور میں جھانکنے سے پہلے ہم برقعہ کی تاریخ جغرافیہ پر غور فرمائیں گے:

اِنسانی تاریخ کے اوّلین دور میں برقعہ نہیں ہوتا تھا۔ اِس کی بہت سی وجوہات تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ برقعہ کپڑے سے بنتا ہے اور اُس وقت کپڑا ہوتا ہی نہ تھا ---- چونکہ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا معصوم ذہن اور باتیں سوچنے لگ جائے لہٰذا برقعہ کا تذکرہ وہیں سے کرتے ہیں جہاں سے جب سے اِس کا وجود ہوا ---- اگرچہ کپڑے کے موجد چین والے تھے مگر برقعہ اُسی وقت کی دوسری تہذیب مصر والوں کی ایجاد ہے۔ (خیال رہے' ہم ہزاروں سال قبل از تاریخ کی بات کر رہے ہیں' مذہب اِسلام کا اُس وقت ظہور بھی نہ ہوا تھا) بہرحال' قدیم مصر میں برقعہ ایک عورت نے ایجاد کیا تھا اور یہ بھی خیال رہے کہ اُس زمانے میں قبیلوں کی سردار بھی خاتون ہی ہوا کرتی تھی۔ (ارے جناب اپنی پیپلز پارٹی کی طرح) اور اُس وقت کسی کو عورت کی حکمرانی پر کوئی اعتراض نہ تھا (ارے

جناب! اپنی پیپلز پارٹی کی طرح) اُس دور کی خاص عورتیں نہیں چاہتی تھیں کہ عام لوگ اُنھیں دیکھیں پس اِسی سوچ نے اُن کو برقعہ ایجاد کرنے کی تحریک دی۔ اُس وقت جو برقعہ ایجاد ہوا' اُس کی ہیئت موجودہ دور کے برقعہ سے قطعی مختلف تھی اور صرف چہرے کے اوپر ایک عجیب سا ماسک چڑھایا جاتا تھا جو سر کے بالوں' ماتھے اور ناک کو ڈھانپ لیتا تھا۔ اب اگر آپ اِس سوچ میں پڑ گئے کہ اصل حصوں کو چھوڑ کر اِس قدر مختصر برقعہ کا کیا مقصد تھا؟ تو جواب وہی ہے کہ وہ خواتین فقط یہ چاہتیں تھیں کہ عام لوگ اُن کو شناخت نہ کر پائیں--- اُس دور میں روم' چین اور منگولیہ میں برقعہ کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ وہاں اپنی عورتوں کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کا فقط ایک ہی فیشن تھا کہ اُن کو قید کر کے رکھا جاتا تھا--- تاریخ گواہ ہے کہ جنگوں پر جاتے ہوئے کئی تو اپنی عورتوں کو زنجیروں میں جکڑ کر جاتے تھے۔ جب واپس آتے تو اپنے ساتھ مالِ غنیمت کی عورتیں لے آتے اور بیچاری قیدیوں کو رہائی ملتی۔

اب آیئے عالم اسلام کے ظہور پر۔ اُس دور میں یہ برقعہ ہرگز ایسا نہ تھا جو جامع حفصہ کی لڑکیوں نے پہن رکھے ہیں بلکہ قدیم مصر کے ماسک کو ترمیم کر کے نقاب کی شکل دی گئی' باقی ماندہ جسم کو چادر کے حصار میں رکھا جاتا تھا۔ اُس زمانے کی متبرک خواتین اِسی حالت میں جنگوں میں حصے لیتیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں' پانی پلاتیں۔ اِس سے خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عورتیں مردوں کے کس قدر شانہ بشانہ تھیں اور کہ اُس وقت تک برقعہ عقل پر نہ پڑا تھا--- اب ہم سیدھی چھلانگ لگاتے ہیں مہابھارت کے مغل دور میں۔ مغل افغانستان سے آئے تھے۔ وہ وہاں سے بہت کچھ لائے جن میں ایک اہم ترین شے برقعہ تھی۔ افغان لوگ بڑے ہی مستقل مزاج ہیں۔ اُن کا جو برقعہ ہزار سال پہلے تھا' وہی آج بھی ہے۔ یعنی ایک ہی پیس (ون یونٹ) میں بنا ہوا۔ عرفِ عام میں اِسے ''ٹوپی برقعہ'' کہتے ہیں۔ افغانستان کے اوّلین دور سے لے کر مغلوں کے دور تک افغان برقعہ کا رنگ کالا ہوا کرتا تھا۔ طالبان کے دور میں اُس میں بڑی تبدیلی آئی اور اُس کا رنگ گرگٹ کی طرح تبدیل ہو کر ہلکا نیلا ہو گیا اور تادمِ تحریر افغانستان میں ہلکے نیلے رنگ کا برقعہ مستعمل ہے اور وہ خواتین کے لئے لازم ہے گویا برقعہ اِن کے لئے راشن کارڈ ہے۔ اگر برقعہ پہنا ہے تو روٹی ملے گی ورنہ گولی۔ یہ عموماً چھ گز کا ہوتا ہے یوں افغانی عورتیں زندہ ہوں تو چھ گز کا برقعہ' مر جائیں تو چھ گز کا کفن۔

مغلوں نے ہندوستان فتح کیا تو یہی ٹوپی برقعہ ساتھ لے آئے اور مسلمان عورتوں نے اُسے خوشدلی سے اوڑھا البتہ آغاز میں اُس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ یہ اُسی زمانے کی بات ہے جب ہندو عورتیں ودھوا (بیوہ) ہونے پر سفید کپڑے پہنا کرتیں تھیں۔ اب اِس میں مسلمان خواتین کی کون سی خواہش چھپی ہوئی تھی' اِس کا ہمیں ادراک نہیں ہے--- پھر عورتوں کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فیشن کا بھی ارتقا ہوا اور مغل دور کی معروف عورت انارکلی نے دو پورشن کا فیشن ایبل برقعہ ایجاد کیا جو اب تک رائج ہے۔ شاید اِسی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد لاہور میں برقعوں کا سب سے بڑا بازار انارکلی بازار ہی تھا جہاں اب لڑکیوں کی جینز اور ٹی شرٹ زیادہ ملتی ہیں--- انارکلی نے جب دو حصوں کا برقعہ دُنیا کو دیا تو وہ بڑا ہٹ ہوا اور اُس کا رنگ بھی کالا رکھا گیا۔ جن خواتین کے پاس ٹوپی والے سفید برقعے تھے' اُنھوں نے وہ اپنے بڑھاپے کے لئے سنبھال کر رکھ لئے اور پھر یہ وطیرہ بن گیا کہ جوان لڑکیاں فیشن ایبل کالے برقعے پہنا کرتیں اور بوڑھیاں سفید ٹوپی والا۔ یوں من چلے برقعے کا رنگ دیکھ کر ہی خاتون کے تاریک جغرافیہ کا اندازہ باآسانی لگالیا کرتے۔

کالے برقعوں میں بڑی جدت پیدا کی گئی۔ لیس اور کڑھائی کے کام نے چار چاند لگا دیئے۔ فٹنگ پر توجہ نے جسمانی خدوخال کی اہمیت کو اُجاگر کرنا شروع کیا تو برقعہ سپرہٹ ہو گیا۔ برقعے کے بہت سے

شگوفے

ایک سردار جی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ چائے کا دور چلا۔ سردار جی کچھ دیر چائے میں چمچ چلاتے پھر ایک گھونٹ بھر کر بُرے سے منہ بناتے اور پھر چمچ چلانے لگتے۔ اِسی طرح کرتے ہوئے اُنہوں نے چائے ختم کی اور جوش سے بولے۔

''دوستو! آج میں نے ایک تجربہ کیا اور میں سو فیصد کامیاب رہا۔''

دوستوں نے کہا۔ ''کیسا تجربہ سردار جی؟''

سردار جی بولے۔ ''وہ یہ کہ چائے میں چینی ڈالے بغیر جتنا چاہے چمچ چلا لو مگر چائے میٹھی نہیں ہوتی۔''

☆☆

''تم نے اپنی چھوٹی بہن کو کیوں مارا؟'' باپ نے ڈیوڈ سے پوچھا۔

''ڈیڈی! ہم آدم اور حوا کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اس نے مجھے اُکسانا تھا لیکن اسنے ایسا نہ کیا اور تمام سیب خود کھا گئی۔''

☆☆

پچھلے ہفتے نائلہ نے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدی۔ تین دن کے بعد وہ کار ڈیلر کے پاس گئی۔

''میرا خیال ہے تمہاری دی ہوئی گارنٹی میں ہر قسم کی ٹوٹ پھوٹ شامل ہے؟''

''جی ہاں۔'' کار ڈیلر نے جواب دیا۔ ''آپ کا خیال دُرست ہے۔''

''تب تو تمہیں دو عدد سائیکلیں' گھر کا نیا گیٹ' چھ درجن گلاب کے پودے اور گیراج کی ایک دیوار دینی پڑے گی۔''

مہوش نثار' ملتان

فائدے ہیں۔ چونکہ ہم موجودہ دور میں آ چکے ہیں تو بتاتے چلیں کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد برقعے کو زوال آنا شروع ہوا۔ آزادی کے فوری بعد کسی نے پاکستانی خواتین کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ برقعہ اُتار پھینکنا ہی دراصل آزادی ہے۔ پھر اس تیزی سے برقع متروک ہونا شروع ہوا کہ اللہ اللہ---یوں سمجھ لیں کہ ہر روز ہزاروں خواتین برقع کو خیرآباد کہنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں پاکستان سے برقعہ عنقا ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ 90 کی دہائی میں ایک مرتبہ پھر سے برقعے نے مقبولیت پکڑنی شروع کی اور موجودہ زمانے میں اکثر جگہ برقعے دکھائی دیتے ہیں۔

صاحبو! برقعہ ویسے بہت عجیب شے ہے۔ دانش مند کہتے ہیں کہ اس کا عقل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جب جب عورتوں نے برقعہ اُتارا' یہی برقعہ پھر مردوں کی عقل پر پڑ گیا۔

☆☆

اشعار کی تشریح: اے کاش! کہ ہماری اُردو کی سوجھ بوجھ کچھ اچھی ہوتی' فقط اتنی کہ ہم اگر تنویر پھول کی طرح اشعار کی فیکٹری بھلے نہ بن سکتے مگر پروفیسر ظریف کی طرح اشعار کو سمجھ تو پاتے مگر اب کفِ افسوس ملنے کا فائدہ عبث ہے۔ اب اس کو کیا کیجئے کہ پھر بھی ہمیں اشعار بہت پسند ہیں اور ہم اپنے تئیں اُن کی تشریح بھی خود کو سمجھانے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اور خالد بن حامد صاحب کو اگر ہماری تشریح سے اگر اختلاف بھی ہو تو اُسے فقط شاعر کی نااہلی سمجھا جائے کیونکہ شاعر نے صرف اپنے زمانے کو مدنظر رکھا جبکہ رکھنا ہمارے زمانے کو چاہئے تھا---تو آیئے' پھر ملاحظہ فرمایئے اشعار اور اُن کی تشریح' جان کی امان کے ساتھ---

☆ سراپا معصیت میں ہوں' سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری خطا پوشی ہے کام اُس کا

یہ شعر مولانا ظفر علی خان کا ہے۔ ہمارے بیٹے کا کہنا ہے کہ یہ "حمد" کا شعر ہے۔ اگرچہ یہ حق بات ہے مگر حالات حاضرہ میں معذرت کے ساتھ اِس کا ایک مطلب ایک چور نے ہمیں سمجھایا۔ اُس نے کہا تھا۔

"یہ شعر میرے جیسے چوروں اور خطا کاروں کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس میں ہم چوروں اور تھانیداروں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کی بنیاد رشوت ہے---میں ایک عادی مجرم ہوں اور چوری میرا کام ہے لیکن میں باقاعدگی سے حصہ تھانیدار کو پہنچاتا رہتا ہوں جس کی وجہ سے وہ آنکھیں بند رکھتا ہے۔"

مولانا نے جس اسپرٹ سے بھی شعر تخلیق کیا ہو مگر حالات حاضرہ میں اس کا احوال یہی ہے۔

☆ پتلی گردن' پتلے ابرو' پتلے لب' پتلی کمر
جتنا بیمار آدمی' اتنا طرحدار آدمی

یہ شعر سید ضمیر جعفری کی نظم "آدمی" سے لیا گیا ہے مگر یہ شعر عورت کے بارے میں ہے۔ آج کل کی ماڈرن عورت فاقے کرتی ہے جس سے اُس کی گردن اور کمر پتلی ہو جاتی ہے۔ ابرو کٹوا دیتی ہے اور ایک باریک لائن میک اپ سے بنا دیتی ہے اور لپ اسٹک لائیننگ کے ساتھ اپنے ہونٹ بھی پتلے کر لیتی ہے۔ مجموعی طور پر ڈائیٹنگ وغیرہ کی وجہ سے اس کا سب کچھ پتلا پتلا ہو جاتا ہے---رنگت پیلی ہو جاتی ہے جسے میک اَپ کی تہوں سے گلابی کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی سکڑی سڑی عورتیں معاشرے میں بہت پسند کی جاتی ہیں اور لوگ کہتے ہیں "ہائے اللہ' چو! تم کتنی سمارٹ ہو"---شاعر حیف محسوس کرتا ہے کہ اس قسم کی خواتین کو طرحدار سمجھا جاتا ہے۔

☆ یہ ہوسکتے ہیں اُن کے ہم جنس کیوں کر
نہیں چین جن کو زمانے میں دم بھر
سواری کو گھوڑا' نہ خدمت کو نوکر
نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا' نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر اُلٹی تو تقدیر کھوٹی

مولانا الطاف حسین حالی نے یہ اشعار بلوچستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں کی عکاسی کرنے کے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ بلوچستان پہلے ہی زبوں حالی کا شکار تھا کہ "برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر" کے مصداق وہاں سیلاب نے وہ تباہ کاریاں کیں کہ لاکھوں اِنسانوں کا وہ حال ہو چکا ہے جو شاعر نے بیان کیا ہے---اس مہنگائی کے طوفان میں صدرِ مملکت نے پندرہ ہزار فی خاندان کے حساب سے متاثرین کو دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ پہلا مصرعہ اُسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ شاعر نے اپنے اشعار میں قوم کے ضمیر جو جھنجھوڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ ضمیر صاحب تو نیند کی گولیاں کھا کر سوئے ہوئے ہیں کہ اگر ایک گھرانا سیلاب فنڈ میں فقط 10 روپے کا چندہ ڈال دے تو کروڑوں روپے امداد کے لئے جمع ہو سکتے ہیں لیکن پھر سے پہلے مصرع کو سمجھیں تو یہی بات عقل شریف میں آتی ہے کہ اِنسان اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ گرل فرینڈ کو ایزی لوڈ کروا دے گا مگر سیلاب زدگان کی مدد نہ کرے گا۔

☆ غبارِ راہ نشان ہے کسی تگ و پو کا
یقین ہوتا ہے نقشِ قدم سے رہرو کا

صنم تراش نہ ہو تو صنم نہیں بنتا
قدم نہ ہو تو نشان قدم نہیں بنتا

مندرجہ بالا اشعار جوش ملیح آبادی کی نظم "سراغ راہرو" سے اُچکے گئے ہیں۔ دراصل یہ اشعار چیف جسٹس افتخار چودھری کا افتخار بلند کرنے کے لئے کہے گئے ہیں۔ شاعر نے چیف جسٹس کے لمبے لمبے جلوسوں کا ذکر کیا ہے جو 26 گھنٹے' 21 گھنٹے' اور پتہ نہیں کتنے کتنے گھنٹوں پر محیط ہوتے ہیں---- شاعر نے جوش میں قوم کو سمجھانا چاہا ہے کہ ان لمبے لمبے جلوسوں کے نشانات کو غور سے دیکھ لو جو قوم کی تقدیر بدل دیں گے---- دوسرے شعر میں شاعر یہی سمجھا رہا ہے کہ کچھ حاصل کرنے کے لئے' کچھ پانے کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جیسے بڑے بڑے جلسوں میں لاکھوں لیٹر پٹرول خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ کچھ ناعاقبت اندیش یہ بھی سمجھتے ہیں کہ محبوب بنانے والا نہ ہو تو محبوب نہیں بنتا جبکہ شعر نمبر دو کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر قانون بچانے والا نہ ہو تو پھر قانون نہیں بچتا۔

☆ اے طائر لاہوتی' اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو' پرواز میں کوتاہی

کہنے کو یہ شعر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے مگر دراصل یہ شعر راشی افسران کی دل کی آواز ہے۔ رزق سے اُن کی مراد سوکھی تنخواہ ہے جس میں گزر بسر کرممکن نہیں ہوتا ہے۔ جب تک اس رزق کی ہانڈی میں رشوت کا تڑکا نہ لگ جائے' کھانے والے کو سواد نہیں آتا سو وہ کہتا ہے کہ خالی تنخواہ پر زندہ رہنے سے مرجانا بہتر ہے وگرنہ بے پناہ رشوت ضروری ہے---- ہم نے بہت سے ایسے راشی لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ "یا اللہ! تو نے اتوار کا دن کیوں رکھ دیا ہے؟" اِس کی وجہ بھی سن لیں۔ مقصد یہ کہ اتوار کو چھٹی ہونے کی وجہ سے اُن کی ہزاروں کی "دھاڑی" ماری جاتی ہے۔ ویسے بھی راشی لوگوں کو رشوت نہ ملے تو اُن کی پرواز میں کوتاہی کیا' اُن سے چلا پھرا بھی نہیں جاتا---- راشی لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب تک قائداعظم (نوٹ) کا دیدار نہ کرلیں' اُن کی طبیعت بحال نہیں ہوتی۔ پس شاعر مشرق نے راشی لوگوں کے پرعظم ہونے پر مندرجہ بالا شعر ارشاد کیا تھا۔

☆ تو شریک سخن نہیں تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
بھری دُنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

بظاہر یہ اشعار ناصر کاظمی کے ہیں مگر دراصل یہ اشعار آج کل کی موبائل گرلز کے دِل کی آواز ہیں۔ موبائل گرلز کا سب سے بڑا مسئلہ موبائل فونز میں بیلنس کا ہوتا ہے۔ پہلا شعر وہ موبائل کو ہی مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ موبائل ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے' کال کر نہیں سکتیں کیونکہ بیلنس نہیں ہے۔ اسی لئے وہ موبائل کو سخن میں شامل نہیں کر سکتیں لیکن وہ پھر بھی پُرانے sms پڑھ کر دِل بہلا رہی ہیں---- دوسرا شعر بھی بیلنس کے حوالے سے ہے کیونکہ اب تک کسی دوست نے اس کے بار بار کے مطالبات کے باوجود بیلنس لوڈ نہیں کروا کر دیا۔ لہٰذا بے چاری کا بھری دُنیا میں جی نہیں لگ رہا۔ جانتے ہوئے بھی معصوم بن رہی ہیں کہ جانے کس چیز کی کمی ہے---- حاصل اشعار یہی ہے کہ موبائل گرلز کا کاروبار مندا ہو چکا ہے۔ اب اُن کو زیادہ محنت کرنا پڑے گی' اوور ٹائم لگانا پڑے گا۔ پھر بھی جب تک وہ موبائل کے سہارے جی رہی ہیں' ایسے اشعار تو دِل سے نکلتے ہی رہیں گے نا----

یاد کے بے نشان جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

☆ بازار بند' راستے سنسان' بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

یہ شعر بھی ناصر کاظمی نے اِسلام آباد کے سانحہ لال مسجد میں اُس وقت کہا جب وہ لال مسجد سے ملحقہ علاقے G6 میں کرفیو کی وجہ سے پھنس گئے تھے---- کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ لال مسجد والوں کی بجلی' گیس' پانی تو دانستہ بند کیا گیا تھا مگر ساتھ میں یہ افتاد G6 کے مکینوں کے لئے مفت میں گلے پڑ گئی۔ اُن لوگوں نے جو عذاب اِن دِنوں بھگتا' اُس کی مثال پیارے آزاد پاکستان میں پہلے بھی نہیں ملتی۔ ناصر کاظمی جی بھی وہیں پھنس گئے تھے اور عوام کو اِن حالات کا نظارہ پیش کرنے کے لئے مندرجہ بالا اشعار کہے---- حالاتِ حاضرہ سے لگتا ہے کہ اب اُن کے یہ اشعار اکثر و بیشتر دھرائے جائیں گے کیونکہ حالات انتہائی دگرگوں ہو چکے ہیں اور سکون عنقا ہو چکا ہے----

ناصر! بہت سی خواہشیں دِل میں ہیں بے قرار
لیکن کہاں سے لاؤں' وہ بے فکر زندگی

☆ یہ دُنیا کوئی پلٹا لینے والی ہے اب شاید
حیاتِ بے سکون کے سر میں یہ شوریدگی کب تھی

فراق گورکھپوری نے یہ شعر پاکستان میں آنے والے الیکشن کے حوالے سے کہا ہے۔ شاعر کو بھی ملک کے وہی حالات نظر آ رہے ہیں جو عام آدمی کو نظر آ رہے ہیں۔ سیلاب کی تباہ کاریاں' صدر صاحب کا دوبارہ انہی اسمبلیوں سے منتخب ہونا' چیف جسٹس لندن کی آل پارٹی

کانفرنس، لال مسجد، خودکش حملے، بجلی کا بحران، مہنگائی، بے روزگاری وغیرہ وغیرہ--- چونکہ حکومتی لوگ شاعر نہیں اس لئے اُن کو "سب اچھا ہے" ہی نظر آ رہا ہے جبکہ شاعر تو آنے والے بڑے طوفان (الیکشن) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگرچہ حیات پہلے ہی بے سکون تھی مگر اب شوریدگی بڑھ گئی ہے۔ خیال کیجئے، فراق صاحب فرما کیا رہے ہیں گویا زندگی پہلے ہی انتہائی بے سکون چل رہی تھی، تمام مسائل کی وجہ سے اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے۔ اُس پر الیکشن کیا ستم ڈھائے گا، اللہ اللہ---!

☆ کلرکوں سے آگے بھی افسر ہیں کتنے
جو بے انتہا صاحب غور بھی ہیں
ابھی چند میزوں سے گزری ہے فائل
"مقامات آہ و فغان اور بھی ہیں

ان اشعار کے شاعر جناب انور مسعود ہیں اور سرکاری فاتر کی زبوں حالی کی عکاسی کرنے کی کاوش کی ہے۔ جن کا واسطہ سرکاری دفاتر میں پڑتا ہے، وہ ان اشعار کا خوب مطلب سمجھتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ کو سرکاری دفتر میں کام پڑ جائے تو سب سے پہلے آپ کا واسطہ چپڑاسی سے پڑے گا۔ اگر آپ نے اُسے خوش نہ کیا تو وہ ہر بار ہزار بار یہی جواب دے گا کہ صاحب میٹنگ میں معروف ہیں۔ پھر کلرک بادشاہ کے آپ ہتھے چڑھ جائیں گے اور پھر سلسلہ شروع ہوگا ان افسران کا جن میں سیکشن افسر تو پیدا ہی رکاوٹیں ڈالنے کے لئے ہوا ہے---اس کے بعد فائل ڈپٹی سیکرٹری کے پاس اٹک جائے گی۔ پھر جوائنٹ سیکرٹری کے پاس غائب ہو جائے گی، عرصے بعد وہ سیکرٹری صاحب بہادر کے پاس پہنچے گی اور ایک اعتراض لگ کر واپس آ جائے گی اور پھر سے وہی چکر۔ پھر چپڑاسی، پھر کلرک--- بہرحال، جو سیانے ہوتے ہیں، وہ آغاز میں ہی اپنی فائل کو رشوت کے پہیے لگا دیتے ہیں اور پھر فائل خود ہی تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ پس شاعر کچھ اور تو نہیں کر سکتا، فقط بھڑاس نکال سکتا تھا سو نکال دی۔

☆ حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت، غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یوں تو غالب کی شادی بڑی کم عمری میں کر دی گئی تھی لیکن وہ عاشق نامراد بڑی مستقل مزاجی سے رہے۔ اس شعر کے ہونے کی وجہ ایک واقعہ ہے۔ وہ اپنی یکطرفہ محبوبہ کا اکثر پیچھا کیا کرتے رہے تھے۔ وہ برقعہ پوش لڑکی جان ہی نہ سکی کہ کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ بہرحال، ایک دن غالب نے ہمت کر کے ایک موتیے کا ہار اُس کو تھما دیا۔ لڑکی غصہ میں آ گئی۔ غالب بھاگنے لگے مگر لڑکی کا ہاتھ اُن کے گریبان تلک پہنچ چکا تھا--- کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ وہاں لڑکی کے بھائی بھی پہنچ گئے اور پھر وہ دُھنائی ہوئی کہ نہ پوچھیں۔ عظیم شاعر تھے، اس موقع پر برملا یہ شعر عرض کر دیا۔ سب کے ہاتھ رُک گئے اور اُن کو جب پتہ چلا کہ یہ تو مرزا ہیں تو بہت شرمسار ہوئے، لڑکی کی حالت تو دیدنی تھی۔ وہ خود کو کوس رہی تھی کہ اسے عظیم شاعر کی محبوبہ بننے کا گولڈن چانس اُس سے ضائع ہو گیا--- اُس نے غالب کو مرہم دی اور معذرت بھی کی، عین اسی موقعہ پر غالب نے دوسرا شعر کہہ ڈالا جو شہرہ آفاق ہے---

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

☆☆

قارئین کرام! اشعار کی تشریح ختم ہوئی لیکن چونکہ مزاج شاعرانہ بنا ہوا ہے تو آخر میں شاعری کے حوالے سے ایک یادگار بات آپ کی نظر کر رہے ہیں۔ ہمارے محبوب ترین شاعر غالب شراب کے رسیا تھے اور شراب پر ایسے ایسے اشعار کہتے کہ کیا کہنے۔ ایک بار اُنہوں نے ایک شعر کہہ دیا---

شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

اس شعر نے مسلمانوں میں بڑی ہلچل، بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ علماء مشائخ نے غالب کے خلاف فتویٰ دینا شروع کر دیے۔ اُنہیں بہت بُرا بھلا کہا گیا مگر اس شعر کا جواب کسی کو بجھ نہ آ رہا تھا کہ آخر اس کا کیا جواب دیا جائے--- حضرت مجدد الف ثانی نے کل ہند کے شاعروں کو للکارا کہ کوئی تو اس نابجار کو جواب دے۔ اب مسلمان عقیدے میں ہے کہ خدا ہر جگہ ہے۔ یوں غالب کے شعر میں سقم تلاش کرنا مشکل ہو چکا تھا۔ اُلٹ یہ ہوا کہ یہ شعر اپنے دور کا سب سے مقبول اور متنازعہ شعر بن گیا--- کوئی خدا کا بندہ سامنے نہ آیا جو غالب کو اس شعر کے حوالے سے جواب دے سکے۔ شاید یہ حضرت مجدد الف ثانی کی دُعا کا نتیجہ تھا کہ بہت عرصے بعد ایک شاعر بیدار ہوا جس نے غالب کے اُس شعر کا جواب دیا اور ایسا جواب دیا کہ رہتی دُنیا تک یاد رہے گا۔ ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں کہ اُس شاعر سے ہماری قریبی رشتہ داری ہے۔ اُس شاعر کا نام نامی جناب علامہ اقبالؒ ہے اور اُنہوں نے جو جواب دیا تھا وہ یہ ہے---

مسجد خدا کا گھر ہے، پینے کی جا نہیں
کافر کے دل میں پی وہاں پر خدا نہیں

☆☆

کانفرنس' لال مسجد' خود کش حملے' بجلی کا بحران' مہنگائی' بے روزگاری وغیرہ وغیرہ--- چونکہ حکومتی لوگ شاعر نہیں اِس لئے اُن کو "سب اچھا ہے" ہی نظر آ رہا ہے جبکہ شاعر تو آنے والے بڑے طوفان (الیکشن) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگرچہ حیات پہلے ہی بے سکون تھی مگر اب شوریدگی بڑھ گئی ہے۔ خیال کیجئے' فراق صاحب فرما کیا رہے ہیں گویا زندگی پہلے ہی انتہائی بے سکون چل رہی تھی' تمام مسائل کی وجہ سے اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے۔ اُس پر الیکشن کیا ستم ڈھائے گا' اللہ اللہ---!

☆ کلرکوں سے آگے بھی افسر ہیں کتنے
جو بے انتہا صاحب غور بھی ہیں
ابھی چند میزوں سے گزری ہے فائل"
"مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

اِن اشعار کے شاعر جناب انور مسعود ہیں اور سرکاری فاتر کی زبوں حالی کی عکاسی کرنے کی کاوش کی ہے۔ جن کا واسطہ سرکاری دفاتر میں پڑتا ہے' وہ اِن اشعار کا خوب مطلب سمجھتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ کو سرکاری دفتر میں کام پڑ جائے تو سب سے پہلے آپ کا واسطہ چپڑاسی سے پڑے گا۔ اگر آپ نے اُسے خوش نہ کیا تو وہ ہر بار ہزار بار یہی جواب دے گا کہ صاحب میٹنگ میں معروف ہیں۔ پھر کلرک بادشاہ کے آپ ہتھے چڑھ جائیں گے اور پھر سلسلہ شروع ہو گا اِن افسران کا جن میں سیکشن افسر تو پیدا ہی رکاوٹیں ڈالنے کے لئے ہوا ہے---اِس کے بعد فائل ڈپٹی سیکرٹری کے پاس اٹک جائے گی۔ پھر جوائنٹ سیکرٹری کے پاس غائب ہو جائے گی' عرصے بعد وہ سیکرٹری صاحب بہادر کے پاس پہنچے گی اور ایک اعتراض لگ کر واپس آ جائے گی اور پھر سے وہی چکر۔ پھر چپڑاسی' پھر کلرک--- بہرحال' جو سیانے ہوتے ہیں' وہ آغاز میں ہی اپنی فائل کو رشوت کے پہیے لگا دیتے ہیں اور پھر فائل خود ہی تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ پس شاعر کچھ اور تو نہیں کر سکتا' فقط بھڑاس نکال سکتا تھا سو نکال دی۔

☆ حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت' غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یوں تو غالب کی شادی بڑی کم عمری میں کر دی گئی تھی لیکن وہ عاشق نامراد بڑی مستقل مزاجی سے رہے۔ اس شعر کے ہونے کی وجہ ایک واقعہ ہے۔ وہ اپنی یکطرفہ محبوبہ کا اکثر پیچھا کیا کرتے رہے تھے۔ وہ برقعہ پوش لڑکی جان ہی نہ سکی کہ کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ بہرحال' ایک دن غالب نے ہمت کر کے ایک موتیے کا ہار اُس کو تھما دیا۔ لڑکی غصہ میں آ گئی۔ غالب بھاگنے لگے مگر لڑکی کا ہاتھ اُن کے گریبان تلک پہنچ چکا تھا--- کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ وہاں لڑکی کے بھائی بھی پہنچ گئے اور پھر وہ دُھنائی ہوئی کہ نہ پوچھیں۔ عظیم شاعر تھے' اس موقع پر برملا یہ شعر عرض کر دیا۔ سب کے ہاتھ رُک گئے اور اُن کو جب پتہ چلا کہ یہ تو مرزا ہیں تو بہت شرمسار ہوئے' لڑکی کی حالت تو دیدنی تھی۔ وہ خود کو کوس رہی تھی کہ اتنے عظیم شاعر کی محبوبہ بننے کا گولڈن چانس اُس سے ضائع ہو گیا--- اُس نے غالب کو مرہم دی اور معذرت بھی کی' عین اُسی موقعہ پر غالب نے دوسرا شعر کہہ ڈالا جو شہرہ آفاق ہے---

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

☆☆

قارئین کرام! اشعار کی تشریح ختم ہوئی لیکن چونکہ مزاج شاعرانہ بنا ہوا ہے تو آخر میں شاعری کے حوالے سے ایک یادگار بات آپ کی نظر کر رہے ہیں۔ ہمارے محبوب ترین شاعر غالب شراب کے رسیا تھے اور شراب پر ایسے ایسے اشعار کہتے کہ کیا کہنے۔ ایک بار اُنہوں نے ایک شعر کہہ دیا---

شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

اِس شعر نے مسلمانوں میں بڑی ہلچل' بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ علماء مشائخ نے غالب کے خلاف فتوے دینا شروع کر دیئے۔ اُنہیں بہت بُرا بھلا کہا گیا مگر اِس شعر کا جواب کسی کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ آخر اِس کا کیا جواب دیا جائے--- حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کل ہند کے شاعروں کو للکارا کہ کوئی تو اِس نابکار کو جواب دے۔ اب مسلمان عقیدے میں ہے کہ خدا ہر جگہ ہے۔ یوں غالب کے شعر میں سقم تلاش کرنا مشکل ہو چکا تھا۔ اُلٹا یہ ہوا کہ یہ شعر اپنے دور کا سب سے مقبول اور متنازعہ شعر بن گیا--- کوئی خدا کا بندہ سامنے نہ آیا جو غالب کو اِس شعر کے حوالے سے جواب دے سکے۔ شاید یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دُعا کا نتیجہ تھا کہ بہت عرصے بعد ایک شاعر بیدار ہوا جس نے غالب کے اُس شعر کا جواب دیا اور ایسا جواب دیا کہ رہتی دُنیا تک یاد رہے گا۔ ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں کہ اُس شاعر سے ہماری قریبی رشتہ داری ہے۔ اُس شاعر کا نام نامی جناب علامہ اقبالؒ ہے اور اُنہوں نے جو جواب دیا تھا وہ یہ ہے---

مسجد خدا کا گھر ہے' پینے کی جا نہیں
کافر کے دل میں پی وہاں پر خدا نہیں

☆☆

بکرے کی تلاش

☆ ظفر ندیم وہرہ

ابھی عید پر ہونے والے ہوشربا اخراجات سے پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بقرعید کی آمد کا شوروغل سنائی دینے لگا۔ یہ شوروغل اس وقت اور زیادہ اُونچا ہوگیا جب بیگم اور بچوں کی جانب سے ایک عدد بکرا لے کر آنے کا مطالبہ بار بار ہونے لگا۔ اس مطالبے کے حق میں صبح و شام قراردادیں پاس ہونے لگیں۔ ہم دفتر جانے کے لیے تیاریوں میں مصروف ہوتے تو بکرے کی گردان شروع ہو جاتی ناشتے کی میز پر جاتے تو وہاں بکرے کا ماڈل رکھا ہوا نظر آتا۔ کھانا تناول کرنے لگتے تو چپاتی پر بکرے کی تصویر ابھرتی نظر آتی۔ غرضیکہ بکرا ہمارے اعصاب پر بُری طرح سوار ہوگیا یا یوں کہہ لیجیے کہ زبردستی سوار کرا دیا گیا۔ اس وقت ہماری حالت اس سے زیادہ مختلف نہیں تھی کہ جسے اس کی محبوبہ نے ایسا تحفہ لانے کی فرمائش کی ہو کہ جس کا پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو اور وہ بیچارہ اس سوچ میں ہو کہ تحفے سے ہاتھ کھینچ لے یا محبوبہ کے عشق سے دستبردار ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں بکرا لے کر دینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے تو ہم یہ بات گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جب سے ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے ہر سال نہایت پابندی سے قربانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم نے کبھی اس فرض سے کوتاہی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ ہماری نظر میں ہر شادی شدہ شخص اوسطاً ہر ہفتے ایک قربانی دینے کے مرحلے سے گزرتا ہے جو کہ زیادہ تر بیگم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے لیکن سال میں ایک قربانی اسے اللہ کی خوشنودی کی خاطر بھی دینی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی مسلمان اس فرض سے چشم پوشی کا تصور نہیں کر سکتا‘ چاہے اسے کچھ دنوں کے لیے ہفتہ بچت کیوں نہ منانا پڑے۔

ہم نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے گھریلو اجلاس طلب کیا تاکہ اتفاق رائے سے کوئی ایسا منصوبہ تیار کیا جا سکے جو کہ عوام الناس کے لیے قابل قبول ہو اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ تھا کہ ابھی جب کہ بقرعید کے آنے میں ایک ماہ کا عرصہ باقی ہے‘ بکرا لے کر آنا ہاتھی لانے سے کسی طرح کم نہیں ہوگا کیونکہ اس عرصے کے لیے اس کے دانے پانی اور آرام و آسائش کی ذمہ داری سنبھالنا تیل کا کنواں کھودنے کے مترادف ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس دوران بکرے کا وزن برابر بڑھتا رہے گا مگر دوسری طرف ہمارا وزن یقیناً گھٹنا شروع ہو جائے گا۔ دوسری طرف حزب اختلاف کا موقف یہ تھا کہ ایک ماہ پہلے بکرا لانے سے نہ صرف یہ کہ زیادہ سستا ملے گا بلکہ محلے والوں پر رُعب ڈالنے میں بھی آسانی رہے گی اور یہ بکرا ان کی چھاتی پر مونگ اور دیگر دالیں دلتا رہے گا۔ ہم نے اپنا موقف منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ہمارا وہی حشر ہوا جو کہ ایک چھوٹے ملک کا سپر پاور کے سامنے ہوتا ہے۔ اس ناکامی کا گریڈ اس وقت اور اُونچا ہوگیا جب ہمیں بیگم بچوں کی طرف سے باضابطہ طور پر الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر دو دن کے اندر اندر بکرا نہ لایا گیا تو نہ صرف یہ کہ سب لوگ غیر معینہ مدت کے لیے بھوک ہڑتال کر دیں گے بلکہ "ڈیڈی نافرمانی" کی تحریک شروع کر دیں گے۔ چنانچہ صورت حال کی سنگینی اس بات کا تقاضہ کر رہی تھی کہ ہم چکنا گھڑا بن جائیں سو ہم انسان سے چکنا گھڑا بن گئے کیونکہ گھڑے کی زندگی بہرحال اتنی جلدی خطرے میں نہیں پڑتی۔

اس روز جمعہ کا دن تھا۔ ہم سبزی بیچنے والوں کی طرح صبح سویرے

نیند سے بیدار ہوئے وگرنہ عام دنوں میں ہم نو بجے سے پہلے بستر کی جان نہیں چھوڑتے تھے لیکن اِس وقت چونکہ ہماری جان پر بنی تھی اِس لیے ہمیں اپنے اصول کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑنا پڑا۔ اِس مرحلے پر ہم نے سب سے پہلے نماز فجر ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر یہ دُعا کی کہ وہ ہمیں اپنے اِس مشن میں کامیاب کرے۔ کامیابی کی صورت میں مزید دو نفل شکرانہ ادا کرنے کی قرارداد بھی پاس ہوئی۔ جب ہم بکرا منڈی جانے کے لیے روانہ ہونے لگے تو بیگم نے خلافِ معمول ہمیں چائے بسکٹ کی بجائے سیبوں سے ناشتہ کرایا تاکہ آنے والے لمحات میں ہمارے دِل کی دھڑکنیں نارمل رہیں۔ اِس کے ساتھ ہی کاغذی باداموں کی ایک تھیلی زبردستی ہماری پتلون کی جیب میں ٹھونس دی اور یہ ہدایت کردی کہ اگر کسی مرحلے پر ہم اپنا بلڈ پریشر بڑھتا ہوا محسوس کریں یا دِل کو

نمکین غزل

یہ آم جو کاٹا ہے تو کھا کیوں نہیں لیتے
گر میٹھا ہے یہ آم' اُٹھا کیوں نہیں لیتے

گرمی کا ہے موسم تو ہیں یہ آم ضروری
اس گرمی میں آموں کا مزہ کیوں نہیں لیتے

دانتوں کے بغیر آپ کا جینا ہے ادھورا
گر دانت یہ ٹوٹا ہے' دِکھا کیوں نہیں لیتے

آئے گی یہ پھر کام تمہارے ہی' اے بھائی!
کل کے لیے کچھ رقم بچا کیوں نہیں لیتے

بچے کے لیے نیند ضروری ہے بہت ہی
روتے ہوئے بچے کو سلا کیوں نہیں لیتے

گر درد بہت آپ کے ہے پیٹ میں' جاناں!
جا کر کسی قابل سے دوا کیوں نہیں لیتے

ماں باپ کی خدمت جو کرو گے تو ہے اچھا
ماں باپ کو خوش کر کے دُعا کیوں نہیں لیتے

مت تیز چلو دہر میں' آرام کرو کچھ
تم سانس زمانے میں ذرا کیوں نہیں لیتے

کیا نظم ریاضؔ آپ نے محنت سے بنائی
اس میں سے کوئی شعر سنا کیوں نہیں لیتے

✿ ریاض احمد قادری' فیصل آباد

بغاوت پر آمادہ ہوتے دیکھیں تو حسبِ ضرورت انہیں حلق سے نیچے اُتار لیں تاکہ ایمرجنسی وارڈ کی طرف جانے کی نوبت پیش نہ آئے۔ اِس تاریخی موقع پر دو بچے بھی ہمارے ساتھ ہو لیے تاکہ بکرا پسند کرنے میں اپنی ''ماہرانہ رائے'' دے سکیں۔

جب ہم بکرا منڈی کی حدود میں پہنچے تو اِس وقت وہاں کسی سیاسی جلسے کا سا سماں تھا۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ یہ سین دیکھ کر دِل خوش ہوا کہ لوگ ابھی تک سنت ابراہیمی نہیں بھولے ہیں۔ اِس ہجوم میں بچے بوڑھے جوان سبھی شامل تھے۔ بعض لوگ تو یوں بن سنور کر آئے تھے کہ جیسے بکرا منڈی کی بجائے سسرال جا رہے ہوں۔ لوگوں کا بے پناہ ہجوم دیکھ کر دِل بہت خوش ہوا کہ مسلمان چاہے نمازیں نہیں پڑھیں' روزے نہیں رکھیں مگر اِن میں قربانی دینے کا شوق اور جذبہ بہر حال موجود ہے۔ عام تعطیل ہونے کی وجہ سے رش کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گزر رہے تھے۔ دوسری جانب جانوروں کے مالکان گاہکوں کی کھالیں اُتارنے کے لیے پوری طرح چوکس تھے۔ وہ ہر آنے جانے والے آدمی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اِن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک موجود تھی جو کہ عام طور پر کبوتر پر حملہ کرنے سے پہلے شاہین کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ بکروں کے دلال بھی سادہ کپڑوں میں وہاں گھوم رہے تھے تاکہ سیدھے سادے لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنی جیب گرم کر سکیں۔ ہم نے سرسری طور پر جانوروں پر ایک نظر دوڑانا شروع کی تاکہ اپنی پسند کا جانور خرید سکیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی' جانور ہی جانور نظر آ رہے تھے۔ اِس وقت یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ جانور اکثریت میں ہیں یا انسانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کاش! اِس وقت ہمارے پاس اپوا کس طیارہ ہوتا تو ہم وقت ضائع کیے بغیر اپنی پسند کا بکرا ڈھونڈ نکالتے لیکن اِس کے باوجود ہماری نگاہیں ایک ایسے بکرے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئیں جو کہ ہمارے آئیڈیل سے قریب تر تھا۔

ہم نے پہلے تو اِس کا بھرپور جائزہ لیا۔ اِسے چاروں طرف سے یوں گھوم گھوم کر دیکھا کہ جیسے کوئی ماہر درزی سوٹ کی سلائی کے وقت ناپ لینے کی غرض سے جسم کا جائزہ لیتا ہے۔ کیمیائی تجزیہ مکمل کرنے کے بعد ہم نے ڈرتے ڈرتے قیمت دریافت کی بکرے کے مالک نے پہلے تو ہمیں سر سے پاؤں تک گھور کر یوں دیکھا کہ ہم نے شاید اِس کے بکرے کو بھی نہ دیکھا ہوگا۔ دراصل وہ ہماری جیب کا ایکسرے لینا چاہتا تھا کہ نوٹوں کا لیول کہاں تک ہے۔ اِس کے بعد اپنا منہ ہمارے کان کے پاس لا کر آہستہ سے بولا۔

اِن عورتوں کے عادات واطوار نے آج کل کے نوجوانوں کو حد سے زیادہ ہوشیار کردیا ہے ☺ پرنس کشمیری

''دس ہجاڑ (ہزار) روپے۔''

دس ہزار روپے کا بجٹ سن کر ہمارے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ ایک لمحہ کے لیے ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم قوتِ سماعت سے محروم ہوگئے ہیں یا ہونے کے قریب ہیں۔ ہم نے نارمل ہونے کے لیے سر کو دو چار جھٹکے دیے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم یا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ ہم نے دل ہی دل میں دُعا کی کہ اے خدا اِس بے رحم کے دل میں رحم ڈال دے۔ یہ آواز بلند اِس لیے نہیں کی کہ کہیں خدا کی بجائے دُشمن ہماری دُعا کو اِسے بددُعا میں تبدیل نہ کردے۔ ہم نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''کچھ خدا کا خوف کرو۔ میں سعودی عرب سے نہیں آیا ہوں' میری نظر میں یہ بکرا زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپے کا ہے۔''

ہمارا جواب سن کر اُس کا درجہ حرارت کافی بڑھ گیا۔ اِس موقع پر ہم نے برسات کی دُعا مانگی تا کہ درجہ حرارت کم کرنے میں مدد مل سکے مگر ہماری دُعا فائل ہوگئی۔ اُس نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں صبح صبح میرا اور اپنا موڈ خراب کر رہے ہو۔ پانچ ہزار روپے میں ایسا بکرا ملنا تو بہت دُور کی بات ہے' بکرے کا فوٹو بھی نہیں ملے گا۔ جاؤ کسی اور کا سر جا کر کھاؤ۔''

ہمیں اِس مردِ ناداں کے توہین آمیز رویے پر غصہ تو بہت آیا مگر ہم

روح آنیات (ہائیکو)

اِنقلاباتِ زمانہ

کتنی Change آگئی زمانے میں
پہلے ماں باپ ہمیں مارتے تھے
اَب بیویاں یہ کام کرتی ہیں

لوڈشیڈنگ

اِک منسٹر سے کہا لوگوں نے
لوڈشیڈنگ' یہاں ہوتی ہے بہت
وہ بولا' جا کے جنریٹر لے لو

بےگھر

مَیں نے Request کی' بے آسرا ہوں
اپنے دِل میں ذرا جگہ دے دو
بولی' دِل میرا کوارٹر تو نہیں

جہاز

مَیں بولا' تیرے عشق کا مارا ہوں
وہ بولی' مجھ پہ نہ احسان جتاؤ
تم تو پہلے سے ہی ''جہاز'' سے تھے

کچرا

اُس نے دروازے سے اشارہ کیا
مَیں اُس کے پاس گیا دِل لے کر
دے دیا کچرا کہ ذرا پھینک اِسے

نامرد

اپنے گاؤں کی لڑکیاں مجھ سے
جب بھی دیکھو نہیں پردہ کرتیں
حسیں بہت ہوں یا نامرد ہوں مَیں؟

زمین کے چاند

چھت پہ مصروف تھی کیٹی ہلال
ہم منتظر تھے' چاند دیکھیں گے
پر وہ زمیں کے چاند دیکھتے رہے

پسند

اِتنی دُنیا میں اِک پسند آئی
مگر رشتہ جو اپنا بھیج دیا
وہ پانچ بچوں کی اماں نکلی

بڑے میاں

اِک بڑے میاں نے دیکھی ''مست کڑی''
بولا' میری وہ بتیسی لاؤ
میرا جی چاہتا ہے' سیٹی ماروں

شہزادی

بیوی بولی' یہ شہزادی ہے کون؟
بولا شوہر' یہ میری گھوڑی ہے
بولی' فون آیا تھا کہ کلب آؤ

✿ روح' مردان موبائل:0300-5713018

یہ سوچ کر پی گئے کہ یہاں بکرا خریدنے آئے ہیں، جھگڑا مول لینے نہیں۔ ویسے بھی جنگلی (یہ جنگلی نہیں) لوگوں کو منہ لگانا اچھی بات نہیں ہوتی کیونکہ جوہڑ میں پتھر پھینکنے سے چھینٹے اپنے اوپر ہی آتے ہیں۔ ہم نے اُس مردِ نامعقول کے حق میں دُعائے خیر کی کہ خدا اس کو نیک ہدایت دے تاکہ اس کے طفیل کوئی اللہ کا بندہ قربانی کرنے کے لائق ہو سکے۔ اس دُعا کے ساتھ ہم آگے بڑھ گئے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

بکروں، مینڈھوں اور دُنبوں کا جنگل عبور کرنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک شخص جو کہ شکل وصورت سے سردار بجنڈرا نوالہ کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا، چار پانچ بکروں کی رسیاں تھامے بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ اُس نے جانوروں کی رسیاں یوں پکڑ رکھی تھیں کہ جیسے پتلیوں کا تماشہ دکھانے والے پتلیوں کے دھاگے کو پکڑ کر رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ شخص پہلی نظر میں سیدھا سادا اور قدرے شریف نظر آیا۔ ہم نے سوچا کہ یہ شخص صاحبِ ایمان دکھائی دیتا ہے، اس سے اپنا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمت کر کے آگے بڑھے اور کسی ماہرِ فن کی طرح بکرے کی پیٹھ اور سینہ ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"اس جانور کا کیا مانگ رہے ہو؟"

اُس نے یوں بے نیازی سے ہماری طرف دیکھا کہ جیسے کسی دوکاندار کے پاس آنے والا نواب دیکھتا ہے۔ اِس کے بعد بیڑی کا لمبا کش لیتے ہوئے بولا۔

"مانگنے کو تو بابو جی آٹھ ہزار روپے مانگ رہا ہوں مگر آپ سے سات ہزار ہوں گے۔"

اس مرحلے پر جی میں آیا کہ اس سے ذرا پوچھیں تو سہی کہ ہم پر اتنی کرم نوازی کیوں ہو رہی ہے کہ ایک ہزار کم مانگے جا رہے ہیں، جبکہ ہمارے اس سے کوئی رشتہ داری بھی نہیں ہے لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ بول بچن دینا تو اِن کا کام ہے۔ گاہک کے گلے پر عطر نہیں لگائیں گے تو وہ چھری کے نیچے کیسے آئے گا۔ چنانچہ ہم نے اُسے شیشے میں اُتارنے کی غرض سے کہا۔

"دیکھو بھائی! جو مناسب پیسے ہوں وہ لے لو۔ مَیں نہ تو کوئی رشوت خور افسر ہوں اور نہ ہی میرے پاس بلیک کی کمائی ہے، اس لیے ٹھیک ٹھیک بولو تاکہ تمہارا اور ہمارا سودا بن جائے۔"

اُس نے عجیب نظروں سے ہماری طرف دیکھا کہ جیسے ہم نے اس کے مکان پر دستی بم پھینک دیا ہو۔ اُسے شاید ہمارا لیکچر پسند نہیں آیا تھا۔ وہ مونچھوں اور مزاج پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

"اس سے کم ایک پیسہ بھی نہ ہوگا۔ سمجھ آئے تو لے لو ورنہ راستہ ناپو۔"

ہم حیران تھے کہ یہ بکرے بیچ رہا ہے یا باٹا کے جوتے کہ جہاں قیمت کم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اُس کا مطالبہ پورا کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا کیونکہ یہاں تو پورے مہینے کا بجٹ ہی اس سے کم تھا۔ ہاں البتہ کوئی عرب شیخ اس کا مطالبہ مان سکتا تھا۔

بکروں کے ہوشربا ریٹ سنتے سنتے ہماری طبیعت اچھی خاصی ڈرائی کلین ہو چکی تھی۔ اس مرحلے پر یہ اندازہ لگانا یقیناً مشکل نہیں تھا کہ جس بجٹ میں ہم بکرا خریدنے کے خواہشمند ہیں وہ بکرا یا تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا یا اُسے اس شہر میں داخل ہونے کا پرمٹ نہیں مل سکا ہے لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اُمید پر جہان قائم ہے۔ اگر انسان ہمت ہار بیٹھے تو پھر کام بگڑنے میں دیر نہیں لگتی ویسے بھی اَب گھر سے نیت باندھ کر چلے تھے کہ بکرا لے کر ہی گھر واپس آئیں گے۔ اَب خالی ہاتھ گھر واپس جانا توہینِ عدالت کے مترادف تھا۔ اس مقصد کے لیے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اڑوس پڑوس میں یہ خبر پھیلائی جا چکی تھی کہ ہم بکرا لینے کے مشن پر جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے اگر انسان خلوصِ نیت سے خدا کو بھی ڈھونڈے تو وہ بھی مل جاتا ہے۔ اس کہاوت کی سچائی کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم پیدل چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں پر ایک چارپائی کے اردگرد کچھ بکرے مزے لے لے کر گھاس کھانے میں مصروف تھے یہ سین دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ یہاں پر شاید بکروں کی گول میز کانفرنس ہو رہی ہے۔ یہاں پر کچھ لوگ پہلے ہی سے موجود تھے جو کہ اپنی پسند کا بکرا تلاش کرنے کے لیے ذہنی جمناسٹک میں مصروف تھے۔ ہم بھی اپنی پسند کا جانور تلاش کرنے کے لیے میدان میں آ گئے۔ ہماری نظریں ایک جانور پر ٹھہرتی تھیں تو فوراً دوسرے پر پھسل جاتی تھیں۔ ویسے بھی جہاں بہت ساری چیزیں جمع ہوں، وہاں انتخاب بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے دو باتیں تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ جانور نہ اِتنا بھاری ہو کہ ہماری سال بھر کی آمدنی کو ہڑپ کر جائے اور نہ ہی اِتنا کمزور ہو کہ اس کا دیدار کرنے کے لیے موٹے شیشوں کی عینک کا سہارا لینا پڑے۔ علاوہ ازیں بیگم نے ہمیں گھر سے الوداع کرتے وقت سختی سے یہ تاکید کر دی تھی کہ بکرا زیادہ سے زیادہ خوبصورت ہونا چاہیے کیونکہ آخر لوگ بکرے کا چہرہ ہی تو دیکھنا چاہتے ہیں۔ رنگ چاہے جیسا بھی ہو مگر کالا نہ ہو۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی مناسب ہونا چاہیے۔ وزن کم از کم اِتنا ضرور ہو کہ رشتہ داروں کی فوج کو سنبھال سکے۔ اچانک ہماری نظر

ایک ایسے بکرے پر پڑی کہ جس میں اگرچہ مطلوبہ خوبیاں موجود نہیں تھیں مگر کاروباری لحاظ سے مناسب نظر آرہا تھا یعنی شکل وصورت کا بھی گلفام تھا اور قد کا بھی غازی تھا۔

ہم نے اس تو اِن وِن بکرے کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا اور اپنے معیار سے قریب تر پانے کے بعد اِس کا ہدیہ دریافت کیا۔ ریوڑ کا مالک کہ جس کی ترچھی اور نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں' ہمارے کان کے قریب آکر بولا۔

"چھ ہزار روپے۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ ریٹ سن کر ہمارے دِل کو کافی تسلی ہوئی وگرنہ اَب تک ہم یہی سمجھتے چلے آرہے تھے کہ اِس وقت بکرا منڈی میں آٹھ دس ہزار سے کم کا کوئی جانور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ہم نے بکرے پر ایک اور بھرپور نگاہ ڈالی' ہمیں شک ہوا کہ شاید بکرے میں کوئی شرعی عیب ہو جس کے باعث مالک اِسے سستے داموں بیچ رہا ہو لیکن اچھی طرح جائزہ لینے کے باوجود ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جو کہ قربانی میں رکاوٹ کا سبب بن سکے۔ چنانچہ ہم نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو چاچا! اِس بکرے کے چھ ہزار روپے تو بہت زیادہ ہیں۔ میرے خیال ہے چار ہزار روپے مناسب رہیں گے۔ بولو منظور ہے؟"

"چار ہزار روپے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اِتنی رقم میں تو آپ کو بھیڑ بھی نہیں ملے گی۔ اگر واقعی لینے کا اِرادہ ہے تو مَیں پانچ سو روپے کم کرسکتا ہوں۔"

ہم نے سوچا کہ چلو کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ وگرنہ اَب تک ہمیں کوئی ایسا بیوپاری نظر نہیں آیا تھا جو کہ رقم کم کرنے پر رضاکارانہ طور پر آمادہ ہو جائے۔ ہم نے اُسے ہموار کرنے کے لیے پانچ سو روپے اور بڑھا دیئے۔ اِس نے کچھ دیر اپنے قانونی مشیر سے مشورہ کیا اور چپ چاپ بکرے کی رَسّی ہمارے ہاتھ میں پکڑا دی۔ یہ دیکھ کر بچوں نے مبارک سلامت کی صدائیں بلند کی اور کھلونا کلاشنکوف سے ہوائی فائرنگ کرکے اپنی خوشی کا اِظہار کیا۔ اِس موقع پر وہاں کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے ہمیں دِلی مبارکباد دی کہ ہم نے اوپلے سے خرگوش کو مار لیا ہے۔

بکرا خرید لینے کے بعد گویا ہم اِس مرحلے میں پہنچ چکے تھے۔ جس کا آسان الفاظ میں ترجمہ یہ تھا کہ اَب بکرے کو گھر لے جانے کے لیے کسی رکشے والے یا کوچوان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ظاہر ہے اسکوٹر پر جہاں پہلے ہی سواریاں فل تھیں' بکرے کو مزید بٹھا کر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اِس سلسلے میں ایک رکشہ ڈرائیور سے بات کی تو اُس نے اِتنا زیادہ کرایہ طلب کیا کہ ہمارا جی چاہا کہ بکرے کی رَسّی اُس کے ہاتھ میں پکڑا کر یہ کہیں کہ بھائی اِسے لے جاؤ۔ ہماری طرف سے قربان کرلینا۔ تانگے والے بھی اِس روز کافی اونچے اُڑ رہے تھے وہ سیدھے منہ بات کرنے پر تیار ہی نظر نہیں آتے تھے جبکہ عام دِنوں میں بھائی جان اور بابو جی کہہ کر بلاتے تھے۔ آخرکار بڑی مشکلوں سے ایک بڑے میاں کو شیشے میں اُتارنے بلکہ اِن سے زبردستی چچا کا رشتہ جوڑنے کے بعد بکرے کو تانگے میں بٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جبکہ ہم اسکوٹر پر سوار تانگے کے ساتھ ساتھ یوں چل رہے تھے کہ جیسے صدر کے ساتھ باڈی گارڈ دستہ چلتا ہے۔ جب ہم بکرے کو لے کر گھر میں داخل ہونے لگے تو اِس مرحلے پر اس نے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے سے صاف اِنکار کردیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم اُسے گھر لے جانے کی

ظفرانیات

کسی کو پٹایا تو پٹ جائے گا
نواں چن چڑھایا تو پٹ جائے گا
وہ دل کے مکاں میں ہیں پھیلے ہوئے
جو مانگا کرایہ تو پٹ جائے گا
شرافت کا ہرگز زمانہ نہیں
یہ بندر نچایا تو پٹ جائے گا
پریکٹس کرانے کی کرتے ہیں وہ
نشانے پہ آیا تو پٹ جائے گا
بکے جا یونہی جھوٹ سچ کی طرح
اگر ٹمٹمایا تو پٹ جائے گا
سہیلی جو بیگم کی آئی ہو گھر
میاں چھپایا تو پٹ جائے گا
جو کوثر کی تائی کی مانی نہیں
تو کوثر کا تایا تو پٹ جائے گا
نظامِ سیاسی سے ہر لوٹے کا
ہوا نہ صفایا تو پٹ جائے گا
سنانے لگا ہے کوئی حالِ دل
ظفر مسکرایا تو پٹ جائے گا

✿ نوید ظفر کیانی
nzkiani@gmail.com

بجائے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ ویسے بھی اس کی ساری عمر جنگلوں میں خاک نشینی میں گزری تھی۔ اب اس کے لیے سیڑھیاں چڑھنا ایسا ہی تھا کہ جیسے ایک عام آدمی کے لیے کے ٹو کی چوٹی پر چڑھنا ہوتا ہے۔ ایک گھنٹے کی کھینچا تانی اور انگریزی قوانین پر عمل کرنے کے بعد آخرکار ہم بکرے کو فلیٹ میں لے جانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

بکرا خرید لینے کے بعد ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اب ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب صرف بکرے کی قربانی ہو گی۔ یہ خیال تو ہمارے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ آخری رسومات ادا کرنے کے لیے ایک عدد قصاب کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بقرعید کے موقع پر قصاب کو ڈھونڈنا اور اس سے ٹائم لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اوّل تو یہ لوگ سگنل ہی نہیں دیتے ہیں اور اگر راضی ہو بھی جائیں تو بکرا کاٹنے کا معاوضہ اس قدر طلب کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے بکرے کی جگہ خود قربان ہو جائیں۔ ویسے بھی اکثر قصاب بقرعید کے موقع پر نقل مکانی کر کے بڑے شہروں میں چلے جاتے ہیں کیونکہ وہاں انہیں معاوضے کے طور پر زیادہ ڈالر ملتے ہیں اور اس طرح وہ اِن تین دنوں میں سال بھر کی روٹیاں کما لیتے ہیں۔ شہر میں لے دے کے ایسے لوگ رہ جاتے ہیں جو کہ برساتی مینڈک ہوتے ہیں یعنی بقرعید کے دنوں میں چھری ٹوکہ پکڑ کر قصاب بن جاتے ہیں حالانکہ اُنہیں چھری پکڑنے کا ”صحیح طریقہ“ بھی نہیں آتا۔ ہم نے اس سلسلے میں مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کیا تو اِن میں سے چند لوگوں نے ہاؤس فل ہونے کی وجہ سے معذوری کا اظہار کیا اور کچھ نے پارٹ ٹائم میں کام کرنا منظور کیا یعنی پہلے وہ دوسرے لوگوں کے بکرے کاٹیں گے اور فارغ ہونے کے بعد ہمارے ہاں تشریف کا ٹوکرا لائیں گے۔ حد یہ ہے کہ ہمارا وہ قصاب کہ جس کے ہم روزانہ کے گاہک تھے، وہ بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیرنے لگا ہم حیران تھے کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے۔ ظاہر ہے ہم خود تو بکرا نہیں کاٹ سکتے تھے۔ معاً ہمیں محلے کے دینی مدرسے کے مولانا یاد آ گئے۔ عام دنوں میں وہ لوگوں کو مرغیاں وغیرہ ذبح کر کے دیتے تھے۔ اب تک صدقے کے کئی بکرے کاٹ چکے تھے۔ باخبر ذرائع کے مطابق پاکستان آنے سے پہلے الور (انڈیا) میں گوشت کی باقاعدہ دکان لگایا کرتے تھے۔ ہم نے جب اس سلسلے میں اِن سے باضابطہ طور پر درخواست کی تو اُنہوں نے خوشی سے اِسے قبول کر لیا اور ہم سے یہ وعدہ کیا کہ وہ عید کی نماز ادا کرنے کے فوراً بعد سب سے پہلے ہمارا بکرا کاٹیں گے۔ ہم بہت خوش تھے کہ چلو اچھا ہوا قصاب کی فیس سے جان چھوٹ گئی۔ ویسے بھی یہ لوگ تکبیر وغیرہ صحیح طور پر نہیں پڑھتے ہیں بلکہ اُلٹا سیدھا کام دکھا کر بھاگ جاتے ہیں۔

عید کی نماز سے فارغ ہو کر ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ اچانک کال بیل نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا بمعہ اپنے دو ہٹے کٹے شاگردوں کے ہاتھوں میں چمکدار ہتھیار لیے کھڑے ہیں۔ اُنہوں نے آتے ہی بکرے کو حاضر کرنے کا حکم صادر فرمایا کیونکہ بقول ان کے قربانی کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ ہم نے اپنے گھریلو ملازم کو بکرا لانے کا اشارہ کیا اور اِن سے مسائل قربانی پر تبادلہ خیالات کرنے لگے۔ جونہی بکرا نمودار ہوا اُنہوں نے سر سے پاؤں تک اُس کا طبی معائنہ شروع کیا تاکہ فٹنس سرٹیفکیٹ جاری کیا جا سکے۔ پہلے تو اُنہوں نے چاروں کھروں کا بغور معائنہ کیا کہ مبادا کوئی کھر ٹوٹا ہوا ہو لیکن چاروں بوٹ بالکل صحیح سالم تھے اِس کے بعد اُنہوں نے جسمانی صحت کا جائزہ لیا کہ کہیں جانور ایڈز یا کسی اور بیماری میں مبتلا تو نہیں ہے۔ کانوں کا فضائی معائنہ کیا کہ کہیں کوئی کان کترا ہوا تو نہیں ہے۔ سب سے آخر میں اُنہوں نے بکرے کا منہ کھول کر دانتوں کا معائنہ کیا اور بکرے کے منہ میں سے کوئی چیز نکال کر مٹھی میں دبا لی۔ ہم سمجھے کہ شاید بکرے نے سونے کے دانت لگوا رکھے ہیں اور اُنہوں نے ایک آدھ دانت نکال کر مٹھی میں دبا لیا ہے۔ ہمیں اُن کی اِس حرکت پر سخت حیرانی ہوئی اور ہم دریائے حیرت میں غوطے کھانے لگے۔ اچھا ہوا کہ ہم تیرنا جانتے تھے ورنہ اِس روز آسمان پر فرشتے ہمارا پارسل وصول کر رہے ہوتے۔ اُنہوں نے ہمیں ایک طرف لے جا کر کہا۔

”معاف کرنا برخوردار! یہ بکرا قربانی کے لیے جائز نہیں ہے۔“

”قبلہ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔“ ہم نے مؤدب ہو کر پوچھا۔ ”آپ اِسے کون سی دفعہ کے تحت نااہل قرار دے رہے ہیں جبکہ بظاہر اِس میں کوئی شرعی عیب نہیں ہے۔“

”بہت بڑا عیب ہے بھائی! سنو گے تو پھڑک جاؤ گے۔ اِس کا ایک دانت بھی سلامت نہیں ہے۔“ اُنہوں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور اِس کے ساتھ ہی بند مٹھی کھول کر ہمارے سامنے کر دی۔ اِس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے لوڈ شیڈنگ شروع ہو گئی۔ زمین و آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دیے۔ اُن کی ہتھیلی پر پڑی ہوئی نقلی دانتوں کی بتیسی ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔ اِس وقت ہمیں اپنی غلطی کا بھرپور احساس ہوا کہ ہم نے بکرے کے دانت چیک کیے بغیر اِس کا سودا کیوں کر لیا تھا مگر اب غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔

☆☆

قربانی کے بکھیڑے

☆ نامعلوم

بکرا عید کے دنوں میں کسی بھی شخص کو جانور لے جاتے ہوئے دیکھ کر ہر راہ گیر اس کی قیمت پوچھنے کو اس طرح بے چین دکھائی دیتا ہے، جس طرح بیوی کی شاپنگ کی ہوئی چیزوں کی مالیت معلوم کرنے کے لئے شوہر بے چین رہتا ہے۔ ابھی ایک راہ گیر نے قیمت پوچھ کر اپنے پیٹ کے مروڑ میں افاقہ محسوس کیا نہیں کہ آہستہ آہستہ اور خریداروں کا اس کے اردگرد مجمع لگ گیا۔ ایک تو پاکستان میں لوگوں کے پاس ٹائم اس قدر فالتو ہے کہ اگر اسے ایکسپورٹ کیا جائے تو اربوں ڈالر زرمبادلہ پاکستان میں آسکتا ہے۔ بکرامنڈی چلے جایئے، خریداروں سے دس گنا زیادہ شوقین دیکھنے والے قیمت پوچھ کر اپنے ذہن میں قربانی کرنے والے کیڑوں کو غذا فراہم کرتے ہیں اور دل ہی دل میں جانور خرید کر اور قربانی کر کے خوش ہونے لگتے ہیں۔ محلے کا ایک آدمی جانور خریدنے نکلتا ہے تو اس کے ساتھ آٹھ دس تبصرہ نگار اور خریداری میں روڑے اٹکانے والے ضرور جاتے ہیں اور جب جانور خرید کر واپس آتے ہیں تو ہر آدمی جانور کی اس اس جگہ ہاتھ پھیرتا نظر آتا ہے جہاں کا گوشت اسے ملنے کی توقع ہوتی ہے---ایسا ہی مسئلہ محلے کے حامد کے ساتھ بھی تھا۔ وہ آٹھ دس آدمیوں کے ہمراہ جیسے ہی قربانی کے لئے گائے خرید کر لایا تو گھر کے باقی افراد جو کسی وجہ سے ساتھ نہ جا سکے تھے، وہ بھی جانور کے استقبال کے لئے یوں جمع ہو گئے جیسے بہنوئی اپنے سالیوں کے لئے فرش راہ نظر آتے ہیں۔ ایک صاحب لیٹرین سے فرار ہو کر شلوار سنبھالے ہی چلے آئے، ایک بچہ اپنی ماں کی گود سے قدرتی لباس میں جانور کو یوں تاڑنے نکل لیا جیسے جانور نہ ہوا فلمی ہیروئن ہو گی۔ ہر فرد کا بس ایک ہی سوال تھا کہ جانور کتنے کا لائے ہو؟

جو چالاک خریدار ہوتے ہیں، وہ بکرا منڈی سے روانہ ہونے سے قبل ہی اہل قافلہ کو ٹرینڈ کر دیتے ہیں کہ قیمت پوچھنے پر کیا بتانا ہے--- اور جو خریدار ذرا اونگا بونگا ہوتا ہے، وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ صحیح بتاؤں یا کچھ نمک مرچ لگا کر بتاؤں؟---مگر تمام امدادی خریداروں کو قیمت خرید معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی صحیح قیمت بتانے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ اب پوچھنے والوں کا جانور پر تبصرہ سننے اور سنانے کے قابل ہوتا ہے---ایک بڑے میاں نے منہ میں گلوری رکھ کر ہونٹوں کے ساحل سے پان کی پیک صاف کرتے ہوئے فرمایا۔

”ارے، میاں حامد میاں! کہاں پھنس گئے تھے؟---میاں! یہ سات ہزار میں کیا اٹھا لائے؟---بھئی، اس میں تو من بھر گوشت بھی نکل آئے تو قسم اللہ کی، مونچھیں منڈوا دوں گا۔“

حالانکہ ان کے ہونٹ اور ناک کے درمیان کی جگہ سے مونچھیں اسی طرح غائب تھیں جس طرح لڑکیوں کے سروں سے دوپٹے--- ایک ایکسرے نما نوجوان نے جانور کے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میاں حامد! مجھے تو یہ گابھن دکھائی دیتی ہے۔ دیکھ نہیں رہے، اس کا پیٹ بھنو دھوبن کی طرح یوں پھول رہا ہے۔“

تیسرے نے گائے کے خوبصورت ہونٹوں کے پٹ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”میاں! اس کے تو چار دانت ہیں۔ میں تو پہلے ہی کھٹک گیا تھا۔ آخر بیس سال شمو کو تاڑنے کے لئے بھینسوں کے باڑے میں جانا آنا رہا تھا۔ اس کا تو گوشت بھی چھینی ہتھوڑے سے توڑ کر کھانا پڑے گا۔“

برابر سے کلو پنساری نے اپنی تہبند کی گانٹھ کھولی اور دوبارہ مروڑی

دیتا ہوا گائے کے کان میں کچھ دیکھنے لگا۔

''ارے، میاں! کیا گائے کے کان میں اذان دے رہے ہو؟'' ایک عمر رسیدہ آواز آئی۔

''کبھی کلمہ پورا پڑھ کر مسلمان ہونے کا یقین تو دلایا نہیں، اذان کیا خاک دے گا؟'' ایک دل جلے نے پنساری کی مسلمانیت کو خطرے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہزار دفعہ کہا ہے کہ جب کسی بات کے بارے میں کچھ نہ جانے تو بولے مت--- میں آذان دے رہا ہوں، نہ کلمہ پڑھ رہا ہوں۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اللہ نہ کرے، کوئی کان ایلفی سے جڑا ہوا تو نہیں ہے؟--- میاں! بڑے بڑے فنکار پڑے ہوئے ہیں۔ قربانی جیسے مبارک کام میں بھی فراڈ کر رہے ہیں---'' وہ گائے کے کان کا ایکسرے کرتے ہوئے بولے۔ پھر ایک دم چیخے۔ ''ارے، ارے حامد میاں! ذرا یہاں تو آئیو، دیکھو یہ کان پر نشان کا ہے کا ہے؟--- یہ میرا چشمہ لے، اس کو لگا کر غور سے دیکھ---''

کلو پنساری نے اپنے ایک بازو سے معذور چشمے کو حامد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ حامد تپ گیا۔

''چاچا! میں تمہاری طرح نابینا نہیں ہوں۔ ان لائٹوں کو وہیں فٹ کرلو جہاں سے اتاری ہیں اور چلے جاؤ دوکان پر، شبراتی کی لونڈیا تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔''

کلو پنساری نے اپنی ہیڈ لائٹس ناک کے اسٹینڈ پر رکھتے ہوئے دیکھا اور یہ کہتا ہوا دوڑ لیا کہ آج تو وہ اکیلی آئی ہے۔ آج تو دل چیر کر ترازوں میں نہ رکھ دوں تو کلو پنساری میرا نام نہیں---!

''یار حامد! بھئی، جناور تو بڑے زور کا لایا ہے پر یار! اس کا رنگ مجھے آدھی آنکھ بھی نہ بھاوے ہے۔'' بھولا گائے کے آگے پانی کی بالٹی اور چارہ رکھتے ہوئے بولا۔

''بھولے بھائی! تو بھی تو مجبور ہے۔ اگر تیری دوسری آنکھ بھی سلامت ہوتی تو تیرے کو دونوں آنکھوں سے یہ رنگ ضرور اچھا لگتا مگر اس میں تیرا بھی کیا قصور؟ اس کمینے نتھو نے گلی بھی تو تیرے تاک کر ماری تھی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ تو اس کی بہن کو یہی آنکھ مارتا تھا۔'' حامد نے اپنی معلومات کی دھاک بٹھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ یار، حامد! تو پرانی یادیں تازہ نہ کر--- آنکھ جانے کا اتنا غم نہیں جتنا اس آفت کی شادی ہو جانے کا ہے۔ وہ میری دونوں آنکھیں لے لیتی یار، مگر شادی تو مجھ سے کرتی نا!'' بھولے نے بڑے غمزدہ لہجے میں حامد سے تائید چاہی۔

''ابے، تیری دونوں آنکھیں لے کر تجھ سے شادی کر کے تیرے کو کسی چوراہے پر بٹھا دیتی کیا ہے؟''

''تم بچھیا تو بڑی خوبصورت لائے ہو، میں ذرا اس کے سر پر ہاتھ پھیر لوں؟''

حامد کی بیوی کو ڈھال بنا کر اس کی بغل سے اپنا ہاتھ نکال کر گائے کے سر پر پھیرنے لگی اور بولی۔

''گلو کے ابا! یہ تو بڑی شریف ہے میری طرح--- چھیڑ چھاڑ برداشت کرلے ہے؟''

''ہاں تو ٹھیک کہے ہے، نیک بخت! جب تو نئی نئی آکر میرے کھونٹے سے بندھی تھی تو تو اسی طرح شریف تھی۔ جس طرح تو نے آہستہ آہستہ پر پرزے نکالے ہیں، اس طرح یہ بھی نکالے گی۔ ابھی تو یہ آئی ہے۔ ذرا دیر تیری صحبت میں رہے گی تو تیری طرح مرکھنی ہو جاوے گی۔''

یہ کہہ کر حامد نے گائے کے سر پر رکھے گورے گورے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا تو گلو کی ماں نے اپنا ہاتھ اس طرح ہٹایا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

''دیکھا، لگ گیا نا! کرنٹ---''

''ابے، کرنٹ کے سگے! اس کا ٹوٹا ہوا سینگ مجھ کو چبھا ہے۔'' وہ اپنی مادری زبان پر اتر آئی۔

''آ گئی نا! اپنی زبان پر--- اتنے سارے مجمع کے سامنے اپنا رنگ دکھاوے ہے۔''

''گلو کے ابا! میں کہوں ہوں کہ اس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہے۔ جاہل ہوں تو کیا ہوا، اتنا تو جانوں ہوں کہ ٹوٹے ہوئے سینگ کے جناور کی قربانی نہ ہووے ہے۔ اللہ بخشے، تمہارے ابا پچھلے سال جو گلی سے بکرا پکڑ کے لے آئے تھے، اس کا بھی سینگ ٹوٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کو قصائی کے ہاتھ بیچ کر پیسے کھرے کر لئے تھے جبھی تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ ٹوٹا پھوٹا جناور قربانی کے قابل نہ ہووے ہے۔''

ارے، کیا کہہ رہی ہے بھاگوان! کیوں میرا ہارٹ فیل کرانے والی باتیں کرے ہے؟--- ارے، میں کیا یہ اتنے سارے لونڈے سب اچھی طرح دیکھ کر لائے تھے۔ بالکل فارم کے انڈے کی طرح منے منے خوبصورت سے سینگ تھے اس کے۔''

''ابا! ایک فارم کا انڈا تو یہ پڑا ہے۔''

گلو نے زمین پر سے ایک انڈا اٹھا کر دیا جس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ حامد وہ انڈا گلو سے لے کر اپنی ہیڈ لائٹس کے قریب لایا اور فوراً دوسرے سینگ سے جڑے انڈے کو بھی ذرا سا زور لگانے سے اٹھا لیا اور

پھر "میں لٹ گیا --- برباد ہو گیا" کے شور کی وجہ سے چھٹتا ہوا مجمع دوبارہ جوبن پر آ گیا۔ دونوں فارم کے مٹی بھرے انڈے دیکھتے ہی دیکھتے حامد اور اس کی گائے سے زیادہ مشہور ہو گئے۔ مجمعے میں شامل ہر فرد گائے کے سر میں اگے ہوئے سینگ کے "ٹوٹے" پر ہاتھ پھیرنے کے شوق میں جو یلغار ہوئی تو گائے نے گھبرا کر جو زرا زور لگایا تو رسی توڑ کر ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ مجمع اس طرح بیچ میں سے دو حصوں میں بٹ گیا جیسے سڑک پر پڑے گوبر کے ڈھیر کے درمیان میں سے سائیکل کا پہیہ گزر جاتا ہے۔ اب آگے آگے گائے اور پیچھے اللہ جھوٹ نہ بلوائے محلے کے سارے جوان بوڑھے بچے!

کئی قسموں اور کئی ڈیزائن کے جوان اور بوڑھوں کے ساتھ حامد سوزوکی کا کرایہ بچا کر جب گائے کے پیچھے پیچھے بکرا منڈی پہنچا تو گائے اپنے پالنے والے کو اور حامد اینڈ کمپنی گائے اور گائے والے دونوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ گائے آخر کار وہاں جا کر کھڑی ہو گئی کہ جہاں سے اس کی رخصتی ہوئی تھی مگر وہاں رخصتی کرنے والا باپ تھا کہ جو ساٹھ ہزار کی سال بھر کی جمع پونجی لے اڑا تھا اور یہ ہی بات حامد کو پاگل بنائے جا رہی تھی۔ ایک مچھو جو شکل سے ہی قصائی لگ رہا تھا اور غالباً گائے کے مالک نے ہی اس کو یہاں چھوڑا ہوا تھا، حسب توقع وہ مونچھوں کے سروں کو نوکیلی بناتے ہوئے گویا ہوا۔

"کیا پریشانی ہے، بھائی! میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

"تمہاری طرح کا دوسرا مچھو تھا، اس کو کہاں بھگا دیا؟" حامد نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔

"او، بھائی! پرے ہٹ --- کون سے مچھو کو پوچھے ہے؟"

"وہی جس سے میں ابھی دو گھنٹے پہلے یہ گائے لے کر گیا تھا۔ اس کمینے نے مجھے یہ سینگ ٹوٹی گائے دے کر ساٹھ ہزار ٹھگ لئے ہیں۔" حامد نے گائے کے سر کو پکڑ کر اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ساٹھ ہزار ٹھگ لئے؟ --- مگر، بھائی جی! یہ تو اس سے آدھے کی بھی نہیں ہے کہ جتنے کی تو بتا رہا ہے --- رسید ہے تیرے پاس ساٹھ ہزار کی؟"

"ہے، کیوں نہیں --- یہ دیکھو ---" حامد نے جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر اس کے آگے کر دیا۔

"یہ رسید ہے؟ --- ارے، بھائی! یہ تو کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ اس پر نہ نام ہے، نہ ٹکٹ لگا ہے۔ صرف زیرو زیرو لکھا ہوا ہے۔ میں تو جاہل ہوں، پڑھنا نہ آوے۔ ذرا تم ہی پڑھ کر بتاؤ کیا نام ہے بیچنے والے کا اور خریدنے والے کا؟"

"نام تو اس پر نہیں ہے ---؟" حامد نے کاغذ کو مایوسی سے دیکھ کر کہا۔

"تو پھر، بھائی میرے! کس کے سر مارے گا اس کو ---؟"

قصائی نے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا۔ حامد کی طرح گائے بھی اپنے رخصت کرنے والے کو نہ پا کر اداس کھڑی تھی۔ شاید یہ سوچ کر میں اپنے بابل پر بوجھ بنی ہوئی تھی جو یوں رخصت کرتے ہی بھاگ لیا۔

"حامد میاں! مجھے دکھ ہے کہ اب تو اس کا گوشت کسی قصائی کی دوکان پر ہی بکے گا ---"

ایک بزرگ نے حامد کے کان تا پھوسی کی۔

"میاں! اب تو اس کا یہی حل ہے جو مچھو کہہ رہا ہے۔ بس اس سے سودا طے کر لو۔ مجھے تو یہ بھی اس کا ساتھی لگے ہے جبھی تو خریدار بن کے پہلے ہی سے انتظار کر رہا تھا۔"

"بول بھئی، کیا مانگے ہے ان ہڈیوں کا ---؟"

قصائی نہایت حقارت سے ساٹھ ہزار کی گائے کی طرف دیکھ کر حامد سے بولا۔

"یہ ہڈیاں ہیں ---؟"

حامد نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ حامد قصائی کے ہاتھوں تکہ بوٹی میں تبدیل ہو جاتا، سب پڑوسیوں نے مل کر حامد کو ایک طرف کر دیا۔ ان ہی میں سے ایک نوجوان جو حامد سے پہلے حامد کی بیوی کا دعوی دار تھا، آگے بڑھا اور بولا۔

"تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ گائے ساٹھ ہزار کی خریدی ہے اور یہ اسی طرح حقیقت ہے جس طرح یہ حقیقت ہے کہ تو خود قصائی ہے اور اس کا بھیجا ہوا ہے جس نے یہ فراڈ کیا ہے۔ اب تو ذرا غریب کی حالت دیکھ جو سارے سال کی جمع پونجی گنوا بیٹھا ہے --- بول، تو نے کیا دینا ہے اس کا؟" نوجوان نے دو ٹوک بات کی۔

"دیکھ، بھائی جوان! میں نے قربانی تو کرنی نہیں ہے، میں نے تو سری پر چھری رکھ کر بیچ دینا ہے۔ اس لحاظ سے بیس ہزار سے زیادہ کی نہیں ہے۔" مچھو نے اپنی آفر پیش کی اور سگریٹ کے سوٹے لگانے لگا۔

"گوشت بیچتے ہو ساڑھے چار سو روپے کلو اور اس پانچ من کی گائے کے صرف بیس ہزار؟"

"او، میاں! کس خوش فہمی میں ہے؟ ہڈیاں نکال کر ایک من سے زیادہ گوشت ہو تو قسم اللہ پاک کی یہ مونچھیں --- مگر چھوڑ، میری مونچھ کا تو ایک بال بھی اس پر بھاری ہے۔ چل، پھر ایسا کر، تول کے حساب سے دام لگا دیتا ہوں۔ چار سو روپے کلو کے حساب سے اس کی قیمت زیادہ نہ بنتی

ہے۔ بول ادھر یا اُدھر---؟"

"حرام کا مال ہے کیا؟---چلو، واپس اپنے محلے کے قصائی شرفو سے بات کریں گے۔"

یہ کہہ کر جو حامد مجمع کی طرف پلٹا تو کوئی بھی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ سب اجنبی چہرے تھے جن کا تعلق اسی فراڈ سے تھا۔ بس وہ تو جوان رہ گیا تھا جو حامد کا ازلی دشمن تھا۔ وہ خود حیرت میں تھا کہ یہ میرے ساتھ یہاں تک آ بھی گیا اور میرے حق میں بول بھی رہا ہے مگر اس وقت اس کو یہ ولن اپنا سب سے بڑا ہمدرد لگ رہا تھا۔ اب اس مصیبت کو اس کی مدد کے ذریعے ہی ٹھکانے لگانا تھا۔ وہ پچھلے سارے اختلافات بھلا کر بولا۔

"یار اسلم! یہ سارے کے سارے محلے والے کیا ہوا میں اڑ گئے یا جن کھا گیا؟"

"حامد بھائی! لوگ سکھ کے ساتھی ہیں، دکھ میں کب کسی کے ساتھ دیا ہے؟---مگر دیکھ لے تیری مصیبت میں میں ہی کام آیا ہوں، جس کو تو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے---حامد بھائی! شاداں اب تیری بیوی ہے اور میری بھابی ہے۔ میرا دل تو اسی دن صاف ہو گیا تھا جس دن شاداں کا نکاح تیرے ساتھ ہوا تھا مگر اس کلو پنساری نے تیرے کو میرے خلاف بھڑکایا تھا اور تجھ کو کیا معلوم کہ شاداں بھابی جب اس کی دکان پر جاوے تھی تو وہ کھوسٹ مختلف بہانوں سے گھنٹوں اس کو کھڑا رکھے تھا اور میں دور سے ہی بھابی شاداں کی چوکیداری کرتا رہتا تھا۔"

"یار اسلم! اب تو اس کو سوزوکی پر سوار کرا، میں تو مصیبت میں پھنس گیا---چل یار، ذرا ہاتھ لگا۔"

پھر دونوں رقیبوں نے کافی زور لگایا مگر گائے جیسے اپنے میکے سے جانے پر تیار ہی نہ تھی۔ دونوں کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی تھیں اور ہوتیں بھی کیسے؟ اسلم گائے کو یہاں سے جانے ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ آخر اسلم بولا۔

"حامد بھائی! میرے خیال میں اس سے یہیں چھٹکارا حاصل کرلو۔ محلے میں جا کر خواہ مخواہ لوگ جمع ہوں گے اور سب تم کو بیوقوف کہیں گے، بچہ بچہ مذاق بنائے گا کہ اتنے ہوشیار ہو کر بیوقوف بن گئے---ایسا کرو کہ قصائی نے بیس ہزار لگائے ہیں۔ تمہارا پہلے ہی کافی نقصان ہو گیا ہے، پھر تم نے آخر قربانی بھی تو کرنی ہے۔ میں تم کو تیس ہزار روپے دے دیتا ہوں۔ تم اس کا بکرا خرید کر قربانی کرو، شاداں بھابی اور گلو پریشان ہو نگے۔ آؤ، تم کو بکرے کا سودا کرادوں۔"

حامد کو نیم رضامند دیکھ کر ساتھ لیا اور آٹھ دس بکرے دکھا کر ایک خوب تندرست بکرا اٹھائیس ہزار میں دلا کر رکشہ میں بٹھایا اور باقی کے دو سو روپے اس کے ہاتھ پر نہایت ایمانداری سے رکھ دیے۔

حامد بولا۔ "اسلم بھائی! مجھے معاف کر دینا، تم نے میرا بڑا ساتھ دیا۔"

"ارے، حامد بھائی! کوئی بات نہیں۔ تم گھر جاؤ، سب انتظار میں ہونگے۔"

پھر اسلم نے واپس جا کر بکرے والے سے دو سو پچاس روپے کمیشن کے وصول کیے، پھر گائے کے پاس آیا تو وہاں قصائی اس کو گھورتا ہوا بولا۔

"کیوں بے، اسلم! یہ کیا حرکت کی تو نے؟---بیس ہزار میں اس کا باپ بھی دیتا، تو نے خواہ مخواہ دس ہزار گلا دیے۔"

اسلم نے اس کو آنکھ ماری اور بولا۔

"ابے، سمجھا کر۔ میں نے دس ہزار روپے میں اس کا اعتماد خرید لیا ہے۔ اس سالے نے میری شاداں کو مجھ سے چھینا ہے، اب میں اپنی شاداں بھی واپس لوں گا اور ادھر آ دیکھ، اس نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکال کر گائے کے دونوں سینگوں پر لگے پلاسٹر آف پیرس کو کھرچ دیا ہے۔ اب قدرتی سینگوں سے گول سرے صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ ساری کارروائی دو دانتوں کے خولوں میں مٹی بھری اس پلاسٹر آف پیرس لگے سینگوں پر جمانے کی صفائی کی ہے۔ جو میں نے اپنے ایک کارندے سے کرائی تھی۔"

"یار! میں خاندانی قصائی ہوں، تو نے تو مجھ کو بھی شرمندہ کر دیا۔ تو نے تو ہزاروں کما لئے مگر میرا حصہ---؟"

"جتنا تو نے کام کیا ہے، یہ لے اتنا ہی تیرا یہ حصہ ہے۔ تو نے صرف دام لگائے تھے۔" اسلم نے اس کو پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔ "اب تو چلتا پھرتا نظر آ---"

حامد جب بکرا لے کر رکشہ سے اترا تو پھر وہ سب لوگ جمع ہو گئے جو اس کو منڈی میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ مجمع میں سے ایک آواز آئی۔

"ارے، حامد بھائی! یہ گائے بھاگتے بھاگتے گھس کر بکرا بن گئی؟---مگر تم تو اتنے کے اتنے ہی ہو حالانکہ تم بھی اتنا ہی بھاگے ہو جتنا کہ گائے بھاگی تھی، یہ کیا معاملہ ہے؟"

حامد نے کہنے والے کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور مجمع کو چیرتا ہوا بکرے کا کان پکڑ کر دروازے پر اپنے انتظار میں سوکھتی ہوئی شاداں اور گلو کو دھکا دیتے ہوئے اندر گھس گیا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ باہر کھڑے سارے مجمعے کی زبانوں پر سینکڑوں سوال ان کے منہ میں ہی دم

توڑ گئے۔ حامد کے غصے سے سرخ سراپے کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ دروازے پر دستک دے کر بکرے کو تبصروں کیلئے باہر نکلوائے۔ اندر شاداں ایک کونے میں گلو کو دبائے کھڑی تھی، اس نے حامد کو پچھلے تین سالوں میں اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''گائے سے بکرے پر کیسے آ گئے؟''

''جس طرح تو حامد پر آ گئی تھی۔''

اس نے شاداں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور الگنی پر پڑی شاداں کی شلوار سے ناڑا کھینچ کر بکرے کی گردن میں باندھ کر دروازے کے پاس لگے درخت سے باندھ دیا۔ بکرا چاروں طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے لانے والے کی حالت پر افسوس کر رہا ہو۔

''یہ اسلم لکھ پتی گائے اور بکرے کے درمیان کہاں سے آ گیا---؟'' شاداں بھی اپنے اصلی رنگ میں آنے لگی۔ پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''اگر ''لکھ پتی'' سے عشق لڑاتی تو تجھ کنگلے کے ہاں فاقے کرنے کیوں آتی؟ سارے سال پیسہ پیسہ جوڑ کر تجھ کو ساٹھ ہزار روپے دیئے اور تو ہمیشہ کی طرح بیوقوف بن کر یہ جانور لایا ہے سٹھ ہزار میں اور پھر ''لکھ پتی'' کا طعنہ مارے ہے؟--- تین سال ہو گئے اس جہنم میں، میں نے بھلا تیرے سے کوئی شکایت کی ہے، کبھی نام لیا ہے اس لکھ پتی کا---؟'' شاداں ایک دم پھٹ پڑی۔

''بس، بس--- میرے دوست کو گالی نہ بک ورنہ میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔''

حامد کو یوں اپنے دشمن کی حمایت کرتے دیکھا تو وہ سمجھی کہ گائے کے بھاگ جانے کے غم میں یہ پاگل ہو گیا ہے۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہی تھی، دور سے ہی بولی۔

''گائے والے نے تیرے ساتھ دھوکہ کر دیا تو اس میں تیرا کیا قصور ہے تو کیوں اپنے دماغ پر اثر لے رہا ہے--- کیا ہوا تیرے دماغ کو؟''

''میں پاگل نہیں ہوں، آج اسلم نے ہی میرا ساتھ دیا ہے ورنہ اس بکرے اور گائے دونوں سے ہاتھ دھو لیتا۔''

''لے، میں تو مذاق سمجھ رہی تھی، یہ تو واقعی پاگل ہو گیا ہے--- اسلم! پانی اور یہ آگ، بھلا ان دونوں کا کیا ساتھ---؟'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''ہوش کرو، گلو کے ابا! میرا بھائی منگو گاؤں سے آیا ہوا ہے، وہ تیرے کو دیکھنے منڈی گیا ہے۔ تیرے دوڑ لگانے کے فوراً بعد آ گیا تھا، تین گھنٹے ہو گئے اسے گئے ہوئے۔''

گلو بھاگتا ہوا گھر میں آیا۔ ''ابا--- ابا! ماما گائے لایا ہے، بالکل ویسی ہے جیسی بھاگ گئی تھی۔''

''کیا؟--- گائے لایا ہے--- منگو---؟''

یہ کہہ کر حامد نے دروازے کی جھری سے جھانکا تو منگو سوزوکی سے گائے اتار رہا تھا۔ وہ جانے پہچانے رنگ کی گائے دیکھ کر دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اتنی دیر میں جمع ہونے کا عادی مجمع پھر جمع ہو گیا۔ حامد باہر آ کر گائے کا طواف کرنے لگا۔ جب حامد گائے کے گرد سات چکر پورے کر چکا تو وہ حیران و پریشان کھڑے منگو سے بولا۔

''کتنے کی لایا یہ---؟''

''بھائی جی! نہ سلام نہ دعا، کتنے کی لایا یہ---؟'' منگو حامد سے

جا رہے ہیں

ہمارے دل کو ''سماڑے'' جا رہے ہیں
وہ ہم کو کیوں لتاڑے جا رہے ہیں
''تمہارا باپ نائی پنڈ میں تھا''
گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں
لنگوٹی رہ گئی اپنے بدن پر
یہ لگتا ہے، اکھاڑے جا رہے ہیں
اسمبلی ہی گئے ہیں شیخ چھنجو
اکڑ کر، اور آڑے جا رہے ہیں
جہاں راتوں کو جاتے شرم آئے
وہاں ہم دن دہاڑے جا رہے ہیں
ارے، کیا ریل کے انجن ہیں یہ بھی
جو لوہے کے کباڑے جا رہے ہیں
وہیں سے ثانیہ لائیں گے سارے
''دکن'' کیوں یہ لاڑے جا رہے ہیں
وہ گل چیں پاسباں ہیں گلستاں کے
چمن کو جو اجاڑے جا رہے ہیں

پروفیسر ظریف خان، کراچی
0321-2125603

بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''تو بتا، بھائی! کتنے کی ہو گی؟---اور میں تو تیرے کو سارے راستے اور منڈی میں بھی تلاش کرتا رہا، گائے کا کیا ہوا؟''

حامد منکو کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''ساٹھ ہزار کی لایا ہے؟''

''ایک ہزار سے مار کھا گیا، بھائی جی! پورے نوے ہزار کی لایا ہوں چار من گوشت ہے اس میں۔ پچانویں ہزار مانگتے تھے، بڑی مشکل سے نوے پر راضی ہوا۔''

''بھائی! یہ تو وہی گائے ہے جو تیرا بہنوئی لایا تھا اور وہ بھاگ گئی تھی۔''

شاداں اپنے بھائی کو حقیقت بتا کر شرمندہ کرنے کا سامان کرنے لگی۔ حامد گائے کے سر پر کچھ ٹٹول رہا تھا مگر وہاں جو وہ ڈھونڈ رہا تھا، وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں سینگ گول حالت میں موجود تھے۔ وہ شک وشبے کی حالت میں پھر گائے کا طواف کرنے لگا۔ مجمع میں، میں سے آوازیں آرہی تھیں۔

''یہ تو وہی گائے ہے جو بھاگ گئی تھی۔''

کوئی کہہ رہا تھا۔ ''یہ وہی گائے ہے جس کے سینگ ٹوٹے ہوئے تھے۔''

''کیوں، بھائی حامد!'' ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف'' کے مصداق ہمیشہ بہنوئی کو ہی لٹتے دیکھا ہے مگر یار، تو نے تو وہ کام کر دکھایا جو کوئی بہنوئی بھی انجام نہیں دے سکا۔ یار، تو نے سالے کو ہی لوٹ لیا۔ سینگ ٹوٹی گائے تو نے ساٹھ کی لا کر نوے ہزار کی اپنے سالے ہی کو پیل دی؟''

دودھ والے امام دین نے سالے بہنوئی کے درمیان جنگ کرانے میں ''عید'' منانے کا پروگرام بنا ڈالا۔

''او، امام دینا! تو کیوں ہمارے درمیان ایسی باتیں کر کے جھگڑا کرانے کی سوچ رہا ہے؟---میں ابھی اس کو ایک قصائی کے لئے اسلم کے ہاتھ تیس ہزار کی بیچ کر آیا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ قربانی کے لائق نہیں ہے، قصائی کے قابل ہے اور قصائی نے تو بیس ہزار لگائے تھے۔ اسلم نے مجھے تیس ہزار روپے دے کر یہ بکرا اٹھائیس ہزار کا دلا کر دو ہزار روپے بھی واپس کر دیئے تھے۔''

''یہ اسلم کون ہے---؟'' منکو نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اسلم اس بے وقوف کا ایک نمبر کا رقیب ہے اور اس جاہل نے اس پر اعتبار کر لیا؟ بڑا فراڈیا ہے۔ دیکھ، وہ آرہا ہے اسلم---تم خود ہی معلوم کر لو۔''

امام دین نے منکو کا رخ آتے ہوئے اسلم کی طرف موڑ دیا جو گلے میں پڑے لال رومال کے دونوں کونے پکڑے بڑے ٹور سے آرہا تھا۔ منکو نے مڑ کر دیکھا تو پہچان گیا کہ اس سے ہی تو یہ گائے لایا ہوں۔ اسلم مجمع کو دیکھ کر سیدھا چلا آیا۔ قریب آنے پر اس نے اپنی فروخت کردہ گائے کو مجمع کے درمیان دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا اور سوچنے لگا کہ یہ یہاں کیسے آگئی۔ فوراً اسلم کی نظر منکو پر پڑی، وہ سٹ پٹا کر رہ گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ حامد نے اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''کیوں بے، فراڈیئے! تو نے مجھ سے تیس ہزار کی گائے لے کر میرے سالے کو نوے ہزار میں بیچ دی---ایک گھنٹے میں ساٹھ ہزار کما لئے، وہ بھی سینگ ٹوٹی ہوئی گائے کے---؟''

''او، میاں! گریبان چھوڑ اور دور ہٹ کر بات کر---''

اسلم نے ایک ہی دھکے میں حامد کو دور کر دیا اور بولا۔

''ابے، جب تک بیوقوف زندہ ہیں، عقل مند کھاتے ہی رہیں گے۔ گائے کے سینگ بالکل ٹھیک اور پیدائشی ہیں۔ دیکھ لے ہاتھ لگا کر، قربانی کرنے کی سند ہے اس کے پاس۔ رہی ساٹھ ہزار کمانے والی بات؟ تو یہ تو کاروبار ہے۔ تو نے بے کار سمجھ کر بیچ دی، ان صاحب نے کارآمد دیکھ کر خرید لی اور پھر مجھے کیا معلوم کہ یہ تیرا سالہ ہے۔ اس نے گلے میں ''حامد کا سالہ'' کی تختی ہوتی تو میں کوئی پاگل تھا جو تجھ سے خرید کر تیرے سالے کو بیچ دیتا؟---شاداں کے عشق کے سیزن میں تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا حالانکہ باپ بھائی دیکھ کر عشق کیا جاتا ہے۔''

''یہ میرے پیچھے گاؤں سے آگیا تھا اور گائے بھاگ جانے کی خبر سن کر میرے پیچھے منڈی چلا گیا۔ میں بکرا لے کر آگیا اور یہ گائے لے کر آگیا، بہن کی محبت میں کہ بہن قربانی سے محروم نہ رہے۔''

حامد نے فخریہ طور پر منکو کا تعارف کرایا جو خوفناک انداز میں اسلم کو گھور رہا تھا۔ اسلم نے فوراً پینترا بدلا اور سالے کے ہاتھوں بہنوئی کو ختم کرا کے شاداں پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''ارے، شاداں کا بھائی ہے تو اپنا بھی بھائی ہے اور اس ناتے میں ابھی تیرے ساٹھ ہزار لا کر دے دیتا ہوں مگر یار، بڑے افسوس کی بات ہے---'' وہ منکو کے قریب گیا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔ ''یہ تیرا بہنوئی ہے، ایسے ہوتے ہیں بہنوئی؟ مجھے تو اس نے کہا تھا کہ آج میرا سالا گاؤں سے آنے والا ہے۔ سالا پینڈو ہے، یہ گائے بھاری منافع میں اس کے ہاتھ بیچ کر جتنا منافع ہو گا، آدھا آدھا کر لیں

گے۔اب یہ میرے کو یہاں دیکھ کر ایکٹنگ کر رہا ہے۔اگر تو میرا سالا ہوتا تو تیرے کو سر آنکھوں پر بٹھاتا، تیرے اس کنگلے بہنوئی کی طرح سالے سے مال نہیں کھینچتا۔"

منکو نے اسلم کو ایک طرف کیا اور لاچے کو سنبھالتے ہوئے آیا اور حامد کو بچے کی طرح ہاتھوں سے اٹھالیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کو اٹھا کر روڈ پر دے مارتا، اسلم وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا اور شاداں اپنے گلو کو ایک ہاتھ سے گھسیٹتی ہوئی آئی اور اپنے بھائی کے قدموں سے گر کر گڑگڑانے لگی۔ اسلم نے ایک لات بہن کو بھی ماردی۔

"دور ہو جا میری نظروں سے---تو نے ہی خصم سے مل کر اپنے یار کے ہاتھوں لٹوایا ہے مجھ کو۔ دفع ہو جا، میں تیری شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے حامد کو زمین پر پٹخ دیا۔ حامد کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ شاداں نے اپنے مجازی خدا کی یہ بے ادبی دیکھ کر مجازی خدا کے زمین پر لینڈ کرنے سے پہلے ہی ایک قلابازی کھائی مگر وہ پہلے ہی لینڈ کر چکا تھا۔ مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ منکو جنونی کیفیت میں گائے کی رسی تلاش کرنے لگا۔ اس کے منہ سے جھاگ اور آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ اس نے قریب ایک رسی جھولتی ہوئی دیکھی، پکڑی اور ایک طرف مجمع کو چیر کر جانے لگا تو پیچھے سے آواز آنے لگی۔

"ابے، ابے میرا پاجامہ---ارے، چھوڑ نا ہنجار---ابے، یہ تیرے بہنوئی کا ازار بند تو نہیں ہے۔"

منکو نے مڑ کر دیکھا تو رسی کے دوسرے سرے پر ایک بڑے میاں کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اس نے بڑے میاں کی رسی چھوڑ کر گائے کی رسی بہت تلاش کی مگر گائے مع رسی کے غائب تھی۔ اس ہڑ بونگ اور اٹھا پٹخ میں کوئی دل والا گائے لے اڑا تھا۔ حامد کے زمین پر لینڈ کرنے سے کئی ٹکڑے ہو گئے تھے اور وہ کمر پر ہاتھ رکھے اپنی ریڑھ کی ہڈی کے ٹکڑے گن رہا تھا اور اسلم کو اپنے تئیں سزا دینے کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑبڑایا۔ منکو نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی۔ اس نے حامد کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دو تین دھوبی پاٹ اور مار دیے۔ حامد کو آرام سے زمین پر رکھا اور منڈی کی طرف دوڑ لگا دی---دور سے شاداں کی آہ و بکا کی آوازیں اس کے مجازی خدا کے اوپر نکل لینے کی نوید سنا رہی تھیں۔ اس نے جیب سے دو پلی ٹوپی نکالی، اپنے سر پر جمائی، کاندھے پر رومال کی تکون بنا کر دو کونوں کو آپس میں ملایا اور نہایت باادب اور پرہیز گار بن کر زمین پر پڑے خاموش حامد کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"حامد بھائی! اپنے اللہ کو حاضر ناظر جانتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ خلوص دل سے مجھے معاف کر دو۔ تم میرے تیس ہزار واپس کر دو اور اپنی گائے لے لو، میں نے شاداں کے بھائی کو اس کے ساٹھ ہزار واپس کر دیے ہیں۔"

اس نے کنکھیوں سے شاداں کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے موسم کا جائزہ لیا۔ زار و قطار روتی ہوئی شاداں کی آنکھوں سے گرنے والے موتیوں کو وہ اپنے دامن میں بھرنے کی خواہش کرنے لگا۔ اس نے اس کے مجازی خدا اور اپنے ولن کی اس دنیا سے رخصتی کی امید میں زمین پر پڑے حامد کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"یہ لو، حامد بھائی! اوپر جانے سے پہلے حساب بے باق کر جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ شاداں جب بیوہ ہو تو قرض دار ہو۔"

اسلم نے جب سے تیس ہزار روپے نکالے اور ان کا پنکھا بنا کر حامد کے منہ پر جھلتے ہوئے کہا۔

"تو نے میرے بھائی کو ساٹھ ہزار اول تو دیے نہیں ہوں گے اور اگر دیے ہوں گے تو اس کو مع ساٹھ ہزار کے اغوا کر لیا ہوگا، جیسے تو نے اتنی بڑی گائے کو اغوا کر لیا ہے۔" شاداں نے روتے روتے اسلم کی فطرت بیان کی۔

"اللہ کی قسم شاداں! وہ تو گاڑی چڑھ گیا ہوگا۔ کہہ رہا تھا کہ میٹن جا رہا ہوں میں ایسے بہنوئی کے کفن دفن میں شامل ہونا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ جاتے جاتے میں نے اس کو اپنی جیب سنبھال کر جانے کو کہہ دیا تھا کہ کہیں یہ آٹھ ہزار کسی اور کی عید کے کام نہ آ جائیں۔"

اس تمام عرصے میں پڑی گٹھڑی میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اسلم نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تین ہزار روپے کا پنکھا شاداں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو شاداں اپنے اوپر جانے والے مجازی خدا کے تین ہزار، اور میں اپنا بکرا واپس لے جا رہا ہوں۔ تیرا یہ مجازی خدا اگر واقعی اٹھ جائے اوپر نہیں---! میرا مطلب ہے کہ زمین سے تو اس کو بولیو کہ میری گائے منڈی پہنچا دے۔"

شاداں اس کی چاپلوسی نہ سمجھ پائی اور وہ پیسے اسلم کے ہاتھ سے لے کر زمین پر پڑے اپنے مجازی خدا کو وقتی طور پر بھول گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا روپوں کی پڑیا بنالی اور محفوظ کر لی۔ اور پھر رونا دھونا وہیں شروع کر دیا کہ جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ اسلم نے بکرا کھولا اور تین ہزار میں بکرا اور شاداں دونوں کو خرید کر چل دیا۔

اس کے جانے کے بعد شاداں کو روتے روتے خیال آیا کہ بھائی آٹھ ہزار لے کر گڈی چڑھ گیا، اسلم تین ہزار دے کر نکل لیا، یہ گائے اپنے کس عاشق کے ساتھ فرار ہو گئی؟ کتنا عظیم ہے اسلم کہ گائے لے کر

بھی نہیں گیا اور آٹھ ہزار بھائی کو واپس کر دیئے---اسلم نے اس کے زخموں کی پرانی راکھ کو کرید کر رکھ دیا جہاں ابھی آگ کی تپش باقی تھی۔اس نے زمین پر پڑے اپنے مجازی خدا کے اوپر ٹہل جانے کا یقین کرنے کے لئے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''اٹھ جا، گلو کے ابا! چل، میں تیرے جسم کی ٹکور کر دوں---اب مرنے کی ایکٹنگ نہ کر، اسلم چلا گیا ہے۔''

''ابے اٹھ جا، اب تو تیرا وکن تیرے اور تیری جورو کے بھائی کے پیسے بھی دے گیا ہے---''

پڑوسن کی آواز پر حامد میں جان پڑتی دکھائی دی۔وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

''پیسے---گک، کہاں ہیں---رقم کہاں ہے؟''

''ابے، کائیں کے بچے! کیا کوا بن کر ہوش میں آیا ہے؟''

''نکال رقم کہاں ہے---''

حامد نے شاداں کو ہلا کر رکھ دیا اور ساتھ ہی ایک دل دوز چیخ کے ساتھ اپنی کمر پکڑ کے بیٹھ گیا۔سب نے مل کر اس کو اٹھایا اور شاداں کی قیادت میں سہارا دے کر اس کے دو کمروں کے ٹھکانے کی طرف لے چلے۔شاداں کے دل کی راکھ میں جو اسلم کی چنگاری جاگ اٹھی تھی، اس پر حامد کے پیسوں کی گردان شروع کر دی۔شاداں باورچی خانے کی طرف گئی، راستے میں گود میں سوار گلو کو پلنگ پر ڈالا اور حامد کے رنگ کا توا اور مٹی کے تیل کا چولہا لے کر حامد کی کمر پر پھٹے ہوئے تولیے سے ٹکور کرنے لگی۔

''شش---شاداں---!''

حامد کے منہ کی قید سے چند لفظ آزاد ہو کر شاداں تک پہنچے تو شاداں بولی۔

''جی، سرتاج! میں ٹکور کر رہی ہوں۔''

''وہ---وہ---رقم کہاں ہے؟''

''حامدے! تو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اسلم لکھ پتی کی تعریف کر رہا تھا نا! تو ٹھیک ہی کر رہا تھا۔اسلم آیا تھا اور تیرے پیسوں کے علاوہ منکو کے پیسے بھی دے گیا تھا اور اپنا بکرا لے گیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ گائے مجھے واپس پہنچا دے۔اللہ قسم، حامدے اسلم تو بڑا ہی ایمان دار ہو گیا ہے۔وہ تو دیکھنے سے بھی اللہ والا لگتا ہے اور---''

''چپ ہو جا، بے حیا! سب جانوں ہوں میں کہ تو اس کی تعریف کیوں کر رہی ہے۔لا، تو پہلے مجھے سارے پیسے دے پھر میں---ہائے، اف میری کمر---''

حامد پھر ڈھیر ہو گیا مگر اس کی جان ''پیسوں'' میں اٹکی ہوئی تھی۔

''لا، سارے پیسے دے---''

حامد کا ہاتھ پھر شاداں کے سامنے پھیل گیا۔شاداں نے پڑیا نکالی اور روپے حامد کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔حامد کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

''یہ---یہ کیا ہے؟---اور وہ باقی پیسے---؟''

''وہ ساٹھ ہزار تو اسلم نے منکو کو دے دیئے تھے اور وہ گڈی چڑھ گیا---'' شاداں نے اپنے ہاتھ ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔

''اچھا، تو ساٹھ ہزار وہ لے گیا اور گائے اس کو میں دونگا؟---تو تم دونوں بہن بھائی کا یہ پروگرام تھا مجھے ذلیل کرنے کا لیکن یہ بات غور سے سن لے، میں اس چینڈو اور اسلم کو ایک ہی قبر میں اتار دوں گا---ہائے، میری کمر---ذرا میں ٹھیک ہو جاؤں اور---''

شاداں حامد کی بندر بھبکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''تو نے میرے بھائی کے خلاف سازش کی، اس کی محنت کی رقم اسلم کے ذریعے ہتھیانے کا چکر چلایا؟---شکر کر کہ وہ تجھے پلنگ سے اٹھنے جوگا چھوڑ گیا ورنہ سوئم چالیسواں کر کے ہی جاتا۔میں---''

''چل، شاداں! سامان باندھ---''

''تین سال سے تو نے کون سا سامان لا کر دیا ہے جو باندھوں؟---پر یہ تو بتا کہ جا کہاں رہا ہے؟''

''ہم ابھی گاؤں جائیں گے اور وہیں قربانی کریں گے۔صبح تک پہنچ جائیں گے۔''

''یہ کیا تیرے کو دورہ پڑتا ہے---گائے، بکرے، اسلم اور منکو کو چھوڑ کر تو میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟ میں سب جانوں ہوں، تجھ کو میرے پر اعتبار نہیں ہے۔میری زلفوں کو پکڑ کر میری محبت کی قسم کھاوے تھا، میرے ساتھ دریا میں کود کر مر جانے کو کہوے تھا، میری جوتیوں کو اپنے سینے سے لگاوے تھا، میرے ایک اشارے پر چاند توڑ کر لا دے دے تھا اور اب تو میری بات پر اعتبار نہ کرے ہے۔مجھ پر یقین نہیں ہے تو جا، اسلم لکھ پتی سے معلوم کر لے کہ اس نے پیسے منکو کو دیئے تھے یا مجھے دیئے تھے؟---تیرے دماغ میں یہ سانپ ڈنگ مارے ہے نا! بول اب منہ کیوں چھپاوے ہے؟---ماں اپنے بچے کی قسم نہ کھاوے، لے دیکھ میں اپنے بچے کے سر پر ہاتھ رکھوں ہوں، لے---'' وہ گلو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''شاداں! تو میری اکلوتی نشانی کو بیچ میں لے آئی ہے تو میں تیرا یقین کر لیتا ہوں مگر میری اوپر منزل میں یہ بات نہیں بیٹھ رہی اور نہ کھڑی ہو رہی ہے کہ اسلم جیسے فراڈیے نے پیسے اس کو واپس کیسے کر دیئے اور وہ بھی گائے کے بغیر---''

''حامدے! اسلم ہے تو فراڈیا مگر دل کا برا نہیں ہے۔ وہ مجھے پیسے دے کر بکرا بھی لے کر نہیں جا رہا تھا، وہ تو میرے کہنے سے بکرا لے گیا تھا۔ بڑی شرارتی آنکھوں سے دیکھے تھا مجھے وہ---'' وہ شرماتے ہوئے بل کھاتے ہوئے بولی۔

''اس وقت تو تو بھی شرارتی بن گئی ہوگی---''

''مگر، حامدے---!'' شاداں نے حامد کی بات کو گھاس بھی نہیں ڈالی اور بولی۔ ''یہ گائے اسلم بھی لے کر نہیں گیا اور منگو بھی نہیں لے گیا تو یہ گائے کون لے گیا جب کہ اس وقت تو بھی زمین کی مٹی چاٹ رہا تھا؟---ہم---مگر یہ تو مجھے گھور گھور کر کیا دیکھے ہے؟''

''جی چاہ رہا ہے کہ جس طرح تیرے بھائی نے میرے نٹ بولٹ ڈھیلے کیے ہیں، اسی طرح میں تیرے نٹ بولٹ بھی ڈھیلے کردوں مگر میں کیا کروں تو میری اکلوتی نشانی پالنے کی ذمہ دار ہے۔''

''اب زیادہ باتیں نہ بناؤ، پرسوں عید ہے۔ کچھ کرو، تم نے اپنی سال بھر کی جمع پونجی اپنی بیوقوفی سے ختم کر ڈالی۔''

''اچھا، زیادہ بک بک مت کر۔ کھانا لے آ، پھر میں چلوں بکرا پکڑنے---میرا مطلب ہے کہ بکرا خریدنے---''

''پہلے اپنی کمر تو پکڑلو جو نکلی جا رہی ہے۔ کروٹ لینے میں تو ''ہائے، ہائے'' کر رہے ہو اور چلے ہو بکرا لینے---ویسے مجھے معلوم ہے کہ تم یہ پیسے بچانے کے چکر میں ہو۔ خرید کر کیا، تم ''پکڑ'' کر ہی لاؤ گے کسی کا بکرا، آخر اپنا خاندانی کام کیسے بھول سکتے ہو---میں کہتی ہوں، رحم کرو اپنی اکلوتی اولاد پر، اس کو بھی کیا اپنے فن سکھاؤ گے؟ اور ہاں، اگر خرید ہی لاؤ تو قصائی کے لئے پیسے بچا کر لانا، میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اب چلے بھی جاؤ، کیا روٹی کے ساتھ پلیٹیں بھی کھا جاؤ گے۔ دروازہ سونا سونا پڑا ہے۔ محلے کے سارے دروازے رونق افروز ہو رہے ہیں، بس ایک ہمارا ہی دروازہ ہے کہ گھاس پھوس اور مینگنیوں کو ترس رہا ہے۔''

''تجھے بہت پسند ہیں گھاس پھوس اور مینگنیاں---؟''

''اچھی بیوی وہی ہوتی ہے جو اپنے مجازی خدا کی پسند کا خیال رکھے۔ تیری پسندیدہ چیزیں بھلا مجھے کیوں نہ پسند ہوں گی---ارے، یہ پیسے تو ''انٹی'' میں رکھ لوں، پہلے ہی دولت کو ہم سے اسی طرح چڑ ہے جس طرح اسلم کو تم سے ہے---جلدی جاؤ کہیں گلو محلے کے بکروں کے پاس ہی رات نہ گزار دے۔ ویسے بھی احمد کی بہن اور گلو کی آج کل بہت جم رہی ہے، کہیں تمہاری طرح کسی پر دل ہی نہ وار بیٹھے۔''

''میرا گلو اتنا باؤلا نہیں ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ یہ کام اس کے باپ کا ہے اور---''

''میں---میں---''

''ارے، یہ بکرے کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟''

اوں میں---اوں میں---''

''ایں، یہ دو بکروں کی آوازیں---؟''

حامد اٹھا اور دروازہ کھولا تو منگو دو خوبصورت بکرے گدھے کے سائز کے لئے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ حامد بکروں پر ہاتھ رکھتا، گلو بھاگا بھاگا آیا اور ''ماما زندہ باد'' کا نعرہ لگایا اور بکرے کی رسی تھام لی۔

''ارے، بھائی! تم؟---تم تو گاؤں چلے گئے تھے---؟''

شاداں حیران کھڑی کبھی بھائی کو اور کبھی بکروں کو دیکھے جا رہی تھی جیسے دونوں میں موازنہ کر رہی ہو کہ قربانی کے لائق کون صحیح رہے گا۔

منگو حامد کو اپنے پیروں پر کھڑا دیکھ کر حیرت کر رہا تھا کہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی زندہ ہے اور وہ حامد منگو کو گھورے جا رہا تھا کہ یہ واپس کیسے آگیا---دونوں خون آشام نظروں سے ایک دوسرے کو فنا کرنے کی سوچ رہے تھے اور محلے والے مجمع لگانے کے لئے تیار کھڑے تھے کہ ذرا آوازیں بڑھیں اور ہم اپنی ڈیوٹی ادا کریں۔

''ویسے، بھائی! اسلم تو کہہ رہا تھا کہ ساٹھ ہزار لے کر گنڈی چڑھ گیا ہے؟''

''نہ لے اس کمینے کا نام میرے سامنے، میں اس کے پیچھے منڈی گیا تھا مگر وہ وہاں نہیں ملا۔ میں بھی وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گیا کہ آج اپنی رقم لے کر ہی جاؤں گا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے وہ ذلیل وہاں پہنچا تھا۔ میں ایک گائے کی آڑ میں چھپا بیٹھا تھا، میں نے جھپٹ کر اس کو دبوچ لیا۔ وہ سالا بولا کہ پیسے تو میرے پاس ٹکتے ہی نہیں، پر لگا کر اڑ جاتے ہیں۔ تو گائے نہیں، بکرے خرید لے---کافی جھگڑے کے بعد ایک بڑے میاں نے یہ دو بکرے دلا کر فیصلہ کرایا۔ لا، ایک بکرے کے پیسے نکال؟'' منگو نے بہن کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

شاداں نے اپنے خصم کی طرف دیکھا تو وہ ہڑبڑا کر بولا۔

''پ---پیسے میرے پاس کہاں ہیں؟ میں تو خود اسی الو کے پٹھے کو پکڑنے جا رہا تھا۔''

''تو تیرے پاس پیسے نہیں ہیں، بھائی جی---؟''

وہ یہ کہتا ہوا حامد کی طرف بڑھا اور حامد پیچھے کھسکتا کھسکتا دروازے سے جا لگا۔

''ہاں، تو تیرے پاس پیسے نہیں ہیں---؟''

یہ کہہ کر حامد کی انٹی پر منگو کی گرفت مضبوط ہوگئی اور دوسرے ہی

لمبے نوٹوں کی پڑیا منگو کے ہاتھوں میں تھی۔

"میں نے باہر سے سب سن لیا تھا کہ شاداں نے پیسے انٹی میں دابنے کو کہا تھا۔ اب رہے باقی، تو صبح قربانی سے پہلے پہلے کہیں سے کسی بھی طرح کر کے مجھے دیدے ورنہ قربانی نہیں ہوگی۔"

"بھائی! ہم تو اسی طرح کنگلے ہیں جس طرح تم اغوا برائے تاوان کے دھندے سے پہلے تھے---یا تو اپنے بہنوئی کو اپنے کاروبار میں شامل کرلو اوران کے حصے میں سے اپنے پیسے لے لینا۔ بھائی! کچھ تو اپنی بہن پر رحم کرو۔" شاداں تیموں جیسا منہ بنا کر بھائی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"رحم تیرے پر تو آتا ہے کہ تو اسلم جیسے لکھ پتی کو چھوڑ کر اس کنگلے اور صدا کے فقیر کے پلے کیوں پڑ گئی؟" منگو نے حامد کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی! تم اور اسلم ایک "نیک" اور "باعزت" دھندا کرتے ہو کہ جو تم دونوں کو کسی وقت بھی سرکاری مہمان خانے میں پہنچا سکتا ہے اور سرکاری جلاد کی خوشی کے لئے کسی وقت بھی تم دونوں کو پیش کر کے اس کی خوشی پوری کی جا سکتی ہے اور میں اس بھری جوانی میں بیوہ ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔" شاداں نے منگو کے شان میں قصیدہ پیش کر دیا۔

"اچھا، تو مجھ کو طعنے دے رہی ہے اور پھر خود ہی اپنے خصم کو میرے دھندے میں شامل کرنے کو کہہ رہی ہے؟"

"وہ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ میرے اس مجازی خدا میں کبھی بھی اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں ہو سکتا جو تیرے ساتھ کام کر سکے، اس کو تو بس مار کھانے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں۔ میں اس کی طرف سے اور اس کے بڑوں کی طرف سے اسی طرح مطمئن ہوں جس طرح تو روپے وصول کر کے مطمئن ہو گیا ہے۔ باقی بھی تیرے کو مل ہی جائیں گے اور جو اللہ نے چاہا تو زندگی بھر نہیں ملنے والے۔ نتھو سبزی والے کے اور شمسو قصائی کے پیسے سالوں سے نہیں دے سکا تو تیرے روپے تو یہ اس طرح ہضم کرلے گا جس طرح تو تاوان لے کر ہضم کر لیتا ہے اور ڈکار تک نہیں لیتا۔ اب تیری اور ہمارے خیر اسی میں ہے کہ یہ روپے دل سے معاف کر دے تاکہ اس بکرے کی مشکل صبح آسان ہو جائے اور ہمارے پیارے اللہ میاں ہماری بھی قربانی قبول کر لیں۔"

شاداں! تو گاؤں میں تو اتنی زبان دراز نہیں تھی، اب تو اسمبلی کے لوٹوں کی طرح تقریر کرنے لگی ہے؟ خوب وکالت کی تو نے کنگلے مجازی خدا کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو زندگی بھر اسی حالت میں رہے گی۔ اب جب بندہ ہی ہر حال میں خوش ہو تو پیارے اللہ میاں کو کیا ضرورت پڑی ہے اس کی حالت سنوارنے کی۔"

"بھائی! تو بھی، میں بھی اور حامد بھی سب خالی ہاتھ سفید کپڑے میں لپٹے چلے جائیں گے۔ تیری ساری دولت دوسروں کے استعمال کے لئے یہیں رہ جائے گی، تیرے ساتھ قبر میں نہیں جائے گی اور ہمارے پاس تو کچھ ہوگا ہی نہیں تو ہم سب کو تو کوئی غم نہیں ہوگا اور حقیقت میں جنت میں جا کر سکون کی زندگی گزاریں گے۔ تجھ کو یہ مال و دولت چھوڑنے کا اسقدر غم ہوگا کہ تو قبر میں بھی بے چین ہی رہے گا اور دوزخ میں جا کر دولت کے انگاروں پر لوٹے گا۔ ہم تو چند دن کی زندگی دکھی گزار کر اوپر ہمیشہ کی زندگی آرام سے گزاریں گے اور تو چند ہی دن عیش کر کے اوپر کی زندگی بے سکون ہی گزارے گا۔ ہماری قربانی تو ادھار کے باوجود اللہ میاں قبول کر لیں گے اور تیری قربانی نقد خریدنے کے باوجود قبول نہ کریں گے کیونکہ حرام کے مال کی قربانی جائز نہیں ہے۔ بندہ کے پاس جتنی دولت آتی ہے، اتنا ہی وہ گناہوں کی دلدل میں دھنستا رہتا ہے اور---"

"بس بس، شاداں! بس کر---تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ تو جاہل ہو کر بھی عالم ہے اور میں پانچ کلاسیں پڑھ کر بھی جاہل ہی ہوں---شاداں! آج سے تمام برے کام بند، یہ بکرا بھی میں یتیموں کو دے آتا ہوں۔ بھائی حامد کی حلال کی کمائی کے سے ہی قربانی کریں گے جو اللہ میاں قبول کرے گا--- لے، بھائی حامد! اپنی رقم اور جا کر بکرا یا گائے جو بھی اس میں آئے، لے آ۔ یہ عید میں تمہاری قربانی کا گوشت کھا کر ہی مناؤں گا۔ آئندہ آنے والی عید پر اپنی حلال کی آمدنی سے قربانی کروں گا۔"

"ماما! جلدی سے ادھر آئیں---"

گلو بھاگتا ہوا آیا اور منگو کو پکڑ کر باہر لے گیا۔

"دیکھ، ماما! وہ بکرا اکیلا ہے۔"

"پھر کیا کروں---؟" منگو حیرانی سے گلو کو دیکھتا ہوا بولا۔

"ماما! دھندا بناؤ پچھلی عید کی طرح---بڑا موٹا تازہ ہے، بہت اچھے پیسے ملیں گے۔"

"نہیں، گلو! اب ایسا نہیں ہوگا---چل، تیرے ابا کے ساتھ بکرا خریدنے چلتے ہیں---آؤ، حامد بھائی---!"

پھر تینوں منڈی کی طرف نکل گئے اور راستے بھر منگو حامد کی کمر کو سہارا دے کر اپنے کئے کی سزا بھگتا رہا۔ پھر واپسی پر منگو یہ سوچتا رہا کہ میں بکرے کو سنبھالوں یا ٹوٹے پھوٹے بہنوئی کو؟

☆☆

بھیں بھیں

☆ کے۔ایم خالد

جو بکری نے مارا ہے بکرے کے سینگ
تو بکرا بھی مارے گا بکری کے سینگ

ابھی بکرا عید میں ڈیڑھ مہینہ پڑا ہوا تھا اور ہمارے ہونٹوں پر اس شعر کی گردان کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ بجٹ کے اعلان کے بعد ہم جیسے غریب آدمی کی اتنی کہاں ہمت ہو گی کہ وہ ایک عدد بکرا خرید کر اس کی قربانی کر سکے۔ خیر ہم نے تھوڑے سے پیسے بچا رکھے تھے اور اُمید تھی کہ کوئی ایسا بکرا یا چھترا مل جائے گا جس میں چھٹانک آدھ پاؤ گوشت نکل آئے گا۔

بیگم بھی حسب توقع بکرے کی فرمائش کر رہی تھی اور جوں جوں عید قریب آ رہی تھی اس کی فرمائشوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ بکرا عید میں ایک مہینہ پڑا ہوا تھا ہم نے سوچا ابھی بکرا خرید لیں تو شاید سستا مل جائے۔ یہ سوچ کر ایک دن جیب میں ڈرتے ڈرتے بچے ہوئے کچھ پیسے ڈالے اور بکرا منڈی جا پہنچے وہاں پر خوبصورت سے خوبصورت بکرے موجود تھے اور خوبصورت سے خوبصورت گاہک بھی موجود تھے۔ بکرے ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ مہنگائی کی چھری تو آدمی پر چلتی ہے اور قصائی کی چھری ان پر۔ ابھی میں ان ہی باتوں میں غرق تھا کہ میرے قریب ہی ایک گاڑی آ کر رُکی اور اس میں سے ایک لیڈی ڈیانا اور سارہ فرگوسن برآمد ہوئیں۔ ان کے ساتھ شہزادہ چارلس وغیرہ برآمد نہیں ہوا بلکہ الزبتھ ٹیلر کی طرح کی کوئی عورت برآمد ہوئی۔ وہ تینوں کے ٹو سے بلند ہیل کی جوتی پر چلتی ہوئیں ایک بکرے والے کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ بکرے والا کوئی دیہاتی تھا فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''بی بی جی! یہ بکرا دیکھیں کتنا خوبصورت ہے۔ کجراری آنکھیں، لمبے لمبے بال اور دیکھیں جی اس کے ماتھے پر چاند بھی بنا ہوا ہے۔''

لیڈی ڈیانا نے ناک سکوڑی اور کہا۔ ''او مائی گاڈ' ایک تو یہ ولیج لوگ کسی کو کوئی تھنگ لائک ہی کرنے نہیں دیتے۔''

میں نے سوچا اس میں تو انگریزی جراثیم کچھ زیادہ ہی موجود ہیں۔ اتنے میں سارہ فرگوسن ایک بکرے کو دیکھ رہی تھی۔

''مما! اس کے بالوں کی کٹنگ کچھ اچھی نہیں' مجھے تو بوائے کٹ والا بکرا چاہئے اور دیکھیں اس کی تو نوزی بھی بہت بہتی ہے۔''

جواب میں الزبتھ ٹیلر مسکرائی اور کہا۔ ''مائی ڈیئر ڈاٹرز! دِس اِز پاکستان اِٹ اِز ناٹ کلین کنٹری۔ یہاں تو لوگوں کی نوزی بہتی رہتی ہے۔ یہ تو پھر بکرا ہے اور پھر ہم نے کون سا اس کو شوپیس کے طور پر رکھنا ہے' اس کی قربانی ہی تو کرنی ہے۔''

بکرے والا اِن کی طرف احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ سارہ فرگوسن نے گاڑی سے ٹشو پیپر نکالا اور بکرے کی نوزی صاف کر دی۔ بکرا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا مجھے یوں لگا جیسے بکرا شہزادہ اینڈریو ہو۔

''اچھا تو اِس بکرے کی کیا پرائس ہے۔'' لیڈی ڈیانا نے اپنے بوائے کٹ کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''جی' پرس تو میری بیوی کے پاس بھی نہیں میرے بکرے کے پاس کہاں سے ہو گا۔''

بکرے والے کا جواب سن کر میں کچھ آگے بڑھا اور لیڈی ڈیانا سے مخاطب ہوا۔ ''مس! دراصل یہاں پر انگلش بہت کم سمجھی اور بولی جاتی ہے مگر پھر بھی تمام دفاتر اور ہر چیز کا حساب کتاب انگلش میں ہوتا

ہے۔ ویسے کیا آپ یورپین ہیں؟"

"نہیں ویسے تو ہم پاکستانی ہیں مگر ہماری فیملی بہت پہلے لندن میں سیٹل ہو چکی ہے۔" الزبتھ ٹیلر مسکرائی۔

"تو کیا میں آپ کے نام پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں یہ ہے رجو۔" اُس نے لیڈی ڈیانا کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ ہے میری چھوٹی بیٹی شبو اور میرا نام جنت بی بی ہے مگر اَب ہمارے یہ نام نہیں ہیں۔ میری بڑی بیٹی اَب بیوٹی ہے اور چھوٹی سویٹی اور میرا نام اَب مس چارم ہے۔" الزبتھ ٹیلر مسکرا کر دوبارہ گویا ہوئی۔ "اِن کے والد صاحب کا نام چراغ دین تھا مگر اُنہوں نے بھی اَب اپنا نام تبدیل کر کے مسٹر مارکم رکھ لیا ہے۔"

اِتنے میں دیہاتی بولا۔ "جی! مجھے آپ کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ اگر بکرا لینا ہے تو سات ہزار سے ایک پائی بھی کم نہیں لوں گا۔"

یہ سن کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں تین چار ہزار میں بکرا خریدنے آیا تھا اور یہاں سات ہزار سے کم قیمت کا بکرا ہی نہ تھا۔

"یو مین سیون تھاؤزینڈ روپیز۔" الزبتھ ٹیلر نے پوچھا۔

"جی! یہ بکرا منڈی ہے کوئی کریانہ کی دوکان نہیں یہاں سیون اپ نہیں مل سکتی۔ بکرا لینا ہے تو مل سکتا ہے۔"

"یار! یہ بکرے کی اِتنی زیادہ قیمت کیوں ہے؟ کیا بکرے نے فلم

ہزل

چرا کر لے گئے پیسہ گداگر
دکھاتے ہاتھ ہیں اچھا گداگر

انہیں خیرات جو دیتا ہے تھوڑی
تو اس سے کرتے ہیں سودا گداگر

کھنکتے نوٹ ہم سے مانگتے ہیں
نہیں لیں نوٹ بھی میلا گداگر

سہولت گھر میں ہے ہر ایک ان کے
ہیں ہم سے آج کل اعلیٰ گداگر

گریڈوں میں ہی اُلجھے ہوئے ہیں
ہیں دولت میں مگر بالا گداگر

انہیں خیرات جو دیتا نہیں ہے
اُسے کر دیتے ہیں رُسوا گداگر

سبھی نے بھیس ہی بدلا ہوا ہے
یہاں ہر ایک ہے بندہ گداگر

معزز ہے، کوئی رُسوا ہوا ہے
بڑا کوئی، کوئی چھوٹا گداگر

ذلالت، بے ضمیری اور چوری
ہوئے ہیں دہر میں رُسوا گداگر

اگر ہے باپ دُنیا میں بھکاری
بنے گا اس کا پھر بیٹا گداگر

✿ ریاض احمد قادری

میں ریمبو کا کردار کیا ہے یا بکرا ندیم ہے؟" میں نے عاجزی سے پوچھا۔

الزبتھ ٹیلر نے لیڈی ڈیانا کو اشارہ کیا۔ اِس نے پرس کھولا اور سات ہزار روپے گن کر دیہاتی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "دو بکرے الگ کرلو۔"

دیہاتی یکدم چلا پڑا۔ "نہیں جی! سات ہزار کا ایک بکرا ہے۔ چودہ ہزار کے دو بکرے ملیں گے۔ یہ بکرے بڑی مشکل سے پالے ہیں۔"

"کیا تم اِنہیں ہیروئن کا نشہ کراتے رہے ہو۔" میں نے کہا۔

اِس بات کا کیا جواب تھا۔ خیر تھوڑی دیر بعد دیہاتی مان گیا اور اُنہوں نے دو بکرے الگ کر لیے۔ پھر وہ مجھ سے بولیں۔ "آپ ہمیں اور ہمارے بکروں کو گھر تک چھوڑ آئیں۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بکرے کو اُٹھایا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی ریلوے کی لیٹرین میں گھس گیا ہوں۔ جیسے تیسے کر کے اِس کو ڈگی میں بند کر دیا پھر دوسرے کو اُٹھانے آیا تو شاید دوسرے کو پتہ تھا کہ مجھے پانی سے چڑ ہے یا واسا کو مجھ سے چڑ ہے کہ پانی ہی نہیں سپلائی کرتے نہائیں کہاں سے میں نے اِسے اُٹھایا اور اس نے کسی شرارتی بچے کی طرح مجھ پر ٹیوب ویل چلا دیا اور میں سرتاپا پانی اور شرم میں ڈوب گیا۔ خیر میں نے اِسے بھی ڈگی میں بند کر دیا۔ لیڈی ڈیانا کو میری حالت پر ترس آیا اِس نے تھوڑے سے ٹشو پیپر نکال کر دیے اور کہا۔

"منہ ہاتھ صاف کرلو۔" پھر وہ بولی۔ "آپ ہمیں گلبرگ کالونی تک چھوڑ آئیں۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا میں بھی اُن کے ساتھ ہی کار میں بیٹھ گیا پھر کار فراٹے بھرتی ہوئی گلبرگ کالونی کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

کار اِن کی کوٹھی کے سامنے رُک چکی تھی۔ میں کار سے اُترا میں نے ڈگی میں دیکھا تو گرتے گرتے بچا۔ ڈگی میری جیب کی طرح خالی پڑی ہوئی تھی، مگر اِتنی بھی خالی نہیں تھی اِس میں منی گلاب جامنیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر لیڈی ڈیانا بولی۔

"یہ کیا ہوا! بکرے کہاں چلے گئے؟"

میں نے کہا۔ "میں پتہ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بس میں بیٹھا اور دوبارہ بکرا منڈی کی طرف روانہ ہوا۔

بکرا منڈی میں اِسی دیہاتی کے پاس پہنچا تو وہ بکرے وہیں پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُسے تعارف کرایا اور کہا۔

"یار! یہ بکرے ابھی ہم یہاں سے خرید کر لے گئے تھے۔" وہ مان

ہی نہیں رہا تھا مگر پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی مان گیا اور بکرے میرے حوالے کردیئے' شاید اُسے ثواب کا خیال آ گیا تھا۔

میں بکروں کو لیے تیزی سے گلبرگ کی طرف رواں دواں تھا۔ بکرے مجھ سے رسّی تڑوانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے مگر میں اس وقت انو کی پہلوان بنا ہوا تھا۔ اس پہلوانی میں میرا ہاتھ بہک گیا۔ ہاتھ بہکنے کی دیر تھی کہ بکرے کسی وحشی جٹ کی طرح دوڑنے لگے اور میں ایک مزارع کی طرح زمین پر قلابازیاں کھانے لگا پھر شاید بکروں کو میری حالتِ زار پر ترس آ گیا' انہوں نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ میں جلدی سے سڑک پر سے اُٹھا اور جسم کو ٹٹولا' ہلکی ہلکی کافی چوٹیں آ ئی تھیں۔ خیر اسی طرح کی ورزشوں کے بعد گلبرگ پہنچا اور بکرے اِن ماہ جبینوں کے حوالے کیے۔ اُنہوں نے معاوضے کے طور پر مجھ سے کہا۔

''قربانی کے روز آنا' آدھا بکرا تمہارا ہو گا بشرطیکہ کسی قصائی کو سستے داموں ساتھ لے کر آؤ۔''

''قصائی سے تو ٹائم لینا پڑے گا۔ اگر ہو سکا تو ضرور آؤں گا' اگر نہ آ سکا تو بکرے میرے گھر روانہ فرما دیں تو مہربانی ہو گی۔'' یہ کہہ کر میں نے اِن کو اپنے گھر کا ایڈریس دے دیا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح میں اپنے صاحب کے گھر جا پہنچا۔ وہ ابھی ناشتے سے ہی فارغ ہوئے تھے میں نے کہا۔

''صاحب! کچھ پیسوں کی ضرورت تھی بکرا خریدنا تھا۔''

یہ سن کر صاحب بولے۔ ''بھئی' تمہیں تو پتہ ہے کہ ہم تنخواہ دار آدمی ہیں ہمارے پاس فالتو سرمایہ کہاں' بکرا تو میں نے بھی خریدنا ہے مگر پیسے میرے پاس بھی تھوڑے ہیں۔ تنخواہ ملنے والی ہے مگر اس سے بمشکل ایک بکرا خرید سکوں گا اور ہاں عید کے روز قربانی کرنی ہے ضرور آنا اور پیسوں کی طرف سے معذرت قبول کرو۔''

اور میں خاموش منہ لٹکائے چل پڑا۔ دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور اِسی ہلچل میں ایک بڑی زوردار ترکیب میرے ذہن میں آئی جو کہ صرف جیب سے خالی اِنسان کی سمجھ میں ہی آ سکتی ہے۔ میں فوراً ایک کیسٹوں والے کی دوکان میں گھس گیا اور اُسے کہا۔

''بھائی صاحب! ایک کیسٹ چاہیے جس کے ایک طرف بکرے کی آواز ہو اور دوسری طرف اِس کے ذبح ہونے کی آواز ہو۔''

دوکاندار مسکرایا' مجھے یوں لگا جیسے میری حالت پر مسکرایا ہو۔ اُس نے کہا۔

''کیوں نہیں ہم آپ جیسے لوگوں کے لیے بیٹھے ہیں' یہ لیں کیسٹ مگر اس کیسٹ کے سو روپے ہوں گے۔''

''سو روپے---'' ہم گرتے گرتے بچے۔

''ہاں سو روپے کیونکہ اِس کیسٹ میں پانچ ہزار روپے والے بکرے کی آواز ریکارڈ کی گئی ہے۔''

قربانی کا معاملہ تھا کیا حجت کرنی تھی' اِسے سو روپے دیئے اور کیسٹ اپنے قبضے میں کر لی۔

ابھی عید میں پندرہ روز باقی تھے۔ ہم نے گھر جا کر کیسٹ کو ٹیپ ریکارڈر میں لگایا اور آواز اُونچی کر دی۔ ''بھے بھے بھے بھے بھے بھے'' کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ ہماری بیگم بھاگی ہوئی آ ئیں۔

''میں نے بکرے کی آواز سنی ہے مگر یہاں تو بکرا نہیں ہے۔''

''بکرا یہاں نہیں کیسٹ میں ہے۔''

میں نے اِسے ساری بات سمجھائی جسے سن کر وہ مرتی کیا نہ کرتی'

ہزل

نہیں تم سے ہوئی محنت ذرا کیا
ہوئے ہو فیل' اب آہ و بکا کیا
طریقے نقل کے اب سینکڑوں ہیں
''عبارت کیا' اشارت کیا' ادا کیا''
''نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں''
کن انکھیوں سے تکا اب تک' ہوا کیا
ہم اِس کو بھی تو پہچانتے ہیں رشوت
''ہم اِس کے ہیں' ہمارا پوچھنا کیا''
کہا بیٹوں سے زچ ہو کر یہ اِس نے
کہ ابا لاؤ گے اب دوسرا کیا
ہے کوٹھے تک ہماری پارسائی
ہمارا ساتھ دیں گے پارسا کیا
کہا یہ خودکشی سے پہلے اِس نے
''نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا''
یہ مغرب کا ہے ساحل' بے وقوفو!
یہاں نظریں جھکا کر بیٹھنا کیا
پکڑ کر ناک عاشق کی وہ بولی
کہ اِس نلکی میں ہے آخر بھرا کیا

✿ مرزا عاصی اختر' میرپورخاص

چپ ہوگئی۔ کیسٹ سے پھر "بھے بھے" کی آواز بلند ہوئے تو ہمسایوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔

"ارے امجد صاحب! بکرا خریدا ہے' کیسا ہے'اللہ قسم آواز سے تو لگتا ہے من دو من گوشت ہوگا۔" ہمارے ہمسائے رال ٹپکاتے ہوئے مجھ سے گویا ہوئے۔

"بس کیا بتاؤں گاؤں گیا تھا سالے صاحب بولے اِس بار گھر کا پلا ہوا بکرا لے جاؤ' وہی لے آیا خاصا بڑا موٹا تازہ ہے۔"

"اِس کا مطلب ہے بہت مزہ آئے گا عید کے روز۔" وہ صاحب رال ٹپکاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

چارچوکے

پہاڑ کے نیچے

جن کی لش پش سے کبھی آنکھیں تھیں چندھیائی ہوئی
کیا بتاؤں، کیسی حالت میں ملے، اور کیوں ملے
زندگی نے یوں بڑھاپے کی سزا دی ہے ظفر
جو سدا اکڑے رہے ہیں ، آج وہ اکڑوں ملے

بے مزانہ ہوا

حظ اٹھائیں قطع کلامی کے
ایسے باتیں وہ میریاں کاٹیں
جس طرح لڑکیاں مزے لے کر
کھٹی کھٹی سی کیریاں کاٹیں

یادرکھو

آج ٹھینگا تو دکھاتی ہے مگر یاد رہے
کل کے پائے گی ناز اٹھانے کے لئے
" ہم بھی اس عمرِ رواں میں کہیں بہہ جائیں گے
تو بھی باقی نہ رہے گی ہمیں پانے کیلئے "

ہنوز

خزانہ کوئی بھی لگا نہیں رہتا ہے دنیا میں
ہمیشہ ہم نے دیکھا ہے کہ کوئی "سپ" ہے پہرے پر
ظفر ہیرے جواہر ہوں یا حسن دل پشوری ہو
کبھی ہوتا تھا برقعہ اور اب میک اپ ہے چہرے پر

✿ نوید ظفر کیانی

اِسی طرح کئی آئے اور کئی چلے گئے۔ بہت سے لوگوں نے بکرا دیکھنے کی فرمائش بھی کی مگر اُنہیں اِس کے خونخوار ہونے کا سنا کر ڈرادیا گیا۔

سارادن اور ساری رات کیسٹ چلتی رہی۔ ایک دن ایک ہمسائی بولی۔ "آئے ہائے کیسا بکرا ہے بس بھے بھے ہی کرتا رہتا ہے کبھی منہ میں زبان نہیں ڈالی۔"

بیگم فوراً بولی۔ "دراصل گاؤں سے آیا ہے اور اجنبی ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر رہا۔"

لیکن ایک دن اِس بات کا پول واپڈا والوں نے کھول ہی دینا تھا۔ ہوا یوں کہ بجلی بند ہوگئی اور اِس کے ساتھ ہی بھے بھے بھی' ہمسائی فوراً دیوار پر چڑھی اور بولی۔ "دیکھو بکرے نے بھے بھے بند کردی ہے۔"

بیگم فوراً بولی۔ "دراصل بجلی بند ہوگئی ہے۔"

"تو کیا بکرا بجلی سے چلتا ہے۔"

"دراصل بکرا پنکھے کے بغیر ایک پل بھی آرام نہیں کرتا اس لیے خاموش ہے۔" اتنا کہہ کر بیوی نے ہمیں خطرے کا سگنل دے دیا اور ہم نے فوراً گلے سے بھے بھے کی آوازیں بلند کرنا شروع کردیں۔

"ہاں اَب بولا مگر اِس کی آواز اَب اِتنی بلند نہیں۔"

"دراصل بجلی نہیں ہے اِس لیے۔"

"کیا؟" ہمسائی نے آنکھیں نکالیں۔

"میرا مطلب ہے کہ بکرے کو گرمی لگتی ہے اس لیے آواز کمزور نکل رہی ہے۔"

اِتنا سن کر ہمسائی واپس چلی گئی اور ہماری جان میں جان آئی۔

ایک دن مَیں دفتر سے واپس آ رہا تھا کہ دو تین آدمیوں نے روک لیا۔ مَیں نے کہا۔ "جی' فرمایئے؟"

اُنہوں نے کہا۔ "امجد صاحب! آپ کے گھر میں بکرا ہے؟"

مَیں نے کہا۔ "جی ہاں ہے۔"

"اگر ہے تو پھر بکرا کیا کھاتا ہے کیونکہ آج تک ہم نے آپ کو اِس کے لیے چارہ لے کر جاتے نہیں دیکھا۔"

یہ سن کر قدموں تلے سے زمین سرک گئی مگر پھر فوراً ایک بات سوجھ گئی۔ دراصل میرے سالے نے بکرے کی دُودھ مکھن اور روٹی پر پرورش ہے اس لیے مجبوراً ایسی چیزیں ہمیں بھی کھلانی پڑتی ہیں۔"

شکر ہے کہ آدمیوں نے جلد ہی جان چھوڑ دی ورنہ مَیں گھبرا گیا تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح بیگم نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز اُونچی کی اور

کیسٹ لگادی اور غلطی سے کیسٹ کی دوسری سائیڈ لگادی۔ بس پھر کیا تھا بکرے کے ذبح ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں جلدی سے بھاگا اور کیسٹ درست کی مگر اتنی دیر میں محلے والے اکٹھے ہو گئے تھے۔

"بھائی صاحب بکرے کو کیا ہوا' خدانخواستہ کچھ ہو تو نہیں گیا' اس کی آواز تو ایسی تھی جیسے اس کو ذبح کیا جا رہا ہو۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوا' دراصل اس کے گلے میں رسّی پھنس گئی تھی' دیکھیں اَب کیسی لطیف آواز میں بھے بھے کر رہا ہے۔"

شکر ہے یہ سن کر محلے والے ٹل گئے۔

عید سے ایک روز قبل میں ایک پنساری والے کے پاس گیا اور اس سے سرخ رنگ طلب کیا۔ اِسے لا کر گھر میں رکھا۔ اس کے بعد ایک گوشت والے کے پاس گیا اور اُسے دس کلو گوشت کا آرڈر دیا۔ قصائی بولا۔

"بابو جی! صبح تو عید ہے آپ دس کلو کا کیا کریں گے۔"

"دراصل مہمان کافی آ گئے ہیں اس لیے گوشت چاہیے۔"

گوشت کو لا کر گھر میں رکھا اور پھر شہر کا رُخ کیا۔ رات کا وقت تھا ایک کھالوں کی دوکان پر جا پہنچا اور اُن سے کہا۔

"بھائی! ایک موٹے تازے بکرے کی کھال چاہیے۔"

اندھیرا تھا اُنہوں نے اندھیرے میں دنبے کی کھال دے دی' وہ لے کر گھر واپس آ گیا۔ اَب سارا سامان مکمل تھا۔ دکھاوے کے لیے میں نے چھریاں وغیرہ تیز کروالی تھیں۔

دوسرے دن عید کا دن تھا۔ نہا کر کپڑے وغیرہ بدلے اور عید کی نماز پڑھ کر محلے میں آئے تو محلے والے بولے۔ "امجد صاحب! کہیں تو ہم آپ کی مدد کروا دیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں جناب! میرے گاؤں سے رشتہ دار آئے ہوئے ہیں وہ ہی کام کروا دیں گے۔" اور پھر میں اندر جا گھسا۔ ٹیپ ریکارڈر کو باہر صحن میں لگا دیا۔ پہلے بھے بھے ہوتی رہی اِس کے بعد دوسری سائیڈ لگا دی۔ بیگم رنگ اور لوٹا لئے تیار کھڑی تھیں۔ میں نے چھری کو تھوڑا سا رنگ لگایا اور پھر تکبیر بلند آواز میں پڑھی تا کہ باہر موجود لوگ سن لیں۔ اِس کے بعد بکرے کے ذبح ہونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ بیگم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ لوٹا اور رنگ مل کر خون کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور باہر نالی میں بہنے لگے۔ باہر سے آواز آئی۔

"بھائی صاحب اگر زیادہ طاقتور ہے تو ہم آئیں۔"

میں نے یوں جواب دیا جیسے بکرے کو قابو کیا ہوا ہے۔

"نہیں ٹھیک ہے' اَب دَم خم ختم ہو گیا۔"

پھر باہر سے آوازیں آئیں۔

"دیکھو کتنا موٹا تازہ ہو گا۔ کتنا زیادہ خون نکلا ہے۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ پھر میں نے یوں آوازیں نکالنا شروع کر دیں جیسے اِس کی کھال اُتار رہا ہوں پھر بکرے کا گوشت بنایا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں کھال لے کر باہر نکلا تو ایک مجمع لگا ہوا تھا۔

"یارو بکرا ہو تو امجد صاحب کے بکرے جیسا' دیکھو کتنا خون نکلا ہے۔" ایک آواز میرے کان میں پڑی۔

میرے ہاتھ میں کھال دیکھتے ہی ایک آواز آئی۔

"ایں آوازیں تو بکرے کی تھیں مگر یہ کھال تو دنبے کی ہے۔"

"جی دراصل یہ دنبہ ہی تھا مگر بہت زیادہ ہی پلا ہوا تھا اس لیے آوازیں بکرے سے ملتی جلتی تھیں۔" ساتھ ہی ساتھ میں دل میں کھال والے کو بھی کوس رہا تھا جس نے مجھے دنبے کی کھال دے دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تمام محلے والے میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ دنبے کی تعریف بھی کر رہے تھے۔

"بہت لذیذ گوشت ہے' اِتنا مزہ محلے میں کسی کے گھر کھانے میں نہیں آیا۔" اور میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد لیڈی ڈیانا نے اپنے نوکر کے ہاتھ گوشت بھجوا دیا۔ گوشت کافی مقدار میں تھا۔ میں نے کہا۔

"بیگم! اپنے گھر کھانے کے لیے بے شک گوشت نہ رہے مگر تمام گھروں میں گوشت ضرور بھیجنا ہے اور ہاں میں اپنے صاحب کے گھر جا رہا ہوں' دیکھتا ہوں اُنہوں نے کیا تیر مارا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں اپنے صاحب کے گھر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اُن سے بکرے کی تعریف سن رہا تھا۔

"بھئی امجد بکرا بہت اچھا مل گیا۔ دو ہزار روپے کا لیا تھا مگر گوشت کافی نکل آیا ہے۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ٹیپ ریکارڈر پر وہاں رکھا ہوا کیسٹ چڑھا دیا مگر یہ دیکھ کر صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں کیسٹ پر گانا چل رہا تھا' پھر اچانک گانا بند ہوا اور اِس کی جگہ بھے بھے نے لے لی۔

"تو کیا سر! آپ نے بھی---" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اور سر نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔

☆☆

لوڈشیڈنگ پر ہمارے مخبر کی اطلاع

ڈاکٹر محمد یونس قریشی

صدر بش اور ہمارے وزیراعظم کی ملاقات میں اگرچہ کوئی دیسی قسم کا انسان موجود نہ تھا تاہم ہمارے ایک دیسی منجر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس نے خواب میں دونوں سربراہوں کی ملاقات کا منظر بڑے صاف شفاف انداز میں دیکھا ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ دونوں کس زبان میں بات چیت کر رہے تھے تو اس نے کھرے انداز میں جواب دیا کہ وہ ایسی زبان میں گفتگو کر رہے تھے جسے وہ نہیں سمجھتا تھا تاہم اس کا کہنا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ چونکہ ایک دیسی قسم کے انسان کا ہے اس لیے اس کی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال' اس کی خواہش پر من وعن پیش کیا جا رہا ہے جس کی ذمہ داری صاحب خواب پر عائد ہوتی ہے۔

صدر:۔ ہم نے آپ کی حکومت بننے اس لیے دی تھی کہ ہماری شرائط پر عمل کریں۔

وزیراعظم:۔ جی ہم آپ کی شرائط پر علمدرآمد کر رہے ہیں' سمجھیں کہ آپ کی ہی حکومت ہے۔

صدر:۔ ویری گڈ--- آپ نے ناشتہ کیا ہے؟

وزیراعظم:۔ ہم ناشتہ ذرا دیر سے کرتے ہیں۔

صدر:۔ ہم نے کہا تھا کہ آپ نے صدر مشرف کی پالیسیاں جاری رکھی ہیں' مہنگائی کر بڑھانا ہے۔

وزیراعظم:۔ جی' جی جناب! ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔

صدر:۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ پاکستان میں بجلی کا کوئی بحران نہیں' آپ کو ہم نے کہا تھا کہ آٹھ گھنٹے لوڈشیڈنگ کرنی ہے' آپ کا وزیر کہتا ہے کہ جلدی لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی۔ ہم آپ پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ لوڈشیڈنگ جب ہم کہیں گے' ختم ہونی چاہیے۔

وزیراعظم:۔ جناب! ہم آپ کی ہدایات پر آٹھ کیا' دس دس گھنٹے لوڈشیڈنگ کر رہے ہیں۔

صدر:۔ لیکن ہمیں مزید بتایا گیا ہے کہ گذشتہ ہفتے پورے دو دن لوڈشیڈنگ نہیں کی گئی' عوام کو اتنا بڑا ریلیف کیوں دیا گیا؟

وزیراعظم:۔ آئندہ آپ کو ایسی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم نے تو رات کی لوڈشیڈنگ جو رواں ہے ختم کرنا تھی' وہ فیصلہ بھی بدل دیا ہے جتنا تنگ رات کی لوڈشیڈنگ سے غریبوں کو تنگ کیا جا سکتا ہے اس کے تو مزے ہی اور ہیں۔

صدر:۔ لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ امیر لوگوں کو آپ کی اب تک کی اتحادی حکومت کچھ ریلیف بھی دے۔

وزیراعظم:۔ جی ہاں--- جی' جی سر! ہم نے کافی تعداد میں جنریٹرز درآمد کر لیے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے تمام رہنماؤں تمام امیر کبیر لوگوں کی بجلی جاتی ہی نہیں جنریٹرز بڑی تعداد میں ہم نے منگوا لیے ہیں۔

صدر:۔ کیا ان پر کوئی کمیشن لیا گیا؟

وزیراعظم:۔ جی جی' سر! بلکہ جی جی نہیں' سر! ہماری حکومت کمیشن نہیں لیتی بلکہ اب ہم کمیشن سے ذرا اوپر والا کام کرتے ہیں۔ نواز شریف' اسفند یار ولی اور مولانا فضل الرحمٰن ہمارے ساتھ جو ہیں۔

صدر:۔ اور کیا خصوصی اقدامات آپ نے غریبوں کے لیے اٹھائے ہیں؟

وزیراعظم:۔ ہم نے سب سے پہلے آٹا مہنگا کیا۔ پھر دال مسور' پھر بار بار پٹرول مہنگا کیا۔ ہم نے کوکنگ آئل بہت زیادہ مہنگا کر دیا ہے۔ دودھ دہی وغیرہ بھی اب سستے نہیں رہے۔ گذشتہ دنوں ٹماٹر سستے تھے۔ لوگوں نے بدنام لیڈروں کو مارنے شروع کر دیے' وہ بھی ہم نے مہنگے کر دیے ہیں۔

صدر:۔ اور بھی تو کچھ سوچو۔

وزیراعظم:۔ جی ہاں--- ہمارے وزراء نوید قمر' مخدوم شاہ محمود قریشی' راجہ پرویز اشرف اور خورشید شاہ' اسحاق ڈار کے مشوروں سے دن رات محنت کر رہے ہیں--- سر! ہم نے عمرہ اور حج مہنگا کر دیا ہے' آپ کی توقع سے بھی زیادہ---!

صدر:۔ ویری گڈ--- ہمیں آپ کے جذبات اور اقدامات سے خوشی ہوئی چلو' ڈن کرو۔

وزیراعظم:۔ میں سمجھا نہیں' سر؟

صدر:۔ میرے ہاتھ پر اتنا ہاتھ مارو۔

وزیراعظم:۔ سر! پر گستاخی ہوگی' آپ ہمارے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ماریں۔

صدر:۔ ہاہاہا---!

☆☆

ہوم منسٹر کرن

☆ محمد فاروق انجم

وہ گھر کیا تھا صاف شفاف دیوار پر جیسے کسی کہنہ مشق مصور کی پینٹنگ آویزاں ہو۔ وہ گھر اگر باہر سے کسی شاعر کی غزل کا مکھڑا دکھائی دیتا تھا تو اندرونی طور پر بھی وہ اُنترے سے کم نہیں تھا۔ صاف ستھرا گھر، ہر چیز قرینے سے یوں سجی ہوئی جیسے انگوٹھی میں نگینہ فٹ ہو۔ اس گھر کے مکین دو میاں بیوی تھے۔ دونوں جوان اور خوبصورت تھے۔ سکون کے متلاشی اپنی دُنیا میں مگن، نہ کسی کو تنگ کرتے تھے اور نہ یہ خواہش رکھتے تھے کہ کوئی اُنہیں بھی تنگ کرے۔

میاں کا نام نوخیز اختر تھا۔ ایک کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔ اُس کرسی پر جہاں بیٹھ کر اپنے سے نیچے کام کرنے والوں کو وہ جب چاہے ڈانٹ سکتا تھا لیکن جو اِس سے اوپر والی کرسی پر براجمان تھے، وہ بھی ڈانٹنے کے معاملے میں اپنی مرضی کے مالک تھے لیکن نوخیز نے اپنے سے اوپر والوں سے اچھی بنا کر رکھی تھی۔ نوخیز کی بیوی کا نام کرن تھا۔ اُس کی دو عادتیں بڑی واضح تھیں۔ ایک یہ کہ وہ دوسرے کو بولنے کا پورا موقع دینے کی بجائے اُس کی بات درمیان سے ہی پکڑ لیتی تھی اور جب اُسے کوئی بات سمجھائی جاتی تو اِسے سمجھنے میں دیر لگا دیتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کی عادات میں یہ عادت بھی مشترکہ تھی کہ دونوں کو اپنے گھر اور اپنی ذاتی زندگی سے پیار تھا جس میں وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اِن کے گھر میں ایک نوکر لڑکا تھا۔ اِس کی عمر پچیس سال سے کم اور بیس سال سے زیادہ تھی۔ اُس کا نام باقر تھا۔ وہ گھر کی صفائی، پکوائی اور سودا سلف لانے میں اِس قدر مصروف رہتا تھا کہ اکثر و بیشتر اُس سے کام اُلٹے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ نوخیز اور کرن اپنے نوکر کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

وہ شام کسی محبوبہ کی زُلف کی طرح بہت خوبصورت تھی۔ کرن اپنے کمرے سے ہاتھ میں رسالہ پکڑے آئی اور باقر کو آواز دی۔

''باقر---باقر---!''

باقر کچن میں مصروف تھا وہ ہاتھ میں بیلن پکڑے بھاگتا ہوا باہر آ گیا اور بولا۔

''جی، بی بی جی---!''

باقر کے ہاتھ میں بیلن دیکھ کر کرن نے متحیر نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گھر میں کوئی گھس آیا ہے کیا؟''

''کون گھر میں گھس آیا ہے اور کیسے گھس آیا ہے؟'' باقر نے جلدی سے پوچھا۔

''مَیں تم سے پوچھ رہی ہوں۔'' کرن نے کہا۔

''آپ نے پوچھا ہے، مَیں سمجھا آپ بتا رہی ہیں۔ ویسے آپ نے مجھ سے کیوں پوچھا ہے؟'' باقر نے کہا۔

''تمہارے ہاتھ میں بیلن دیکھ کر۔'' کرن نے بیلن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو مَیں روٹیاں پکا رہا تھا۔'' باقر نے جواب دیا۔

''اچھا یہ رکھو۔''

کرن نے اُسے رسالہ دیا اور خود صوفے پر بیٹھ کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ باقر شیلف میں بیلن رکھ دیتا ہے اور رسالہ لے کر کچن کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اچانک وہ رسالہ ہاتھ میں دیکھ کر واپس پلٹتا ہے اور رسالہ وہاں رکھ کر بیلن اُٹھا کر کچن میں چلا جاتا ہے۔ اِسی اثنا میں نوخیز

ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے جبکہ دوسرے بازو پر کوٹ لٹکائے اندر آتا ہے جبکہ اُس نے ایک کوٹ پہن بھی رکھا ہے۔

"السلام علیکم۔"

نوخیز نے اندر آتے ہی کہا اور بریف کیس ایک طرف رکھا ہی تھا کہ کرن نے اُس کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"تم آج دو کوٹ پہن کر گئے تھے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میرا آفس کسی برفانی علاقے میں ہے؟" نوخیز مسکرایا۔

"یہ کوٹ کس کا ہے؟" کرن نے پوچھا۔

"میری کمپنی کے جی ایم صاحب ہیں' اُن کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ میں اُنہیں گھر تک لفٹ دے کر ہی آ رہا ہوں۔" نوخیز نے بتایا اور کوٹ کرسی کے ہتھے پر رکھ دیا۔

"اور جی ایم صاحب نے تمہیں لفٹ دینے کے بدلے اپنا یہ کوٹ دے دیا؟" کرن نے پوچھا۔

"تم بھی کبھی کبھی کمال کر دیتی ہو' اُن کا یہ کوٹ میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔" نوخیز نے کہا۔

"یہ کتنی بُری بات ہے کہ تم نے اُنہیں بتایا نہیں اور اُن کا کوٹ گھر لے آئے۔" کرن نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کرن! وہ دن کب آئے گا جب تم کسی بھی بات کو جلد سمجھ جایا کرو گی اور دوسرے کی بات کو بیچ سے نہ پکڑا کرو گی---؟" نوخیز نے کہا۔ "یہ کوٹ جی ایم صاحب کا ہے جو کہ میری کار میں رہ گیا تھا' کل آفس جاتے ہوئے لے جاؤں گا۔"

"تب تک ہم اس کوٹ کا کیا کریں گے؟" کرن نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"تب تک ہم اِس پر کوئی اچھی سی مووی دیکھیں گے---" نوخیز نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کرن! ہم اِس کوٹ کو الماری میں رکھ دیں گے۔"

اِس کے ساتھ ہی نوخیز نے باقر کو آواز دی' وہ بھاگتا ہوا آ گیا۔

"جی' صاحب جی!" باقر نے کہا۔

نوخیز نے کوٹ اُٹھا کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لو---"

باقر نے مسکرا کر مشکور نگاہوں سے کہا۔ "صاحب جی! اِس کی کیا ضرورت تھی۔"

"اِسے الماری میں رکھ دو' یہ میرے جی ایم صاحب کا کوٹ ہے۔" باقر کی طرف دیکھ کر نوخیز نے جلدی سے کہا۔

باقر کے چہرے پر آئی خوشی یکدم معدوم ہو گئی۔ وہ کمرے کی طرف جانے لگا تو کرن نے کہا۔

"باقر! ہم اپنے کمرے میں جا رہے ہیں' کھانا تیار ہو جائے تو آواز دے دینا۔"

باقر نے یکدم رُک کر حیرت سے پوچھا۔ "لوگوں کو بانٹنے کے لئے؟"

کرن نے رُک کر وضاحت کی۔ "ہمیں آواز دے دینا تا کہ ہم آ کر کھا لیں۔"

نوخیز اور کرن جس سے سب سے زیادہ اچیرن رہتا تھا' وہ اُن کا ہمسایہ اسلم ٹوانہ تھا۔ اسلم ٹوانہ کی توند باہر نکلی ہوئی تھی' چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی تھی جیسے جب سے گلا خراب ہوا ہے اور اِس نے دوائی لینا گوارا نہیں کیا ہو۔ اِس کا گھر اُن کے برابر میں تھا۔ وقت بے وقت وہ اُن سے کوئی چیز مانگنے کے لیے بُرے وقت کی طرح ٹپک پڑتا تھا۔ نوخیز کے آنے سے پون گھنٹہ کے بعد وہ بھی اُن کے گھر آ گیا۔ باقر نے اُسے اندر لے جا کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیے۔"

"بیٹھنے کے لئے ٹائم نہیں ہے' تم جلدی سے نوخیز کو بلا دو۔ کہاں ہے نوخیز اور جہاں ہے' وہاں کیوں ہے وہ؟"

نوخیز کو کیا پتہ تھا کہ باہر اسلم ٹوانہ آیا ہوا ہے۔ وہ کمرے سے باہر نکلا تو اُس کی نگاہ جیسے ہی اِس پر پڑی وہ گھبرا کر بولا۔

"ارے آپ؟"

"اچھا ہوا کہ آپ مجھے مل گئے۔ مجھے بہت جلدی ہے' میری بیوی کار میں بیٹھی میرا اِنتظار کر رہی ہے---"

"پہلے تو وہ گھر میں بیٹھ کر آپ کا اِنتظار کیا کرتی تھی؟" نوخیز نے کہا۔

"دراصل ہم ایک شادی میں جا رہے ہیں' مجھے آپ کا کوٹ چاہیے۔" اسلم ٹوانہ نے فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے کوٹ کا شادی سے کیا تعلق ہے؟" نوخیز نے کہا۔

اسلم ٹوانہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسا۔ "دراصل میرے پاس دو ہی کوٹ ہیں۔ میرے عزیز رشتے داروں کو وہ ایسے ہی یاد ہیں جیسے بچوں کو دو کا پہاڑا یاد ہوتا ہے۔ اِس بار میں نیا کوٹ پہن کر جانا چاہتا ہوں۔"

"اسلم ٹوانہ صاحب! آپ تو کوٹ کے بغیر ہی بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں۔" نوخیز نے کوٹ نہ دینے کے اِرادے سے جھوٹی تعریف کا تیر پھینکا۔

پنجاب اور سرحد میں یہ فرق ہے کہ پنجاب میں وزیرِاعلیٰ ہوتا ہے اور سرحد میں وزیرِاعلیٰ "ہوتی" ہے ☺ توصیف احمد

"لیکن میری بیوی کی رائے آپ سے بہت مختلف ہے۔ آپ مجھے جلدی سے اپنا نیا کوٹ دے دیں' مجھے شادی ہال میں جانا ہے۔ جلدی کر دیں بس۔" اسلم ٹوانہ نے اُس کی تعریف کی پرواہ کیے بغیر کہا۔

"اسلم ٹوانہ صاحب! آج کل کوٹ پہننے کا کوئی رواج نہیں ہے۔" ایک بار پھر نوخیز نے بچنے کی کوشش کی۔

"اچھا تو پھر آپ سارے اپنے کوٹ مجھے دے دیں' مجھے کوٹ پہننے کا بہت شوق ہے۔" وہ ہنسا۔

"میرا مطلب ہے کہ---" نوخیز نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

"آپ کا مطلب میں کسی دن آ کر سمجھوں گا۔ آپ مجھے اپنا کوٹ لا دیں' میری بیوی گاڑی میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ انتظار کرتی ہوئی بیوی کتنی خطرناک ہو جاتی ہے' اس کا اندازہ وہ کر سکتا ہے جو شادی شدہ ہے یا پھر کوئی کسی شادی شدہ کو دیکھ رہا ہو۔" اسلم ٹوانہ نے کہا۔

"لیکن---" نوخیز نے پھر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

"باتوں کے لیے وقت نہیں ہے' آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔" اسلم ٹوانہ نے کہا اور نوخیز کو اُس کے کمرے کی طرف گھما دیا۔ نوخیز مجبوراً کمرے میں گیا تو چہرے پر اُلجھن دیکھ کر کرن نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"کسے---؟" نوخیز نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں---" کرن نے کہا۔

"اسلم ٹوانہ آیا ہے' ہمارا ہمسایہ۔ میرا کوٹ مانگ رہا ہے۔" نوخیز نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" کرن نے لاپروائی سے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ میں اپنے کپڑے کسی کو نہیں دیتا ہوں۔" نوخیز نے کہا۔

"لیکن وہ تو تمہارا کوٹ مانگ رہا ہے' کپڑے تھوڑی مانگ رہا ہے۔" کرن نے جھٹ سے کہا۔

"ایک ہی بات ہے---اَب میں کیا کروں؟" نوخیز سوچنے لگا۔

"اَب وہ آ گئے ہیں تو تم اُنہیں کوٹ دے دو۔" کرن نے کہا۔

"میں اُنہیں اپنا کوٹ نہیں دوں گا۔" نوخیز نے کسی بچے کی طرح ضد کی۔

"پھر تم اپنے جی ایم کا کوٹ دے دو' صبح تک واپس کر دے گا۔" کرن نے جیسے اُس کی مشکل آسان کر دی ہو۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" نوخیز نے کہا۔

کرن خوش ہو کر بولی۔ "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں تمہاری کتنی اچھی مشیر ہوں۔"

"اِس سے پہلے بھی میں نے تمہارے ایک مشورے پر عمل کیا تھا اور میری نوکری جاتے جاتے رہ گئی تھی۔" نوخیز نے کہا۔

"اُس وقت تو تمہارے ستارے گردش میں تھے۔" کرن نے اپنی جان چھڑائی۔

اسلم ٹوانہ زیادہ انتظار نہیں کر سکا اور وہ دروازے سے باہر کھڑا ہو کر اُسے یوں آوازیں دینے لگا جیسے دودھ والا آ گیا ہو۔

"نوخیز ہاؤ! جلدی کرو' میری بیوی کی مس کالیں آ رہی ہیں۔"

نوخیز اپنے جی ایم کا کوٹ اُٹھا کر اُس کے پاس لے گیا۔ کوٹ دیکھتے ہی اسلم ٹوانہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات!"

"یہ صبح دفتر جانے سے پہلے مل جائے گا؟" نوخیز نے پوچھا۔

"میں جیسے ہی شادی سے فارغ ہوں گا' سیدھا آپ کے پاس آ جاؤں گا۔" اسلم ٹوانہ نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"اس پر کوئی داغ نہ لگے۔ اگر آپ سے کھاتے ہوئے سالن کپڑوں پر گر جاتا ہے تو آپ کوٹ کھانے سے پہلے اُتار لیجئے گا۔" نوخیز نے تاکید کرنے کے انداز میں کہا۔

"فکر کی بات نہیں ہے' میں کھاتے وقت وہ باندھ لیتا ہوں' کیا کہتے ہیں اُسے' وہ جو بب سا ہوتا ہے۔"

یکدم اُس کے موبائل فون کی گھنٹی یوں بجی جیسے بیگم نے چنگھاڑ کر آواز دی ہو۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"میں چلتا ہوں' اِس بار بیوی کی مس کال میں بڑا غصہ ہے۔"

یوں اسلم ٹوانہ نوخیز کے جی ایم کا کوٹ پہن کر چلا گیا۔

☆☆

نوخیز آرام کرسی پر براجمان رسالہ پڑھ رہا تھا جب کرن نے اندر آتے ہی کہا۔

"نوخیز! آؤ کہیں باہر گھوم کر آتے ہیں۔"

"ابھی---اِس وقت؟" نوخیز کی نگاہیں رسالے پر مرکوز تھیں۔

"اِس وقت کیا ہے؟" کرن نے اُس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اچانک ہم باہر کیسے جا سکتے ہیں؟" نوخیز نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔

"ہم اچانک باہر کیوں نہیں جا سکتے؟ ہماری مرضی ہے' ہمارا جب دل چاہے ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔" کرن نے کہا۔

''باہر جانے کے لئے پہلے پلاننگ کرنی پڑتی ہے' بجٹ بنانا پڑتا ہے' اس کے بعد باہر جانے کے لئے سوچا جاتا ہے۔'' نوخیز نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''تم کس باہر کی بات کر رہے ہو؟'' کرن نے اُس کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''باہر مطلب' یورپ امریکہ وغیرہ۔'' نوخیز نے وضاحت کی۔

''میں گھر سے باہر جانے کی بات کر رہی ہوں' آؤٹنگ کے لئے۔'' کرن نے کہا۔

نوخیز کھسیانے انداز میں ہنسا۔ ''اچھا تو تم گھر سے باہر جانے کی بات کر رہی ہو۔''

''نوخیز! تم بات بہت دیر سے سمجھتے ہو۔'' کرن نے کہا۔

''لیکن میرا تو باس کہتا ہے کہ تم کوئی بات بہت جلدی پک کر لیتے ہو۔'' نوخیز نے جلدی سے کہا۔

''وہ کہہ سکتا ہے کیونکہ وہ تمہارا باس ہے۔'' کرن بولی۔

اِسی اثنا میں فون آ گیا اور نوخیز نے جلدی سے فون اُٹھاتے ہی کہا۔

''نوخیز! بول رہا ہوں۔''

''نام بتانے کی بھلا کیا ضرورت ہوتی ہے' تمہارے بولنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ تم بول رہے ہو۔'' کرن نے کہا۔

نوخیز نے فوراً ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کرن کو بتایا۔

''میرا جی ایم ہے۔''

پھر وہ فون پر محض ''جی سر' جی سر'' کہنے کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ کرن اُس کی طرف حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔ جونہی فون بند ہوا' نوخیز نے پہلے اپنے ماتھے کا پسینہ صاف کیا حالانکہ وہاں پسینہ نہیں تھا' ایک نفسیاتی اثر تھا۔

''کیا ہوا؟'' کرن نے پوچھا۔

''جی ایم صاحب کا فون تھا' اُن کے کوٹ کی جیب میں دس ہزار ڈالر ہیں۔'' نوخیز نے بتایا۔

''دس ہزار ڈالر اور وہ بھی کوٹ کی جیب میں؟'' کرن نے کہا۔

''بندے کے پاس پیسے ہوں تو وہ اُنہیں جیب میں ہی رکھتا ہے۔ اُنہوں نے کسی کو دینے تھے اور جس کو دینے تھے' وہ اُن کے گھر بیٹھا ہوا ہے۔ جی ایم صاحب کوٹ لینے کے لئے آ رہے ہیں۔'' نوخیز نے ایک بار پھر پسینہ صاف کیا۔ اِس بار پسینہ آ گیا تھا۔

''تم اُن کو بتا دیتے کہ آپ کا کوٹ ہمارا ہمسایہ مانگ کر لے گیا ہے۔'' کرن نے لاپروائی سے کہا۔

''کرن! تم چاہتی ہو کہ مَیں نوکری سے فارغ ہو جاؤں؟ مَیں ابھی اسلم ٹوانہ کے پاس جاتا ہوں اور اُس سے کوٹ واپس لے کر آتا ہوں۔ اگر جی ایم صاحب آ جائیں تو تم اُن کو باتوں میں لگا کر رکھنا۔''

''مَیں اُن کو کون سی باتوں میں لگاؤں اور مجھے اِتنی باتیں کہاں آتی ہیں' مَیں اُنہیں کارٹون والا چینل لگا دوں گی۔'' کرن نے یوں کہا جیسے واقعی اُسے باتیں آتی ہی نہیں ہیں۔

''کرن! میرا جی ایم آ رہا ہے' اُس کا نتھا پوتا نہیں آ رہا ہے ---- مَیں جا رہا ہوں' باقر کو باہر گیٹ پر کھڑا کر دو۔ جیسے ہی جی ایم صاحب آ ئیں' وہ اُنہیں اندر لے آئے۔'' نوخیز کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

☆☆

اسلم ٹوانہ بے فکر شادی ہال میں اپنے عزیز رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مشغول تھا اور صبح سویرے اُٹھ کر کون پہلے کیا کرتا ہے' اِس پر وہ روشنی ڈال رہے تھے۔

''واہ بھئی' واہ کمال ہو گیا۔ میرے لیے صبح سویرے جاگنگ پر جانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔'' اسلم ٹوانہ نے کسی بات پر ہنسنے کے بعد کہا۔

''اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ مَیں تو جب تک بیڈ ٹی نہ پی لوں' مجھے لگتا ہی نہیں ہے کہ صبح ہو گئی ہے۔'' ایک اور نے کہا۔

''میری عادت ہے سب سے پہلے اخبار دیکھنے کی' اخبار دیکھا اور سُستی غائب۔'' دوسرے نے کہا۔

''بھئی' ہم تو صبح سویرے اپنی بیوی دیکھتے ہیں اور مزید سُست ہو جاتے ہیں۔'' اسلم ٹوانہ کی اِس بات پر قہقہوں کی پھلجھڑی سی لگ گئی۔

''ویسے اسلم ٹوانہ صاحب! آپ بھی کوئی اخبار پسند کرتے ہیں؟'' ایک نے پوچھا۔

''بھئی' مجھے تو وہ اخبار بہت اچھا لگتا ہے جس میں کوئی مزیدار کھانے کی چیز لپیٹ کر آئے۔''

اسلم ٹوانہ نے کہا اور سب ہی ہنسنے لگے۔ بے خیالی میں ہنستے ہوئے اسلم ٹوانہ کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں چلا گیا اور یکدم اُس کی ہنسی یوں رُک گئی جیسے ریڈ سگنل آ گیا ہو۔ اُس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اُس کے ہاتھ میں ڈالر تھے۔ وہ تو حیران تھا ہی' اُس کے پاس بیٹھے ہوئے اپنی اپنی ہنسی بھول کر اِن ڈالروں کو یوں دیکھنے لگے جیسے بغیر میک اَپ کے کوئی اپنی بیوی کو کچھ کہنے سے پہلے تسلی سے دیکھ رہا ہو۔

☆☆

نوخیز کا جی ایم اُڑتا ہوا گھر پہنچ گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں' ہاتھوں میں ایک عجیب سی بے چینی تھی' پورے جسم میں جیسے خون کے ساتھ اضطراب دوڑ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی پہلے یہ تسلی کی کہ اُس کے سامنے جو عورت کھڑی ہے' وہ نوخیز کی بیوی ہی ہے۔ اِس کے بعد اُس نے جیسے تقاضا شروع کردیا کہ جلدی سے نوخیز کو بلاؤ۔ وہ بار بار یہی رَٹ لگائے ہوئے تھا کہ نوخیز کو اِس کے سامنے لے آؤ۔ نوخیز تو سرپٹ بھاگتا ہوا اسلم ٹوانہ کے پاس کوٹ لینے پہنچ گیا تھا۔

''آپ بہت پریشان ہیں' کوئی گھریلو پریشانی ہے؟'' کرن نے پوچھا۔

''مجھے کوئی گھریلو پریشانی نہیں ہے کیونکہ میں فلیٹ میں رہتا ہوں۔'' جی ایم نے کہا۔

''آپ چائے پیجئے' ہمارے گھر چائے بہت اچھی بنتی ہے۔'' کرن نے کہہ کر باقر کو آواز دی۔ ''باقر۔۔۔۔!''

''دیکھیں چائے ٹھیک ہے۔ چائے کے ساتھ باقر خانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' جی ایم نے کرن کی بات کاٹ کر کہا۔

''باقر ہمارے نوکر کا نام ہے۔'' کرن بولی۔

باقی پانچ منٹ میں چائے لے آیا۔ اِن پانچ منٹوں میں بھی جی ایم اس قدر پریشان اور مضطرب رہا جیسے میٹرک کا امتحان دینے والا طالب علم بے چینی کی کیفیت میں اپنا رول نمبر لسٹ میں متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔

''ابھی تک نوخیز نہیں آیا ہے' مجھے دال میں کالا لگ رہا ہے۔'' جی ایم نے ایک گھونٹ چائے کا لے کر کہا۔

اُس کی بات سنتے ہی کرن نے جلدی سے باقر کو آواز دے کر بلالیا اور کہا۔

''میں نے کہا تھا کہ تم چائے بنا کر لاؤ اور تم دال بنا کر لے آئے ہو اور اُس میں بھی کچھ کالا ہے؟''

باقر نے سنا تو تصدیق کے لیے اس عجلت کا مظاہرہ کیا کہ اُس نے جی ایم کے ہاتھ سے اُس وقت چائے کا کپ پکڑ لیا جب وہ کپ اپنے منہ کی طرف لے جارہے تھے۔

باقر ی نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا' خیرہ نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے جی ایم کے ہاتھ میں دوبارہ چائے کا کپ دے کر اطمینان سے کہا۔

''بی بی! دال نہیں چائے ہی ہے۔''

''سر! آپ کو غلطی لگی ہے یہ چائے ہی ہے اور جسے آپ کالا کالا کہہ رہے ہیں' وہ چائے کی پتی ہوگی۔'' کرن نے بھی باقر کی تصدیق کو حرف آخر جان کر جی ایم صاحب سے کہا۔

جی ایم نے چائے کا کپ غصے سے ایک طرف رکھا اور اُٹھ کر کہا۔

''اَب آپ نوخیز کو بلا ہی لیں ورنہ میں ایسے معاملات میں پولیس کو ملوث کرلیا کرتا ہوں۔''

پولیس کا نام سنتے ہی کرن گھبرا گئی۔

☆☆

نوخیز سیدھا اسلم ٹوانا کے پاس شادی ہال میں جا پہنچا تھا اور اُس نے ساری بات اسلم ٹوانہ کے گوش گزار کردی۔

''یہ بات تھی تو آپ مجھے پہلے بتا دیتے۔'' اسلم ٹوانہ نے بات سننے کے بعد کہا۔

''پھر آپ کیا کرتے؟''

''اِس وقت بھی میں کچھ نہ کرتا۔''

''اِس وقت آپ یہ کیجئے کہ یہ کوٹ اُتار کر فوراً مجھے دے دیں' اس میں دس ہزار ڈالر ہیں۔''

''ایک ہزار ڈالر تو میں نے سلامی میں دے دیا تھا۔''

''ایک ہزار ڈالر سلامی دے دیا؟'' نوخیز کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''جب میں نے ایک ہزار ڈالر سلامی کا دولہا کو دیا تو اُس کے ابا نے دیکھ کر کہا کہ ٹوانہ جی! مذاق بند کریں اور اصل نوٹ دیں تب میں نے پانچ سو روپیہ سلامی کا دیا تو دولہا کا اَبا خوش ہوگیا۔''

''اَب آپ یہ کوٹ اُتار کر مجھے دے دیجئے۔''

''میں کوٹ اُتار کر نہیں دے سکتا' میری عزت خراب ہوجائے گی۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں نے جس سے کوٹ مانگ کر پہنا تھا' وہ آ کر لے گیا۔''

''کوٹ تو آپ کو اُتارنا ہوگا۔ میرے جی ایم صاحب میرے گھر بیٹھے میرا اِنتظار کررہے ہیں۔''

''یہ نہیں ہوسکتا' اس سے میری بے عزتی ہوجائے گی۔''

''اور اگر میں کوٹ نہ لے کر گیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔''

''آپ اپنی نوکری کو اِتنی چھوٹ مت دیں کہ اُس کا جب دل چاہے وہ کہیں بھی چلی جائے۔''

''آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''آپ بھی بات کو سمجھیں۔ آپ دس ہزار ڈالر لے جائیں' کوٹ بعد میں لوٹا دیجئے گا۔''

"ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر ویسا بھی نہیں ہو سکتا۔"

اسلم ٹوانہ نے دوٹوک کہا اور نوخیز اُس کی طرف اِس طرح سے بے بسی سے دیکھنے لگا جیسے ایک بچہ قلفی کھا رہا ہو اور دوسرے کو مانگنے پر بھی نہ ملے۔

☆☆

جی ایم صاحب کی پریشانی دیدنی تھی' وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کرن کی کوشش تھی کہ باتوں کے دوران نوخیز آ جائے۔

"کمال ہے ابھی تک نوخیز کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ آخر وہ کمرے میں کر کیا رہا ہے' کس چیز نے اُسے کمرے میں اندر روک رکھا ہے' بات کیا ہے---؟" جی ایم نے ایک ایک بات اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہے---باقر اتم چائے لے کر آؤ۔"

"آپ بار بار میرے لیے چائے منگوا رہی ہیں' مَیں نے ٹرک چلا کر سوات لے کر جانا ہے؟"

"آپ پارٹ ٹائم ٹرک بھی چلاتے ہیں؟" کرن نے متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

"ابھی نوخیز کو باہر بلائیں ورنہ یہاں ایک ہنگامہ ہو جائے گا۔ میری کار میں ایک ٹائر پڑا ہوا ہے' مَیں اسے آگ لگا دوں گا۔" جی ایم کی بے چینی دوچند ہو گئی۔

"ٹائر نے آپ کا کیا بگاڑ دیا ہے کہ آپ اُسے آگ لگا دیں گے؟" کرن نے اُس کی طرف دیکھا۔

"لگتا ہے مجھے پولیس بلانی ہی پڑے گی۔" جی ایم نے کہا اور اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے موبائل تلاش کرنے لگا۔ "مَیں موبائل گھر بھول آیا ہوں' پولیس کا نمبر میں نے اُس میں فیڈ کیا ہوا ہے۔"

"پندرہ نمبر ملائیں' پندرہ نمبر۔" اندر سے باقر نے جھانک کر کہا۔

"کرن نے گھور کر باقر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آپ تشریف رکھیں' مَیں نوخیز کو بلاتی ہوں۔"

"دس منٹ میں نوخیز آ جائے ورنہ---"

"ورنہ کیا---؟"

"ورنہ مَیں مزید دس منٹ انتظار کروں گا اور پھر---" جی ایم کا چہرہ خطرناک ہو گیا۔

☆☆

اسلم ٹوانہ اِس طرح سے کوٹ دینے کے لیے کسی بھی صورت تیار نہیں تھا' نوخیز نے ہر طرح سے کوشش کر لی تھی۔ کرن کا بار بار فون آ رہا تھا۔ آخری بار کرن نے کہہ دیا تھا کہ کسی بھی طرح سے آپ کوٹ لے آئیں۔ اگر اسلم ٹوانہ کو کوٹ سمیت اُٹھانا پڑے تو اِس سے بھی گریز نہ کریں۔ آخر کار نوخیز نے اسلم ٹوانہ سے کہا۔

"اَب مَیں کیا کروں؟"

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے' اِس سے میری بھی عزت رہ جائے گی اور آپ کا کام بھی ہو جائے گا۔"

"وہ کیا ہے؟"

"مَیں کوٹ اُتار کر اِس کرسی پر رکھتا ہوں اور اپنے بال ٹھیک کرنے لگ جاتا ہوں' آپ کوٹ اُٹھا کر بھاگ جائیں۔ اِس طرح کوئی یہ نہیں کہے گا کہ مَیں جس سے کوٹ مانگ کر لایا تھا وہ لے کر بھاگ گیا ہے بلکہ سب کہیں گے کہ میرا کوٹ کوئی اُٹھا کر بھاگ گیا ہے' کیسا؟"

"آپ نے میرے لیے مشکل کھڑی کر دی ہے۔" لاچار نوخیز بولا۔

"مَیں نے آسانی کا راستہ تلاش کیا ہے۔"

"جب مَیں کوٹ اُٹھا کر بھاگوں گا اور اگر مَیں پکڑا گیا تو؟"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے' اِس وقت سب کے کان اور نظریں اِس شخص پر لگی ہوئی ہیں جس نے روٹی کھولنے کی آواز دینی ہے۔ کوٹ اُٹھا کر جب آپ دروازے تک پہنچ جائیں گے تو مَیں ہلکی سی آواز دوں گا بس' آپ نکل جانا۔"

"آواز ہلکی سی ہی دینا۔" نوخیز لاچار بولا۔

اِس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اسلم ٹوانہ سے کوٹ لیتا۔ گھر میں جی ایم مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا۔

نوخیز کی حامی سے اسلم ٹوانہ نے اپنا کوٹ اُتار کر کرسی پر رکھا اور اپنے سر کے بال ٹھیک کرنے لگا۔ نوخیز نے سب کی طرف دیکھا کسی کی بھی نظر اِس طرف نہیں تھی' سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ نوخیز نے یکدم کوٹ اُٹھایا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک ویٹر نے دیکھتے ہی بلند آواز سے کہا۔

"پکڑو' وہ کوٹ لے کر بھاگ رہا ہے۔"

اِس آواز نے ایسا کمال کیا کہ نوخیز کے اُوپر ایک طرف کھڑے نوجوانوں کے ٹولے نے جست لگا دی۔ بے چارہ نوخیز سب سے نیچے یوں تھا جیسے گیارہ' بارہ افراد ایک ساتھ مفت کی مرغی پکڑ کر دعوتِ شیراز سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں۔

☆☆

زیست کی گلیاں

☆ منظور احمد اعوان

صُبح ہی صبح بلدیہ والوں نے منڈی پر دھاوا بول دیا تھا۔ منڈی میں کام کرنے والوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ جس کا جدھر کو سینگ سمایا' اُدھر کو بھاگا۔ اِسی افراتفری میں چاچا گل پکڑا گیا اور بھی بے شمار لوگ پکڑے گئے مگر مجھے افسوس صرف چاچا گل کے پکڑے جانے پر ہوا تھا کیونکہ اُس کے پکڑے جانے سے مَیں بے روزگار ہو گیا تھا---- یہاں مدینہ منورہ کی سبزی و فروٹ منڈی میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جس کے باعث یہاں کام کرنے والوں کو کبھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ یہ فریضہ تین محکموں نے سنبھالا ہوا ہے۔ کبھی بلدیہ' کبھی لجنہ اور کبھی جوازات والے چھاپہ مار دیتے ہیں۔ وہ صرف عمرہ والوں ہی کو نہیں پکڑتے ہیں بلکہ کئی اقامہ والے بھی اِن کے ہتھے چڑھ کر رگڑے جاتے ہیں۔ یہاں کے قوانین انتہائی سخت ہیں۔ اجنبی (غیر ملکی) بولی نہیں دے سکتا' مال نہیں بیچ سکتا' گاہک کو نہیں بلا سکتا' گاہک کو ریٹ نہیں بتا سکتا' گاہک سے قیمت وصول نہیں کر سکتا' اپنے کفیل کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس کام نہیں کر سکتا' وہ صرف اپنے کفیل کے لئے اُس کا بستہ (اڈہ) سیٹ کر سکتا ہے یا اُس کے لئے گاڑیوں پر مال لوڈ کر سکتا ہے یا گاڑیوں سے مال اُتار سکتا ہے۔ منڈی سے باہر بھی غیر ملکی مقیمین کے لئے ایسے ہی قوانین لاگو ہیں لیکن منڈی میں سختی زیادہ ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جاتی ہے' فوراً ہی اُس کا خروج (دیس نکالا) لگا دیا جاتا ہے۔ عمرہ پر آ کر کام کرنے والوں کو تو زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے' انہیں جلد سے جلد مملکت سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی اقامہ والا پھنس جائے تو اُس کی شامت آ جاتی ہے۔ اُسے حوالات میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں وہ کئی دِنوں یا مہینوں تک پڑا سڑتا رہتا ہے۔ اُس سے ٹکٹ کی رقم وصول کی جاتی ہے' چاہے وہ خود دے' اُس کا کفیل دے یا اُس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب چندہ کر کے دیں۔ پھر اُس کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کی جاتی ہے کہ آیا وہ کسی اور معاملے میں تو ملوث نہیں ہے؟ کارروائی مکمل ہونے پر ہی اُسے ڈی پورٹ کیا جاتا ہے تب تک اس کا حشر نشر ہو چکا ہوتا ہے کیونکہ یہاں حوالاتوں کی حالت انتہائی ابتر ہے۔ حوالات میں گنجائش سے کئی گنا زیادہ قیدی ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ اُن کے لئے صحیح طرح سے اُٹھنے' بیٹھنے اور لیٹنے کے لئے جگہ ناکافی ہوتی ہے' پھر ملاقات کے لئے بھی کوئی مناسب بندوبست نہیں ہوتا ہے۔

سختی کے باوجود منڈی میں قوانین کی صریح خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ اجنبی بولی دیتے ہیں' اپنے بستے لگتے ہیں' گاہکوں کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں' مال بیچتے اور رقم وصول کرتے ہیں' بس انہیں ذرا خبردار ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ وہ خود کو منڈی میں نہیں بلکہ محاذِ جنگ پر گمان کرتے ہیں۔ جونہی کسی خطرے کی بو کو سونگھتے ہیں' منڈی سے یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو وہ دوبارہ برساتی مینڈکوں کی مانند آن وارد ہوتے ہیں اور پھر سے اپنی اپنی بولیاں لگانے لگتے ہیں کیونکہ اِن کے بار بار کے پلٹنے جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے سے اُن کے کام کا حرج ہوتا ہے لہٰذا اُنہوں نے سعودی بھائیوں کو پچاس تا ستر ریال یومیہ (دیہاڑی) پر ملازم رکھا ہوا ہے جو بلا خوف و خطر اُن کے بستے چلاتے ہیں اور پوچھ تاچھ پر یقین بھی دلا دیتے ہیں کہ وہ سولہ آنے اپنا کام کر رہے ہیں۔

یہاں کی منڈی میں پاکستانی' بنگالی' یمنی اور سوڈانی کام کرتے

ہیں۔ کئی پاکستانی اور بنگالی بڑے بڑے تاجر ہیں اور لاکھوں میں کھیل کود رہے ہیں۔ نام کفیل کا چلتا ہے لیکن کام اِن کا اپنا ہوتا ہے۔ وہ کفیل کو بھی خوش رکھتے ہیں اور اپنا کام بھی چلائے رکھتے ہیں۔ جب پکڑے جاتے ہیں تو دے دلا کر چھٹکارا پا لیتے ہیں--- چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والوں میں عربیہ (ہاتھ ریڑھی) چلانے والے سرِفہرست ہیں۔ عربیہ کے ذریعے بولی پر خریدا گیا مال بستوں پر یا گاہکوں کا مال بستوں سے اُن کی گاڑیوں تک لے جایا جاتا ہے۔ ایک چکر کے تین ریال مل جاتے ہیں اور دن رات میں اتنے چکر لگتے ہیں کہ عربیہ والے گھن چکر بنے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کام یہاں پر مکمل طور پر سندھ کے شہر کندھ کوٹ والوں نے سنبھال رکھا ہے۔ اُن کی ڈھیلی ڈھالی پوشاکیں' شیشے کے کام والی چمکتی دمکتی ٹوپیاں' کاندھوں پر ٹنگی اجرکیں اور رومال اور اُن کا مٹک مٹک کر چلنا اُن کی خاص پہچان ہے۔ یہ سب سے زیادہ چوکس ہو کر رہتے ہیں۔ جب بھی یہ اپنی اپنی عربیہ چھوڑ کر بھاگنا دوڑنا شروع کر دیں تو سمجھو خطرہ سر پر آن پہنچا ہے' یعنی جس بلائے ناگہانی نے آنا تھا' آ گئی ہے۔

وطنِ عزیز کے یہ جیالے ویزہ پر آنے کا تکلف نہیں کرتے ہیں۔ عمرہ پر آتے ہیں' عمرہ کریں یا نہ کریں البتہ جان توڑ ''محنت'' ضرور کرتے ہیں اور ریال سمیٹتے ہیں۔ یوں ملک و قوم کا نام خوب ''روشن'' کرتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں اور سستانا چاہتے ہیں تو پکڑائی (گرفتاری) دے دیتے ہیں۔ وہ اپنے پاس پاسپورٹ یا کوئی دوسری شناختی چیز رکھنے کی زحمت نہیں کرتے ہیں۔ اُن کے بتائے گئے کسی فرضی نام سے اُن کا آؤٹ پاسپورٹ بنتا ہے' پھر اُنہیں سرکاری خرچ پر وطن کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ چند ماہ بعد جب اُنہیں سرزمینِ حجاز کی یاد ستاتی ہے تو تازہ دم ہو کر کسی نئے نام اور نئی شناخت سے عمرہ کا ٹکٹ لگوا کر دوبارہ یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر دل لگا کر کام میں جت جاتے ہیں' یوں اُن کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

یوں تو یمنی اور سوڈانی بھی عمرہ پر آتے ہیں اور کام میں لگ جاتے ہیں لیکن ہمارے سندھی بھائیوں نے اس معاملے میں سب کو مات دے رکھی ہے' چند کالی بھیڑوں کا تعلق پنجاب سے بھی ہے--- کچھ اقامہ ہولڈر بھی عربیہ کا کام کرتے ہیں۔ یہاں عربیہ کے بارے میں ایک لطیفہ نمایاں مشہور ہے' آپ بھی سن لیں۔

پیر بخش عرف پیرل ویزہ پر سعودی عرب آیا تھا۔ اُس کے گھر سے خط آیا کہ یہاں گاؤں والے پوچھتے ہیں کہ تم وہاں کون سا کام کرتے ہو؟ پیرل نے جواب میں لکھوایا کہ میں یہاں سبزی منڈی میں عربیہ چلاتا ہوں۔ گھر والے یہ جواب پا کر خوشی سے پھولے نہ سمائے (اُنہوں نے عربیہ کو کوئی بڑی سی گاڑی سمجھ لیا تھا) پھر وہ ہر ایک سے بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہمارا حاجی پیرل' سعودی عرب میں عربیہ چلاتا ہے--- سننے والے دانتوں میں اُنگلیاں دبا لیتے۔ وہ حیران ہو کر سوچتے تھے کہ یہاں گدھا گاڑی چلانے والا پیرل وہاں عربیہ کیسے چلانے لگا ہے؟--- پکڑ دھکڑ کے دوران کئی دلچسپ اور عجیب واقعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چند ایک آپ بھی ملاحظہ کر لیں۔''

رمضو' عمرے پر آیا تھا۔ ایک بستے پر کام کرتا تھا۔ وہ تنور سے ایک چپاتی لگوا کر لا رہا تھا (یہاں کی چپاتی اِتنی بڑی ہوتی ہے کہ اِسے کھا کر دو آدمیوں کا پیٹ آسانی سے بھر جاتا ہے) اُس نے لبن زبادی (دہی) کا ڈبہ بھی شاپر میں لٹکایا ہوا تھا۔ گرما گرم چپاتی گتے کے ایک ٹکڑے پر تھی اور گتا اُس کے ہاتھوں پر تھا۔ ابھی وہ بیٹھنے کے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ رہا تھا کہ سکون سے کہیں بیٹھ کر پیٹ پوجا کر سکے کہ یکا یک ایک شرطے (سپاہی) نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہات اقامہ---'' (اقامہ دِکھاؤ) اُس نے رُعب سے کہا۔

''اچھا دِکھاتا ہوں---'' رمضو نے گھبرا کر کہا۔ ''تم ذرا یہ چپاتی سنبھالو میں جیب سے اقامہ نکالتا ہوں۔''

شرطے کو اُس کا اقامہ دیکھنے کا شوق تھا لہٰذا اُس نے چپاتی لینے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ رمضو نے جان بوجھ کر گتہ گرا دیا اور گرما گرم چپاتی اُس کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ شرطے کے ہاتھ جلنے لگے تھے۔ رمضو نے اُسے دِکھانے کو جیب میں ہاتھ ڈالا' پھر اچانک ہی ایک جانب کو سرپٹ دوڑ پڑا۔ شرطہ بے چارا گرم چپاتی تھامے بے بسی کی تصویر بنا اُسے دیکھتا ہی رہ گیا---لدّھا بھی عمرے پر آیا تھا' عربیہ چلاتا تھا۔ شرطے نے پکڑا تو اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا' ہائے کا نعرہ بلند کیا اور جھکتا ہی چلا گیا' پھر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ شرطے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ وائرلیس پر ایمبولینس کے لئے کہنے لگا۔ ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ یہ دیکھ کر دَم بخود رہ گیا کہ بے ہوش شخص اچانک اُٹھا اور اُٹھ کر بھاگ گیا--- کریمہ بھی عمرے والا تھا' وہ بھی عربیہ چلاتا تھا۔ ایک بار جو ازات کا ایک شرطہ اُس کے پیچھے لگ گیا۔ کریمن نے اُسے خب دوڑایا' غچے دیے مگر اس نے جان نہ چھوڑی۔ کریمن کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ سیدھا مسجد میں جا گھسا۔ شرطہ بھی اُس کے تعاقب میں مسجد میں داخل ہو گیا۔ دونوں میں دو گز کا فاصلہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ قریب تھا کہ شرطہ ہاتھ بڑھا کر اُسے گرفتار کر لیتا' اُس نے یک دَم ''اللہ اکبر'' کہا اور ہاتھ باندھ کر نماز شروع کر دی حالانکہ وہ کوئی نماز کا وقت نہیں تھا۔ شرطہ غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وہ قریب ہی بیٹھ گیا تا کہ وہ نماز ختم کرے اور اُسے

پکڑ لیا جائے۔ اُس بھلے مانس نے پہلی رکعت ہی اتنی لمبی کھینچی کہ شرطہ بے چارا پریشان ہو گیا۔ کچھ دیر تو بیٹھا انتظار کی کوفت سہتا رہا اور اُس کی منت سماجت کرتا رہا کہ اللہ کے بندے! اَب بس بھی کرو---- مگر کریمن کے کان پر جوں تک نہ رینگی' وہ نہایت خشوع وخضوع سے نماز میں مشغول رہا۔ شرطہ تنگ آ کر اُٹھ گیا۔ کریمن نے جب دیکھا کہ شرطہ چلا گیا ہے تو کھڑے کھڑے سلام پھیر دیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ شرطہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا جتنا کہ اُس نے سمجھ لیا تھا۔ وہ دروازے کی اوٹ میں چھپا کھڑا تھا۔ جونہی وہ دروازے سے برآمد ہوا' شرطے نے اسے دبوچ لیا۔ یوں اُس کی جلد بازی اُسے لے ڈوبی۔

ایک بار ایک لجنہ والے نے ایک بنگالی کو پکڑ لیا۔ اُس نے بنگالی کی شرٹ کے کالر کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ بنگالی نے خود کو اُس کے چنگل سے چھڑانے کے لئے جھٹکا دیا' لجنہ والے نے اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔ دوسرے جھٹکے میں بنگالی شرٹ میں سے یوں نکل گیا جیسے جسم میں سے رُوح نکل جاتی ہے۔ وہ بھاگ گیا اور شرٹ بے جان لاشے کی طرح لجنہ والے کے ہاتھ میں ہی جھولتی رہ گئی۔ شرٹ کی تلاشی لی گئی تو سوائے چند ریالوں کے اُس میں سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا کیونکہ بنگالی نے اقامہ وغیرہ پینٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا---- بہرحال' چاچا گل نے پینٹ شرٹ نہیں پہنی تھی بلکہ توب (جبہ) پہنا ہوا تھا۔ اُس نے بھاگنے کی بہتیری کوشش کی تھی مگر اپنے ہی توب میں اُلجھ کر دو بار گرا اور یاروں کی گرفت میں آ گیا---- چاچا گل پچپن' ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ اُس کی شکل وصورت ہو بہو اُسامہ بن لادن سے ملتی تھی۔ میں کبھی کبھی خوفزدہ ہو کر سوچتا تھا کہ کسی روز چاچا کو اُسامہ اور مجھے اُس کا ساتھی سمجھ کر گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے نہ کر دیا جائے---- چاچا گل کا تعلق بہاولپور سے تھا۔ بہاولپور کے نواح میں اُس کی اچھی خاصی زرعی اراضی تھی' ٹیوب ویل تھا' ٹریکٹر تھا' آموں کا ایک باغ تھا اور کمانے والے شیر جیسے دو گھبرو بیٹے بھی تھے۔ وہ گھر میں بیٹھ کر "اللہ ہو---- اللہ ہو" کر کے زندگی کے باقی ایام آرام سے گزار سکتا تھا مگر بقول شخصے "ھل من مزید" کی حرص بندے کو سکون سے جینے نہیں دیتی ہے---- یوں ہی دُنیا کا مال سمیٹتے سمیٹتے بندے کا دَم نکل جاتا ہے اور سب کچھ یہیں دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

چاچا گل پہلی بار نہیں پکڑا گیا تھا' اُس کے ساتھ یہ حشر تیسری بار ہو رہا تھا۔ وہ پکڑا جاتا' چند روز سرکاری مہمان خانے (حوالات) میں اُس کی خاطرداری ہوتی' پھر وہ سرکاری خرچ پر پوری آن بان کے ساتھ پاکستان کو فلائی کر جاتا۔ چند ماہ بمشکل گزرتے تھے اور وہ عمرہ لگوا کر دوبارہ آ دھمکتا تھا---- یہاں منڈی میں اُس کی کافی جان پہچان تھی' وسیع کاروبار تھا۔ اُس کا سبزی کا بہت بڑا بستہ لگتا تھا۔ وہ منڈی کے بڑے بڑے تاجروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ چاچا گل حافظِ قرآن بھی تھا۔ آواز بے حد پُرمٹھاس اور پُرگداز تھی۔ ایک بار منڈی کی مسجد کے پیش امام کا دورانِ نماز وضو ٹوٹ گیا۔ اُس نے نمازیوں کو بے یار ومددگار چھوڑا اور وضو تازہ کرنے کے لئے چپکے سے حمام کی جانب کھسک گیا۔ بہت دیر بعد نمازیوں نے سجدے میں سے سر اُٹھایا تو امام کو غائب پایا' بیحد پریشان ہوئے۔ اس مشکل گھڑی میں چاچا گل ہی تھا جس نے

شادی کھانا بربادی!

ہماری پاکستانی شادیوں کے بھی عجیب قصے ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی شادی ایسی ہو جس میں کوئی نہ کوئی تماشا نہ ہوا ہو۔ کبھی دولہے کا ماموں ناراض ہے تو کبھی چچا کو منایا جا رہا ہے' یعنی کسی نہ کسی کو منایا جا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کو شادی بیاہ میں کافی سارے غریب لوگ ایک ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں جو بیچارے کافی دنوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ جو کھانا کھلتے ہی ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایسے کھانا کھا رہے ہوتے ہیں جیسے زندگی میں آخری دفعہ کھا رہے ہوں اور دوبارہ کھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ ارے بھئی آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ہم ان فقیروں کی بات نہیں کر رہے' جو شادی ہال کے باہر بیٹھے ہوتے ہیں بلکہ ہم تو شادی ہال کے اندر موجود ان باعزت مہمانوں کی بات کر رہے ہیں جو بیچارے شادی پر آنے سے پہلے کافی دن بھوکے رہتے ہیں تاکہ شادی کی تقریب میں خوب ڈٹ کر کھا سکیں۔ تھوڑی دیر پہلے جو لوگ بڑے باوقار نظر آتے ہیں' کھانا کھلتے ہی ان کی اصلیت سامنے آ جاتی ہے---- اکثر آنٹیاں تو اپنے معصوم بچوں کو زبردستی ٹھونس ٹھونس کر کھلا رہی ہوتی ہیں۔ بچے بیچارے اس وقت بڑے قابلِ رحم نظر آتے ہیں کیونکہ زیادہ کھانا کھانے کی وجہ سے اُن کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے' بعد میں ماؤں کو شکوہ ہوتا ہے کہ کھانا ٹھیک نہیں تھا ہمارے بچے بیمار ہو گئے۔ اکثر آنٹیاں خود بھی اتنا کھا لیتی ہیں کہ پھر ان سے اُٹھا بھی نہیں جاتا اور وہ سب سے کہہ رہی ہوتی ہیں کہ میں نے تو کچھ کھایا ہی نہیں کیونکہ آج کل میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں---- اکثر لوگ تو اپنے پورے خاندان کو شادی کی دعوت میں ساتھ لے آتے ہیں اور تو اور جو گھر میں مہمان آئے ہوتے ہیں جن کا اس شادی سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا' انہیں بھی ساتھ لے آتے ہیں تاکہ مہمانوں کا ایک دن کا کھانا تو بچ جائے۔ سلامی کے نام پر دو سو روپے دولہا کی جیب میں ڈال کر چھ ہزار کا کھانا کھا جاتے ہیں۔ دولہا والے بھی ایک سو باراتیوں کا کہہ کر تین سو باراتی ساتھ لے آتے ہیں پھر جب کھانا کم پڑ جاتا ہے تو شور مچ جاتا ہے۔ لڑکے کی ماں احتجاج کرتی ہے۔

"اے ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے' کیسے بھوکے ننگوں کے گھر بیٹا بیاہ دیا' جو بارات کو کھانا بھی پورا نہ دے سکے۔"

لڑکی والے بھی کچھ کم نہیں ہوتے کیونکہ انہیں بھی عین نکاح کے وقت شرائط منوانا یاد آتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اچھی زندگی کی بنیاد شرطوں پر نہیں رکھی جاتی---- بہرحال' یہ سب تو چلتا ہی رہے گا' کسی ایک کے بدلنے سے پورا انتظام نہیں بدلے گا کیونکہ جب تک ہر انسان اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھے گا حالات نہیں بدلیں گے۔ ہم تو یہی دُعا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتنی عقل دے کہ سب کو اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائے۔

ایس امتیاز احمد' کراچی

آگے بڑھ کر دین کی ڈوبتی ناؤ کی پتوار سنبھالی۔ دوسری رکعت میں ایسی قرأت کی کہ لوگ جھوم جھوم اُٹھے۔ پھر تو فرمائش کر کر کے چاچا گل سے نماز پڑھانے کی التجا کی جاتی تھی۔ اصل امام کو کسی مستند ڈاکٹر سے رجوع کرنے اور اپنا تسلی بخش علاج کرانے کے مشورے دیئے جانے لگے۔ امامت کرانے کے باعث چاچا گل کا وقار کافی بلند ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے موجودہ ویزے پر آئے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے۔ میں اپنے سابقہ ویزہ پر تقریباً ساڑھے تین برس گزار کر پکا پکا پاکستان چلا گیا تھا۔ وہاں کسی ملازمت کے لئے یا کوئی کاروبار سیٹ کرنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر دال نہ گلی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر ویزہ کے لئے بھائی کی منت سماجت کی۔ بالآخر اُس کا دل پسیج گیا۔ پھر میں ''جتھوں دی کھوتی' اوتھے آن کھلوتی'' کے مصداق ایک بار پھر یہاں آ پہنچا تھا--- جانے اور آنے میں چند برسوں کا جو خلاء آ گیا تھا' اُس میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ پہلے اتنی سختی نہیں ہوتی تھی' کام کی کھلی آزادی ہوتی تھی۔ سابقہ مرتبہ میں نے کچھ عرصہ ایک بقالہ (کریانہ سٹور) پر اور کچھ عرصہ کمبلوں کی ایک دُکان پر کام کیا تھا۔ کچھ عرصہ حجاج کرام اور زائرین کے لئے ایک فندق (رہائشی عمارت) پر بطور کاؤنٹر مین کام کیا اور کچھ عرصہ منڈی پر بھی کام کیا تھا۔ میرا موجودہ کفیل منڈی میں دَلال (آڑھتی) تھا۔ اُس کے پاس پہلے ہی کارکنوں کی پوری فوج موجود تھی' میرے لئے کوئی گنجائش نہ تھی لہٰذا اُس نے مجھے صاف کہہ دیا۔

''جاؤ اپنے لئے جہاں جی چاہے' روزی تلاش کرو مگر ہاتھ پاؤں ذرا بچا کر۔''

میں روزی کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا چاچا گل سے جا ٹکرایا تھا۔ میں چاچا گل کا بستہ سیٹ کرنے پر مامور تھا۔ میری ڈیوٹی رات گیارہ بجے سے صبح فجر کی اذان تک ہوتی تھی۔ یہاں منڈی میں رات کو بھی اچھی خاصی رونق رہتی ہے' اس دوران خطرے کا امکان کافی حد تک کم ہوتا تھا۔ آدھی رات کے بعد چاچا گل کہیں قریب ہی چادر بچھا کر' پاؤں پسار کر سو جاتا اور میں اس کی نگرانی بھی کرتا۔ کوئی گاہک آ جاتا تو اُسے بھی ڈیل کرتا۔ میں ایک لحاظ سے چاچا کا باڈی گارڈ بھی تھا۔ اگر کسی قسم کا خطرہ محسوس کرتا تو چاچا کو جگا دیتا تھا۔ پھر چاچا بھتیجا دوڑتے ہوئے منڈی سے باہر نکل جاتے تھے۔ کبھی چاچا آگے اور کبھی بھتیجا آگے--- بہرحال' چاچا گل میرے کام سے کافی مطمئن تھا۔ کام کے حساب سے مجھے مناسب یومیہ مل جاتا تھا۔ کچھ لوگ مجھ پر ہنستے تھے کہ اقامہ ہولڈر ہو کر ایک عمرہ والے کے پاس ملازمت کر رہا ہے۔ اگر میں ایسی باتوں پر کان دھرتا تو

پھر گھر میں بیٹھ کر مکھیاں مارتا اور مری ہوئی مکھیوں کو گنتا رہتا۔ میں ایسی نامعقول باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتا تھا۔ چاچا گل نے تو ایک سعودی جوان کو بھی نوکر رکھا ہوا تھا جو صبح و شام کے کاروباری اوقات میں مال بیچتا تھا۔ اگر اُس سعودی کو چاچا کی چاکری میں کوئی عار نہیں آتی تھی تو میں کیوں شرماتا؟

اب یکایک جو یہ اُفتاد آن پڑی تھی' اُس نے میرے اوسان اور نہ جانے کیا کیا خطا کر دیا تھا حالانکہ میرا چھٹی کا وقت ہو گیا تھا لیکن مجھے یومیہ دینے سے قبل ہی چاچا گل بلدیہ والوں کو پیارا ہو گیا تھا۔ بستے پر سعودی بیٹھا تھا۔ وہ زور زور سے سبزیوں کی آوازیں لگا رہا تھا۔ منڈی میں ہر طرف سبزیوں سے بھرے گتے کے کارٹن سلیقے اور ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ کہیں حراج (بولی) ہو رہا تھا' گاہکوں کی آمد و رفت جاری تھی' خوب گہما گہمی تھی۔ میں حسرت بھری نظروں سے چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔ چاچا گل کے بغیر منڈی سونی سونی لگ رہی تھی۔ مجھے یومیہ کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی کہ اپنے بے روزگار ہو جانے کی تھی۔ اِتنے میں چاچا غلام رسول آتا دکھائی دیا۔ وہ چاچا گل کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ مظفر گڑھ کا تھا' گاڑی میں غیر قانونی طور پر سواریاں ڈھوتا تھا۔ چاچا گل کا ایک دوست اور بھی تھا (نام مجھے یاد نہیں رہا) وہ ملتان کا تھا' جنت البقیع میں قبریں کھودتا تھا۔ اُس کے دو بھائی چاچا حسن اور چاچا مدیر منڈی میں گتے کے خالی کارٹن سپلائی کرتے تھے--- بہرحال' چاچا گل کے وہ دونوں دوست (چاچا غلام رسول اور چاچا گورکن) اُس کے ہم عمر تھے اور اکثر اُس سے ملنے خوش گپیاں کرنے آیا کرتے تھے۔

چاچا غلام رسول کو جب چاچا گل کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ کافی ملول ہوا۔ کچھ دیر منڈی میں کسی بے چین رُوح کی مانند منڈلاتا رہا' پھر اپنی بابا آدم کے زمانے کی کھٹارا سی مزدا بوکس میں جا بیٹھا۔ میں نے بھی دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور اُس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ مجھے اُداس دیکھا تو وہ پچکار کر بولا۔

''بیٹا! فکر مند کیوں ہوتے ہو؟ گل وہاں ٹکنے والا نہیں ہے' پھر لوٹ آئے گا' چند ماہ کی تو بات ہے۔''

''اور میں اِن چند ماہ میں مٹی چاٹوں گا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ سن کر وہ مراقبے میں ڈوب گیا۔ اُس کا سر سٹیئرنگ پر ٹکا ہوا تھا اور باقی دھڑ سیٹ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ فوت ہو گیا ہے۔ میں ''اناللہ'' پڑھنے ہی لگا تھا کہ اُس نے جھرجھری لے کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک ہنکارا ابھرا اور گویا ہوا۔

''منظور میاں! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، روزی رساں اللہ کی ذات ہے۔ ایک دَر بند ہوتا ہے تو اور کئی دَر کھل جاتے ہیں۔ مجھے گل نے بتایا تھا کہ تم کافی پڑھے لکھے ہو؟''

''ہاں، چاچا! یہ تو ہے---''میں نے ندامت سے سر جھکا کر کہا جیسے خود سے سرزد ہو جانے والے کسی گناہِ کبیرہ کا اعتراف کر رہا ہوں۔

''بیٹا! تم بے کار میں منڈی میں خوار ہوتے پھر رہے ہو۔ تمہارے پاس علم ہے، اِس سے کام لو---میری مانو تو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دو۔ یہاں مدینہ منورہ میں کافی پاکستانی گھرانے ہیں جو بچوں کی تعلیم کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ دو تین پاکستانی سکول ہیں تو سہی مگر وہ شہر سے باہر ہیں۔ اُن کی فیسیں اور پھر روزانہ بچوں کو وہاں لانے لے جانے کے اخراجات ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہیں۔''

''مگر، چاچا! بچے کہاں سے آئیں گے؟''

''بیٹا! تم اپنے عزیزوں اور دوستوں سے کہو، میں بھی کوشش کروں گا۔ اللہ نے چاہا تو تمہارے روزگار کا مناسب بندوبست ہو جائے گا۔''

''لیکن، چاچا! بچے اکٹھے کرتے کرتے تو ایک عرصہ بیت جائے گا، اُس وقت تک میں کیا کروں گا؟---میں فوری طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

چاچا غلام رسول نے میری بات دھیان سے سنی۔ وہ پھر سے مراقبہ میں ٹُبی (غوطہ) مار گیا۔ ذرا دیر بعد پھڑ پھڑایا، مجھے گھور کر دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے---''اُس نے چٹکی بجا کر کہا۔ ''تم یوں کرو کہ کل سے میرے بچے پڑھانا شروع کر دو۔ میرے گھر کے آس پاس کئی پاکستانیوں کے گھر ہیں، میں اور تمہاری چاچی مل کر تمہاری خوب تشہیر کریں گے۔ اُمید ہے، کچھ ہی دنوں میں تمہارے پاس پڑھنے والے بچوں کی معقول تعداد ہو جائے گی۔''

پھر اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے اپنا گھر دکھانے کو لے چلا۔ گاڑی کھڑ کھڑاتی، لڑکھڑاتی اور خرخراتی ہوئی نصف گھنٹے تک مختلف سڑکوں پر اور گلیوں میں دوڑتی رہی۔ بالآخر منزل آ ہی گئی۔ چاچے کا گھر بھی چاچے کی گاڑی اور خود چاچے جیسا تھا۔

''بیٹے! ناشتہ تو نہیں کرو گے، نا---!''اُس نے پوچھا۔ ''شرمانا بالکل نہیں، اِسے اپنا ہی گھر سمجھو۔''

اس قدر اپنائیت دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور آنکھیں چھلک پڑیں۔

''نہیں، چاچا! طلب نہیں ہے---''میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا حالانکہ میرے پیٹ میں بھوک کے گولے پھٹ رہے تھے۔ ''بس پانی پلا دو۔''

وہ اندر سے پانی کا گلاس بھر لایا جسے میں نے غٹاغٹ پی لیا۔

''چاچا! تمہارا گھر میرے گھر سے کافی دُور ہے۔''میں نے اپنا ایک مسئلہ اُس کے سامنے رکھا۔

''بیٹا! تم یوں کرو کہ فی الحال ایک عدد سائیکل خرید لو۔ جب ٹیوشنیں بڑھ جائیں گی تو پھر بے شک میری گاڑی جیسی کوئی ماڑی موٹی گاڑی لے لینا۔''

''اور چاچا، فیس---؟''

''فیس کی تم فکر مت کرو---''چاچا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''میں تمہیں خوش کر دوں گا۔''

شغل+مغل

مریض: تم نے تو میرا دل چرا لیا ہے۔
نرس: چل جھوٹے ہم نے تو آپریشن کے دوران تمہارا گردہ چرایا ہے۔

☆☆

''میں شادی کے بعد، تمہارا تمام دُکھ بانٹ لوں گی۔''
''لیکن جان! مجھے تو کوئی دُکھ نہیں۔''
''میں شادی کے بعد کی بات کر رہی ہوں۔''

☆☆

''تمہارا دوست ایک نہایت ہی بدصورت، بدزبان اور جھگڑالو لڑکی سے شادی کر رہا ہے تم اسے منع کیوں نہیں کرتے۔''بیگم نے کہا۔
''اس کمینے نے مجھے منع کیا تھا---؟''

☆☆

''سلمٰی کی کس خوش قسمت سے شادی ہو رہی ہے؟''
''ارے وہ خوش قسمت نہیں، خوش قسمت تو میں ہوں کہ میرے ساتھ سلمٰی نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔''

☆☆

لڑکی: تم کتنی مجھ سے محبت کرتے ہو؟
لڑکا: جتنی تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔
لڑکی: او مائی گاڈ! تو تم بے وفا ہی ہو۔

☆☆

''تمہیں کب احساس ہوا کہ تم نبیل سے بے پناہ محبت کرتی ہو؟''
''جب مجھے اس کے بینک بیلنس کا پتہ چلا۔''

☆☆

ملازم: بیگم صاحبہ! مجھ پر اتنا غصہ مت کیا کریں میں ملازم ہوں آپ کا شوہر نہیں۔

☆☆

''عروسہ سے شادی کر کے میں کروڑ پتی بن گیا ہوں۔''
''پہلے تم کیا تھے؟''
''ارب پتی۔''

محمد صابر مغل عبدو پوری

مَیں مطمئن ہوگیا۔

شام کو مَیں نے چاچا غلام رسول کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے سائیکلوں کی ایک دُکان سے ایک مستعمل (سیکنڈ ہینڈ) سائیکل ایک سو ریال میں خرید لی۔ اگلی صبح مَیں زور زور سے سائیکل کے پیڈل مارتا اور امین بابر کے اُردو ماہیے گنگناتا ہوا چاچا غلام رسول کے گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ مجھے وہاں تک پہنچنے میں لگ بھگ پونا گھنٹہ لگ گیا۔

چاچا نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مجھے بیٹھک میں بٹھایا' لائٹ جلائی' چھت والا پنکھا چلا دیا۔ پانی سے بھرا جگ اور گلاس لے آیا' بعدازاں اُس نے میرے ہونے والے شاگردوں کو بلالیا۔ باری باری اُن کا تعارف کرایا۔ چاچا کا سب سے بڑا بیٹا بارہ سالہ قلندر بخش تھا' وہ ایک ورشہ (ورکشاپ) میں مکینک کا کام بھی سیکھ رہا تھا۔ دوسرا دس سال کا فقیر بخش تھا' وہ کچھ بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ ابھی اُس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ پھر چھ برس کی بیٹی شنو تھی اور پانچ برس کا نور مُتھل تھا۔ بچوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔

''بیٹا! آج کل دور ہے انگریزی کا---'' چاچا نے کہا۔ ''تم نے اِن بچوں کو بھی انگریزی پڑھانی ہے تاکہ یہ مستقبل میں زمانے کے کندھے سے کندھا جوڑ کر چل سکیں۔''

''چاچا! تم فکر ہی نہ کرو۔ جو کچھ تم کہو گے' وہی پڑھاؤں گا۔ ایسی انگریزی پڑھاؤں گا کہ یہ بچے پورے نہیں تو آدھے انگریز تو بن ہی جائیں گے۔ کوئی دیکھے گا تو یقین ہی نہیں کرے گا کہ یہ چاچا غلام رسول کے بچے ہیں۔''

''منظور میاں! تمہارے منہ میں گھی شکر---اگر ایسا ہو جائے تو مَیں تمہیں عمر بھر دُعائیں دیتا رہوں گا۔'' چاچا کھل اُٹھا۔

''چاچا! تم نے میرے روزگار کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑا ہے' مَیں بھی اپنی جانب سے کوئی کمی نہیں کروں گا۔'' مَیں نے ایک عزم سے کہا۔

مَیں نے کتابوں کی ایک لِسٹ لکھ کر اُسے تھما دی اور بتایا کہ مدینہ منورہ میں پاکستانی کتب صرف ''مکتبہ الکوثر'' سے ملتی ہیں۔ پھر مَیں اُسے مکتبہ الکوثر کا محل وقوع سمجھا کر لوٹ آیا۔

اگلے دن سے بچوں کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ وہاں میرے تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔ منڈی میں مجھے ایک اور بلتے پر کام مل گیا تھا' مَیں رات کو منڈی میں کام کرتا اور صبح چاچا غلام رسول کے گھر جا کر بچوں کو پڑھاتا' یوں فکرِ معاش سے قدرے فراغت نصیب ہوئی۔

مَیں نے چاچا سے اُس کے بچوں کو انگلش میڈیم پڑھانے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر وہاں کا ماحول اور بچوں کی عقل اور شکل دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تو کسی بھی میڈیم کے قابل نہیں ہیں۔ چاچا کا بڑا صاحبزادہ قلندر بخش' صبح دس بجے سے رات بارہ بجے تک ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ صبح اُٹھ کر وہ کیا پڑھتا' خاک؟ وہ اپنی میلی کچیلی' کالک اور گریس سے لتھڑی وردی میں کسی بیمار مرغے کی طرح آ کر بیٹھ جاتا۔ دورانِ سبق جمائیاں لیتا رہتا' پھر اُس کے خراٹے گونجنے لگتے۔ مَیں اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتا' علم کا شہد اُس کے کانوں میں ٹپکاتا۔ وہ ذرا سی آنکھیں وا کرتا' خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا۔ ''اُستاد جی! مَیں نے ڈنایٹ کا انجن کھول دیا ہے' ہونڈائی کے ٹائروں میں ہوا فل کر دی ہے اور کامری کا تیل تبدیل کرنے لگا ہوں---تم نے پلاس اور چودہ نمبر کا پانا مانگا تھا' نا! یہ لو۔'' وہ بڑبڑاتا اور پھر نیند کے بحرِ بے کراں میں ڈوب جاتا۔

دوسرا فرزندِ ارجمند فقیر بخش اپنی خوشی سے اور اپنے پاؤں پر چل کر نہیں آتا تھا' باقاعدہ ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھا کر لایا جاتا تھا۔ جب بھی اُسے پتا چلتا کہ اُستاد جی آ گئے ہیں' وہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتا۔ پھر خود کو اِس مصیبت سے بچانے کے لئے گھر کے صحن میں اُچھل کود اور بھاگ دوڑ شروع کر دیتا۔ گھر کے بھی افراد اُسے گھیر گھار کر پکڑ لیتے۔ وہ تڑپتا تھا' مچلتا تھا۔ بڑی مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ اُسے میرے قریب لا کر بٹھا دیا جاتا' قاعدہ کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ وہ قاعدے کو اور مجھے متوحش ہو کر دیکھتا اور گھگھیاتا رہتا۔ مجھے اُس پر بے حد ترس آتا تھا کہ اِس ننھی سی جان کو آخر عذاب میں کیوں ڈالا جا رہا ہے---مَیں اُسے لکھنا سکھانے کے لئے پنسل اُس کی اُنگلیوں میں پھنساتا تو وہ ایک دِلدوز چیخ بلند کرتا جیسے اُس کا ہاتھ بجلی کے کسی ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ مَیں نے کاپی کے صفحہ پر اُسے الف لکھنا سکھانے کی بہت کوشش کی۔ مَیں پین سے ''ا'' لکھتا اور اُسے پیار سے کہتا کہ اِس کے اوپر پنسل سے لکیر لگاؤ۔ وہ الف پر کبھی اُوپر سے نیچے لکیر نہیں ڈال سکا' ہمیشہ دائیں سے بائیں لکیر لگا کر الف کو لِٹا دیا کرتا تھا' یوں میرے کیئے کرائے پر پانی پھر جاتا تھا---پورے تین مہینے مَیں اُس کے ساتھ مغز ماری کرتا رہا مگر اُس کے پلے کچھ نہ پڑا' اُلٹا مجھے لگنے لگا کہ اُسے پڑھا پڑھا کر مَیں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں گا---شنو اور مُتھل کسی قسم کی آناکانی نہیں کرتے تھے مگر وہ لکھنے پڑھنے سے زیادہ ہر وقت ناک سے ''شوں شوں'' کرنے اور گھر کی باتیں کرنے کے دِلدادہ تھے۔ باتوں ہی باتوں میں وہ ایسے بھید بھی کھول دیا کرتے تھے' جنہیں جان کر مَیں پریشان ہو جایا کرتا تھا۔

بیٹھک میں جابجا مکڑیوں نے جالے بنے ہوئے تھے۔ مکھیوں' مچھروں' کیڑوں مکوڑوں' کاکروچوں' کن کھجوروں' کھٹملوں اور چھپکلیوں

کی بھی بہتات تھی۔ کبھی کوئی موٹا تازہ چوہا ایک کونے سے برآمد ہوتا' پھر مارننگ واک کرتا ہوا دوسرے کونے میں کہیں غائب ہو جاتا۔ کبھی کوئی مینڈک' بچوں کی کتابوں کاپیوں پر سے شڑاپو کھیلتا ہوا گزر جاتا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے مگر بچے اِن چیزوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے تھے' وہ اِن کے عادی لگتے تھے۔

ایک روز بیٹھک کی بجلی خراب ہو گئی۔ سارا انتظام تلپٹ ہو کر رہ گیا' گرمی میں بیٹھنا محال ہو گیا۔ مَیں نے چاچا سے شکوہ کیا۔

''بیٹا! مَیں آج ہی مستری کو لے آؤں گا' یہ مسئلہ تو سمجھو حل ہو گیا ہے۔'' اُس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

پھر کئی روز گزر گئے اور وہ مسئلہ جوں کا توں رہا۔ صحن کی جانب کا دروازہ کھول دیا جاتا تھا' جس سے اَندر کا حبس اور اندھیرا قدرے کم ہو جاتا تھا۔ چند روز تو سلسلہ یُوں ہی چلتا رہا' پھر چاچا نے کمال عنایت سے مجھے صحن میں بیٹھک کی دیوار کے سائے میں ''کلاس'' لگانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اب بجلی کی حاجت نہیں رہی تھی۔ صحن میں بیٹھا تو گھر کا نقشہ بیٹھک سے بھی زیادہ بگڑا ہوا پایا۔ اب مجھ پر یہ بھید آشکار ہوا کہ اُن کے گھر میں حشرات' چوہے اور مینڈک وغیرہ کیوں مٹرگشت کرتے پھرتے ہیں؟ آدھے صحن کو چاچا نے لالو کھیت بنایا ہوا تھا۔ جس میں ہر نوع کی سبزی اُگائی گئی تھی' باقی کا آدھا صحن کاٹھ کباڑ سے اَٹا پڑا تھا۔ چاچا کی ہونہار اَولاد باہر سے جو بھی گند ملتا تھا' گھسیٹ کر گھر میں لے آتی تھی۔ گھر' کچرا گھر کا منظر پیش کرتا تھا۔ مَیں نے جابجا بچہ گاڑیوں' سائیکلوں اور واشنگ مشینوں کے سپیئر پارٹس' ٹوٹے پھوٹے کھلونے' لوہے کی کھڑکیاں' دروازے' ڈش انٹینے اور لکڑی کی بَلیاں وغیرہ جیسی فالتو اشیاء بکھری ہوئی پائیں حتیٰ کہ ایک مکمل کار کا ڈھانچہ بھی دیکھا جو بچے تو گھسیٹ کر لانے سے رہے' یقیناً چاچا کی اپنی کارستانی ہو گی۔ فارغ وقت میں بچے اُس ڈھانچے میں بیٹھ جاتے۔ وہ منہ سے انجن چلنے اور ہارن بجانے کی آوازیں نکالتے اور باری باری سٹیئرنگ گھماتے' یوں مفت میں ڈرائیونگ کے مزے لوٹا کرتے تھے۔

چاچا حد سے زیادہ کنجوس مکھی چوس واقع ہوا تھا۔ اُس نے اوّل روز نہ جانے کیسے ناشتہ کے لئے پوچھ لیا تھا؟ اب وہ روزانہ کیس (شاپر) میں دو چپاتیاں' فول (دال کی ایک قسم) اور لبن (لسی) ہاتھ میں لٹکائے بنا دُعا سلام کئے میرے پاس سے چپکے سے گزر کر اندر کو چلا جاتا تھا۔ ناشتہ تو رہا ناشتہ' بعض اوقات دو گھونٹ پانی کے لئے بھی ترسنا پڑتا تھا۔ مَیں بچوں سے پانی کے لئے کہتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹ آتے اور رپورٹ پیش کرتے کہ پورا فرج کھنگال ڈالا ہے مگر پانی کی بوند بھی دکھائی نہیں دی ہے۔ مَیں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہ جاتا۔ کبھی کبھار چاچا ڈی ای او بن کر پہنچ جاتا اور کلاس کی انسپکشن شروع کر دیتا۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر کلاس کے آس پاس ٹہلتا رہتا' مجھے میری تدریسی خامیوں سے آگاہ کرتا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہتا۔ مَیں بھی اُسے خوش کرنے کے لئے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ ایک روز اُس نے مشورہ دینے کی بجائے مشورہ مانگ لیا۔

''منظور میاں! ایک مشکل آ پڑی ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو' کوئی اچھا سا مشورہ دے سکتے ہو۔۔۔''

''بولو چاچا! کیا پرابلم ہے؟'' مَیں نے اپنی عزت افزائی پر خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے علاقے کا ناظم عمرہ کرنے آ رہا ہے۔ وہ میرا ہم پیالہ' ہم نوالہ اور ہم لنگوٹ یار ہے۔ ہم اکٹھے ہی کھیل کود کر جوان ہوئے تھے' پھر میں اِدھر آ گیا اور وہ میدانِ سیاست کی جانب نکل گیا۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ چند روز میرے ہاں بھی قیام کرے گا اور میرے غریب

ٹوٹے

ترقی

کر گئی ہے وہ کتنی ترقی
کر کے تھپڑ سے پہلے تواضع
پوچھتی ہے کہ سینڈل بھی لاؤں

ہاءلات

زخمی ہوا ہے مخنہ جو کھیل میں تمہارا
ہاں ، لات اب تمہاری ، حالات کی طرح ہے

کرلوگل

شام کے وقت تری یاد میں غم پیتے ہیں
لوگ ہیں تاڑ میں ، ہم پھر بھی صنم پیتے ہیں
تیری الفت کی قسم ، اس سے بھی ہوتا ہے نشہ
کوکا کولا میں نمک ڈال کے ہم پیتے تھے

سید فہیم الدین، دوحہ قطر
009745138374

خانے کی شان بڑھ جائے گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ میں اُس کے لئے کیا انتظام کروں؟"

"چاچا! سب سے پہلے تو اپنے غریب خانے بلکہ کباڑ خانے کا کوڑا کرکٹ صاف کراؤ---" میں نے فوراً ہی نیک نیتی سے مشورہ داغا۔ "یہ جو صحن میں ہے اور جو کمروں کے اندر بھی ہوگا۔"

"کمرے تو اندر سے پاک صاف ہیں۔" اُس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"اور ہاں' چاچا! بیٹھک کی صفائی ستھرائی اور سیٹنگ بہت ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "بیٹھک دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ گھر کے مکین کیسے ہیں؟ اگر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے ہو تو اُسے گھر میں مت لانا ورنہ بہت سُبکی ہوگی۔ کسی فندق (سرائے' ہوٹل) پر اُس کے قیام و طعام کا بندوبست کر لینا۔"

چاچا کا منہ اُتر گیا' اُسے غالباً میری بات بُری لگی تھی۔ چاچا نے میرے مشورے کو دَرخورِ اعتنا نہ جانا اور سب کچھ جوں کا توں رہنے دیا۔ نہ جانے اُس نے ناظم کی رہائش اور کھانے پینے کا کیا انتظام کیا تھا؟--- پھر پتا چلا کہ ناظم آیا تھا' چاچا اُسے جا کر ملا بھی تھا مگر اُس نے چاچا کو منہ تو کیا لگانا' سونگھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ یہاں مدینہ منورہ میں صرف چاچا ہی تو نہیں تھا' اس کے بے شمار چمچے کڑ چھے بھی رہتے تھے۔ وہ دعوتیں اُڑا کر' سیر و تفریح کر کے اور تحائف سے لدا پھندا واپس چلا گیا تھا اور بے چارے چاچا کو دُکھی کر گیا تھا۔ چاچا بہت بھولا تھا' بھلا سیاستدان بھی کسی کے یار ہوئے ہیں؟--- اِس دوران مجھے ایک صدمہ سے دو چار ہونا پڑا۔ ایک روز میں سائیکل پر سوار چاچا کے گھر سے واپس آرہا تھا۔ میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے اپنا پیارا دیس اور اس میں بسنے والے پیارے پیارے لوگ شدت سے یاد آرہے تھے۔ میں سوچوں کی بھول بھلیوں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ خود کو پاکستان میں محسوس کر رہا تھا۔ اِسی بھول میں میں سڑک کے بائیں ہاتھ پر چلا آرہا تھا حالانکہ یہاں سعودی عرب میں ٹریفک دائیں ہاتھ پر چلتی ہے۔ ایک جگہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ مجھے مرور (ٹریفک پولیس) والوں نے دَھر لیا۔ چوبیس گھنٹے تھانے میں رکھا اور نو سو ریال غرامہ (جرمانہ) ٹھوک دیا جو ایک مہربان کی بھاگ دوڑ اور مہربانی سے تین سو ریال ہو گیا' بعد میں اُس مہربان کو اِس مہربانی کے صلہ میں چھ سو ریال دینے پڑ گئے۔ اِس قدر خسارہ اُٹھانے کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری۔

"جب چاچا فیس دے گا تو ساری کسر نکل جائے گی۔" میں پُراُمید ہو کر سوچتا تھا۔

مہینہ تمام ہوا تو میں نے چاچا کو یوں خوشخبری سنائی جیسے اُس کے گھر میں پہلی اولادِ نرینہ کے تولد ہونے پر دائی نے سنائی ہوگی۔ وہ متفکر ہو گیا۔

"اچھا کوشش کرتا ہوں۔" اُس نے مری مری سی آواز میں کہا۔

کئی روز بعد اُس نے مجھے ایک پڑیا تھما دی۔ میں نے پڑیا کی پرتیں کھولیں تو انکشاف ہوا کہ وہ پڑیا نہیں تھی بلکہ ایک سو ریال کا ایک بوسیدہ سا نوٹ تھا۔ میں دَم بخود رہ گیا۔

"یہ کیا ہے' چاچا---؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "فطرانہ دے رہے ہو کیا؟"

"فطرانہ نہیں ہے' یہ فیس ہے۔" اُس نے چڑ کر کہا۔

"مگر کس حساب سے؟" میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔

"حساب تو سیدھا ہے۔ پچیس ریال فی پٹھا یا پٹھی--- تم تو اچھے خاصے پڑھے لکھے ہو' اِتنا سا حساب بھی نہیں جانتے ہو کیا؟" اُس نے چوٹ کی۔

میں بلبلا اُٹھا۔ میرے ہاتھ میں اُس کا دیا ہوا نوٹ ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ چاچا کی حسرتناک نگاہیں اُس نوٹ پر جمی ہوئی تھیں' وہ یوں رنجیدہ ہو رہا تھا جیسے میں نے اُس سے اُس کی ساری جمع پونجی ہتھیالی ہو۔

اُس دن سے میری تمام اُمیدوں پر اوس سی پڑ گئی' میرا دل وہاں سے اُچاٹ ہو گیا۔ میں نے بچوں پر محنت کرنا چھوڑ دی' انتہائی بے دلی سے پڑھاتا۔ میں نے قلندر بخش کو ڈسٹرب کرنا چھوڑ دیا' اُسے اطمینان سے اپنی نیند پوری کرنے دیتا۔ فقیر بخش' شفو اور مشعل سے کہا کہ وہ اپنے بستوں میں کھلونے اور لوڈو وغیرہ لے آیا کریں تا کہ اُن کا وقت مزے سے کٹ سکے' بس چاچا کے راؤنڈ کے دوران ذرا احتاط رہا کریں۔ وقت بھی دو گھنٹے سے گھٹا کر ایک گھنٹہ کر دیا اور اِس ایک گھنٹہ میں بھی میں تسبیح کے دانے گھمانے اور یادِ الٰہی میں مستغرق رہنے لگا' یوں دراصل میں چاچا سے اپنی کم مائیگی کا بدلہ لے رہا تھا۔ جتنا گڑ ڈالو میٹھا بھی اُتنا ہی ہوتا ہے۔ اب میں چاچا سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ چاچا' پرانا اور گھاگ بندہ تھا' گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھا' سمجھ گیا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔

"کیا بات ہے' منظور میاں! آج کل پرانی کلہاڑی کی طرح اُکھڑے اُکھڑے سے رہتے ہو؟" ایک دن اُس نے پوچھ لیا۔

میں پھٹ پڑا۔ "چاچا! تم نے تو کہا تھا کہ یہاں کافی بچے ہو جائیں گے مگر اَب جبکہ دوسرا مہینہ بھی ختم ہونے کو ہے' مجھے کسی اور بچے کی

کہ وہ نہ سہی' کسی اور کو ہی لے آؤ۔ بہانہ پڑھائی کا ہے کہ پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر مجھے علم ہے کہ اصل چکر کیا ہے' میں نے یہ بال دھوپ میں لال نہیں کئے ہیں بلکہ ہر دوسرے روز مہندی لگاتا ہوں--- غلام رسول' میرے بھائی! وہ زمانہ لد گیا جب اُستاذ اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے' آج کل کے ماسٹروں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنی باتوں اور شکل سے یہ ماسٹر بھی مجنوں لگتا ہے۔ میں تو اِس سے اپنی لڑکیاں ہرگز نہیں پڑھاؤں گا۔'' اُس نے قطعی انداز میں کہا۔

اپنے بارے میں اُس شکی مزاج بوڑھے کے بیہودہ ریمارک سن کر میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ یہ وہ واحد حرام شئے ہے جسے پی جانے کا حکم دیا گیا ہے سو میں نے بھی پی لیا۔ نہ پیتا تو کیا کرتا؟

''فضل دین! میں اِس کو اچھی طرح جانتا ہوں' یہ انتہائی بھلا مانس نوجوان ہے---'' چاچا غلام رسول نے میری وکالت کی۔ ''خواہ مخواہ ہر کسی پر شک نہ کیا کرو' پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں۔''

''ہو جاتی ہیں۔'' چاچا فضل دین نے اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں کی پوروں کو برابر رکھ کر کہا۔

''چلو' بیٹا! یہ گدھا نہیں مانگے' تمہاری قسمت ہی کھوٹی ہے۔'' چاچا غلام رسوم نے مایوس ہو کر مجھ سے اُردو میں کہا' پھر ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆

چاچا غلام رسول کے بچوں کو پڑھاتے ہوئے مجھے تین ماہ ہونے کو تھے مگر کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی البتہ مجھے اپنے گھر کے آس پاس چند ٹیوشنز مل گئیں۔ یہاں ماحول بھی اچھا تھا' فیس بھی معقول تھی۔ پھر جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے' یہ سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ مجھے منڈی کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب میں کسی اُنکل سے چاچا غلام رسول کے گھر سے نجات پانا چاہتا تھا کیونکہ وہ واحد گھر تھا جہاں آنے جانے کے لئے مجھے سائیکل کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چاچا فیس بھی یوں دیتا تھا جیسے مسجد کے لئے چندہ دے رہا ہو اور وہ بھی رو پیٹ کر لیکن اُس سے جان چھڑانی آسان نہیں تھی۔ مجھے اپنی جان عزیز تھی' میں کوئی دُشمنی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ بلوچوں کی دُشمنی سے تو اللہ تعالیٰ دُشمنوں کو بھی محفوظ رکھے۔

رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا۔ یہاں اِس ماہِ مبارک میں لوگ پورا دن سوتے ہیں' پھر شب بھر جاگتے اور دین اور دُنیا کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی تمام ٹیوشنز کا وقت رات میں کر دیا لیکن چاچا غلام رسول وقت بدلنے پر آمادہ نہ ہوا کیونکہ اب اُس کا بیٹا قلندر بخش رات کو ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔

میں روزہ رکھ کر چاچا کے گھر آنے جانے پر ڈیڑھ گھنٹہ کی سائیکلنگ کے بعد نڈھال ہو جاتا تھا۔ اپنے غرفہ (کمرہ) میں آتے ہی اے سی آن کر کے گدے پر گر جاتا اور دیر تک ہانپتا رہتا۔ دل کرتا تھا کہ ابھی سے افطاری کر ڈالوں مگر پھر خوفِ الٰہی غالب آ جاتا تھا۔ صحت تھی کہ تیزی سے گرتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے ہڈیاں کڑکڑانے لگی تھیں۔ میں آئینہ میں خود کو دیکھتا تو گمان ہوتا تھا کہ یہ میں نہیں ہوں بلکہ میرا ایکس رے ہے۔ یہ میرے لئے دراصل خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں شدت سے سوچنے لگا تھا کہ اگر حالات جوں کے توں رہے تو میں اب کے میٹھی عید عالمِ اَرواح میں اپنے مرحوم بزرگوں کے پاس ہی جا کر مناؤں گا۔ میں اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے کلمۂ طیبہ کا ذکر کثرت سے کرنے لگا کہ نہ جانے کب بلاوا آ جائے؟

ایک دن چاچا سے فیس کی وصولی کے بعد میں اُس کے سامنے رو پڑا۔ چاچا کو بھی غالباً میری حالتِ زار پر ترس آ گیا۔

''اچھا' بیٹا! ماہِ رمضان میں تم ریسٹ کر لو---'' اُس نے میرے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔ ''عید کے بعد آ جانا' میری بھی مہینے بھر کی فیس بچ جائے گی۔''

یوں ایک عذاب سے میری جان چھوٹ گئی اور گرتی ہوئی صحت سنبھل گئی۔ میں نے عید سے قبل سائیکل کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

عید کے کئی روز بعد میرے موبائل کی گھنٹی گنگنائی۔ میں نے اوکے کا بٹن دبایا' دوسری جانب چاچا غلام رسول تھا۔

''منظور میاں! کیا بات ہے' ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہو؟ بچے تمہیں یاد کرتے ہیں۔''

''چاچا! میری سائیکل چوری ہو گئی ہے---'' میں نے بہانہ بنایا۔ ''پیدل کیسے آؤں؟''

وہ خاموش ہو گیا۔

''چاچا! تم مجھے اور سائیکل خریدنے کے لئے پیسے عنایت کر دو' نا!'' میں نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ ''بعد میں بے شک فیس میں سے کاٹ لینا یا پھر گاڑی تو تمہارے پاس ہے ہی۔ تم بچوں کو گاڑی پر میرے پاس لایا اور لے جایا کرو' تمہارا ناشتہ بھی میرے ذمے رہا۔''

اِس طرح میں چاچا کو اُس کی کنجوسی کا احساس بھی دلانا چاہتا تھا۔ وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے اُسے سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ کچھ دیر اُس کی سانسوں کی پھنکار سنائی دیتی رہی' پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

☆☆

آخری مشاعرہ

☆ طارق شاہین وسیر

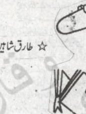

لٹو فلک کا شتر مسلسل معصیل مادو
لئے پوش نکتوں کے سوکھنا در سادو

اور لیجئے صاحب! اسی وزن کا ایک اور شعر سنئے یہ بھی ہماری اپنی تخلیق کردہ زبان میں ہے۔ اُردو' فارسی' پشتو' عربی' انگلش وغیرہ زبانوں کے تو کئی شاعر گزر چکے ہیں اور ان زبانوں میں تو کوئی موضوع' کوئی پہلو ایسا بچا ہی نہیں جس پر شاعر حضرات اپنا اظہار خیال نہ فرما چکے ہوں اسی لئے شاعری کی دنیا میں ایک نئی نویلی اور خوبصورت سی زبان کی ضرورت ناگزیر تھی چنانچہ دنیائے شاعری کی اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے دور جدید کی جدید ترین اور ایڈوانس قسم کی زبان ایجاد کی ہے۔ جس کا ہر لفظ' ہر حروف اپنے اندر دنیا جہان کا درد سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی زبان اور اسی انداز میں ہم نے دور جدید کی قسم کا درد سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی زبان اور اسی انداز میں ہم نے دور جدید کی قسم کا منفرد دیوان مرتب کیا ہے۔ ذرا غور فرمائیں کیا خوبصورت اور گرائمر سے بھرپور نام ہے دیوان اسقومیت۔

''ہمارے اس دیوان اسقومیت کا ابھی تک دنیا کو علم نہیں ہوا۔ جس دن ہم نے اپنا یہ دیوان ظاہر کر دیا' علمی اَدبی اور ثقافتی حلقوں میں کہرام مچ جائے گا۔ ہماری اس دیوان کے شعروں' غزلوں اور ان میں استعمال کی گئی زبان کا آپ کو ہماری سوا کہیں سے وجود تک نہ ملے گا اور نہ ہی ہمارے اِن شعروں کا مطلب آپ کی سمجھ میں آئے گا کیوں کہ ابھی تک ان کا مطلب خود ہماری سمجھ سے بھی بالاتر ہے لیکن پھر بھی کیا کہنے ہماری شاعری کے کیونکہ ایک اچھے اور پکے سچے شاعر کی پہچان ہے کہ شعروں کا مطلب سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن قافیہ درست ہو اور شعر دائرہ پلکار کے اندر ہونا چاہئے۔ یہ سنئے دو عدد شعر اور داد دیجئے ہماری عقل کو کہ کس خوبصورتی سے اپنی تخلیق کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہ دونوں شعر سوالاً جواباً ہیں۔ جو دو دوست ایک دوسرے کو کہہ رہے ہیں۔ ایک دوست کہتا ہے---

خیبر کہ روئے رخشاں نہ ڈول در ستی
انگول کہ راگھوئے رگ چھیٹر خوئے چستی

جبکہ دوسرا دوست جواب میں یوں کہتا ہے---

اجنون کہ پالاں ناخون درے ہستی
ناچاکی اے پندھار پہ اتری ہے میری ہستی

اور اَب ایک اور شعر سنئے جو ان دونوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا اور پھر اس شعر کے بعد صرف بیس عدد غزلیں اور سناؤں گا۔''

ان بیس عدد غزلوں کا سنتے ہی ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور ہماری عقل چکرانے لگی مگر مجبوراً ایک برفانی سانس بھر کر رہ گئے۔

اسی دم پیچھے سے ایک دھاڑ سنائی دی۔ ''اوئے جن کی اولاد! تو ادھر ہوتا ہے کہ نہیں اَب ہماری باری ہے۔ کتنی دیر سے تو مسلسل ٹرٹر کر رہا ہے اور ہم ہیں کہ تجھے برداشت کر رہے ہیں۔ رو تانئی زبان اختیار کرنے کو فوراً پیچھے بھاگ اب ہم سنائیں گے اپنا کلام۔''

یہ جگو نیولا تھے جو کرلا پہلوان پر برس رہے تھے لیکن فوراً ہی جواب میں کرلا صاحب کی چنگھاڑ سنائی دی۔

''ارے ارے کیا کہتا ہے ہم کو؟ اگر دوبارہ کہا تو تیرے تیس ثابت اور دو پہلے سے ٹوٹے دانت باہر پڑے نظر آئیں گے تو کون ہوتا ہے

مجھے یہاں سے ہٹانے والا۔ جانتا نہیں کہ میں صرف شاعر ہی نہیں بلکہ میں ایک فری سٹائل پہلوان بھی ہوں۔ ابھی تک بچے اپنی ماؤں کو میرا نام لے کر ڈراتے ہیں اور دوکاندار اپنے برتن چھپا کر رکھتے ہیں۔"

کرلا پہلوان کی باتیں سن کر نیولا صاحب اپنی بانہوں کو پھلاتے' دُم ہلاتے سرخ سرخ آنکھوں اور پھولے ہوئے چہرے کے ساتھ کرلا پہلوان پر چھلانگ لگانا ہی چاہتے تھے کہ یکدم ایک اور صاحب درمیان میں کودے اور اپنی بانہیں ٹریفک سارجنٹ کی طرح پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر اپنی پھنسی پھنسی آواز کے ساتھ گرجے۔

"اوئے خبردار! اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ روئی کی طرح اڑا کے رکھ دوں گا۔ تم دونوں اب دمو کو سمیٹو اور یہاں سے نو چار تیرہ ہو جاؤ۔ اب اپنا دیوان سنائے گا تو صرف چھری مار۔"

یہ درمیان میں چھری مار آ کودے تھے جو کہ اب اپنی شاعری کی چھری ہم پر چلانے کے لئے تیار تھے۔

ہم نے بھاگنے والی نظروں سے پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھا تو خون خشک ہو گیا کیونکہ دو اور شاعر اپنے تین تین فٹ کے دیوان اٹھائے ہماری جانب ہی بڑھ رہے تھے۔ ہماری حالت اس وقت بالکل ایسی بھیڑ کی سی نظر آ رہی تھی جو کہ درجن بھر قصابوں کے درمیان گھری ہوئی ہو۔ ہم نے دل ہی دل میں "کسے معلوم تھا یارب' کہ ہو گی دشمن جاں بھی" کہتے ہوئے یہ ارادہ کر لیا کہ آج اگر ان پہلوان نما شاعروں سے بچ گئے تو اپنی آنے والی نسلوں کو بھی تاکید کر دیں گے کہ کبھی بھولے سے بھی اپنے دل میں مشاعرہ منعقد کروانے کا خیال تک نہ لانا--- جی ہاں مشاعرہ--- نہ جانے وہ کون سی کم بخت گھڑی تھی جب ہم نے اپنے ہاں مشاعرہ منعقد کروانے کی حامی بھر لی تھی۔

ہوا یوں کہ چھٹی کا دن تھا اور ہم اپنے عزیز سپیکر صاحب (یہ کسی اسمبلی کے سپیکر نہیں بلکہ ان کی آواز ہر وقت ہی بہت بھاری اور بلند رہتی ہے جس وجہ سے یہ چلتا پھرتا سپیکر کے نام سے مشہور ہیں) کو ملنے جا رہے تھے کہ راستے میں بے سرا صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان صاحب کا نام تو کچھ اور ہی ہے' ذات کے حجاج ہیں لیکن شاعری کے انتہائی دلدادہ ہیں۔ اپنے اسی شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ بے سرا کا دم چھلا لگا رکھا ہے بلکہ اب تو مشہور ہی بے سرا صاحب کے نام سے ہو گئے ہیں۔ گرد و نواح کے ہر مشاعرے میں بغیر دعوت نامہ پہنچ جانا ان کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ اکثر محفلوں سے اٹھا کر باہر پھینک دیئے جاتے ہیں لیکن پھر؟---

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہیں آپ
محفل میں اسی خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

کا نعرہ لگاتے ہوئے دوبارہ اندر پہنچ جاتے ہیں۔

خیر علیک سلیک کے بعد بے سرا صاحب ہم سے مخاطب ہوئے۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟"

ہم نے اس غرض سے کہ کہیں ساتھ ہی نہ چٹ جائیں' متعدد بہانے بنائے لیکن یہ حضرت ایلفی کی طرح ہم سے چپکے ہی رہے اور عجیب ڈھٹائی کے ساتھ ہی چلتے رہے۔

لاکھ کوشش کی کہ ان سے جان چھوٹ جائے مگر ہماری ایک نہ چلی اور مجبوراً ان کو بھی ساتھ لئے ہم سپیکر صاحب کے ہاں جا پہنچے۔ راستے میں بے سرا صاحب نے ہمیں مشاعرہ اور مشاعرے کے فوائد کے بارے میں ایک طویل لیکچر دیا اور مجبور کیا کہ ہم بھی اپنے ہاں ایک عدد مشاعرہ منعقد کروائیں۔ ہم نے بھی محض جان چھڑانے کی غرض سے اقرار کر لیا۔

سپیکر صاحب نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ زمین پر گزرے دور کی ایک دری بچھا کر اوپر تکیے رکھے اور ہمیں اس پر بٹھا کر ایک عدد کنگ سائز لوہے کی بالٹی بے رنگ مشروب سے بھر لائے اور بھلے وقتوں کے بنے ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ سیر کے پیتل کے گلاس بھر کر ہماری ہاتھوں میں پکڑائے۔ پیاس کی شدت سے بے تاب ہم نے تقریباً چھینتے ہوئے گلاس پکڑا اور منہ سے لگا لیا لیکن ایک گھونٹ ہی بھر سکے تھے کہ سامنے کوہ نمک کا نقشہ گھوم کر رہ گیا جبکہ سپیکر صاحب اس مشروب کی تعریف میں زمین آسمان کر رہے تھے۔ ہم نے چور آنکھوں سے بے سرا صاحب کا جائزہ لیا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ انہوں نے دو گلاس ختم کرنے کے بعد تیسرے گلاس کے لئے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

سپیکر صاحب بدستور اس مشروب نما کی تعریف میں مصروف تھے کہ بھائی' دیکھو آج کل اگر پانی میں چینی ملائی جائے تو شوگر کا خطرہ ہوتا ہے' برف نزلہ کھانسی کے ساتھ ساتھ گلے کی متعدد بیماریاں پیدا کرتی ہے اس لئے ہم نے نہ تو برف ڈالی اور نہ ہی چینی ملائی' کاغذی لیموں مل نہیں رہے تھے اس لئے کھٹے کا رس ملا لیا اور چھٹانک بھر نمک ڈال دیا تاکہ ہماری معزز مہمان بلڈ پریشر' ہارٹ اٹیک' فالج اور جوڑوں کے درد جیسی موذی بیماریوں سے محفوظ رہیں۔ ایک دفعہ ہمارے ساتھ ایسا واقعہ پیش آ چکا ہے کہ--- واقعہ شروع کرنے سے پہلے ان کی نظر ہم پر پڑی تو بڑی حیرانگی سے بولے۔

"شاہین جی! آپ نے ابھی تک ایک گلاس ہی پیا ہے۔ آپ کو تو

چاہیے تھا کہ اس وقت تک پانچ گلاس ختم کر چکے ہوتے۔" یہ کہتے ہوئے ہمارا گلاس دوبارہ بھر دیا جو کہ ہم نے نظر بچا کر پاس والے گملے میں بہا دیا تھا۔ ہم نے اور گلاس پینے سے انکار کر دیا تو کہنے لگے۔ "عجیب بات ہے شاہین صاحب! آپ شاہین صاحب تو نہ ہوئے بلکہ آپ تو محض کبوتر صاحب۔۔۔ نہیں طوطا۔۔۔ یہ بھی نہیں چڑا بلکہ چیونٹے صاحب ہوئے جو مرزا غالب کے پسندیدہ مشروب کی قدر نہیں کر سکے۔ بہر حال ہم بھی یہ واپس لے کر نہیں جائیں گے۔" اتنا کہتے ہوئے انہوں نے بقایا بالٹی ہماری سر کے اوپر الٹ دی۔

نمکین پانی پڑنے سے آنکھیں کافی احتجاج کر رہی تھیں۔ ایک کان الگ بند ہو گیا تھا۔ سر میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور باوجود غصے کے ہم انتہائی مجبور تھے۔ ادھر بے سرا صاحب اور سپیکر صاحب ہماری حالت سے بے نیاز اپنی اپنی شاعری پر تبادلہ خیال فرما رہے تھے۔ ان کی اس بے نیازی نے ہمارے اوپر جلتی پر تیل کا کام دکھایا اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ابھی پہلا قدم ہی اٹھایا کہ دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہو گئے' کم بخت بے سرا صاحب نے ہماری ٹانگ پکڑ لی تھی۔ اسی لمحہ سپیکر صاحب ترنم سے بولے۔ "جاتے کہاں ہیں آپ نظریں پھیر کے۔"

ہم نے انتہائی غصے سے جواب دیا کہ جہنم میں اَب فوراً ہی بے سرا صاحب گنگنائے۔۔۔

"جاتے ہوئے دل لے جاؤ تنہائی میں یہ کام آئے گا"

ہم نے دل میں سوچا کہ کاش' تیرا دل تو کوئی آدم خور ہی نکال کر لے جائے۔ اس وقت ایک اور ناگوار سی بات ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ بے سرا صاحب' سپیکر صاحب سے کہہ رہے تھے۔

"ارے' آپ کو علم نہیں کہ ہفتے کے روز شاہین صاحب اپنے ہاں ایک شاندار قسم کی محفل مشاعرہ منعقد کروا رہے ہیں۔"

"سچ۔"

"ہاں سچ' سو فیصد بلکہ درست۔"

ہم نے بے سرا اور سپیکر صاحب کی بات میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں مشاعرہ ضرور کراؤں گا مگر اتنی جلدی نہیں کروا سکتا کیونکہ نہ ہی میں شعراء حضرات سے اتنی واقفیت رکھتا ہوں کہ ان سے رابطہ قائم کر سکوں اور نہ ہی ابھی مشاعرے کے اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔ یوں بھی مجھے شاعروں اور ان کے شعروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی آپ لوگوں کی اگر یہی خواہش ہے تو جب میری جیب میں اتنی طاقت ہو گی کہ مشاعرے کا بار اٹھا سکے تو پھر آپ کی بات پر غور کروں گا۔"

ہمارے یہ باضابطہ دلائل سننے کے بعد بے سرا صاحب گویا ہوئے۔

"پہلی بات تو یہ کہ جہاں تک شاعر حضرات کا تعلق ہے تو میرے حلقہ احباب میں بیسوں ایسے شاعر دوست موجود ہیں جو میری ایک آواز پر ہی یوں دوڑے چلے آئیں گے جیسے برے دن آتے ہیں اس لئے اس

چوکے پہ چوکا

نسخہ وزن گھٹانے کا ہے متفق علیہ
باقاعدگی کے ساتھ علی الصبح "واک" ہو
اور معاملہ ہو گر کسی خاتون کا ، تو ساتھ
موبائل فون پر کوئی لمبی سی "ٹاک" ہو

OO

گر تیرا "لونگ گواچا" ہے تو خود ڈھونڈ اسے
بندہ اس کام میں ناکام نظر آتا ہے
میری عینک کا نمبر ہو گیا تبدیل ، صنما!
مجھ کو تربوز بھی بادام نظر آتا ہے

OO

ایک ہے خوش رنگ جبکہ دوسری کالی بھجنگ
مختلف ہے دونوں کی تاثیر بھی باہم ، دگر
پھول کی پتی سے کٹ جاتا ہے ہیرے کا جگر
چائے کی پتی سے پاتے ہیں جلا قلب و نظر

OO

اب کس پہ اعتبار کروں ، کس پہ نہ کروں
ساجن بھی ایک چور ہے ، سرجن بھی رہزن
یہ دل کی تاک میں ہے ، وہ گردے کی تاڑ میں
لگتا ہے ، اب کے بچ نہ سکے گا یہ تن بدن

OO

✿ نعیم نیازی

معاملے میں آپ کو پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میں خود ہی ان کو مشاعرے کی تاریخ اور وقت سے آگاہ کردوں گا۔ رہا سوال اخراجات کا تو اس بارے میں بھی آپ کو کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ میرے یہ تمام شاعر دوست بلا معاوضہ اپنا کلام سنائیں گے۔ بس آپ کو اتنا ہی کرنا ہے کہ بیس کلو خشک رس ایک بڑی ڈبیا چائے' پانچ کلو چینی اور ایک من دودھ کا بندوبست کرلیں۔"

"مگر بے سرا صاحب اتنے سامان کا حصول بھی آج کل میری برداشت سے باہر ہے اس لئے آپ فی الحال اس مشورے کو مجھ پر نہ ہی مسلط کریں تو بہتر ہے۔" میں نے کچھ ہمت کر کے کہا۔

اب سپیکر صاحب بولے۔ "اچھا تو یہ بھی کوئی خاص پرابلم نہ ہوگی۔ آپ ایسا کریں کہ ان اشیاء کے لئے جتنی رقم چاہئے وہ بطور ادھار اور بلاسود مجھ سے لے لیں' ہم کو آپ پر اعتبار ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد واپس کردیجئے گا اور اگر مہینے ڈیڑھ مہینے تک واپس نہ کر سکے تو بھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں' ہم اپنے پیسوں کے بدلے آپ کا ٹی وی سیٹ لے لیں گے۔"

سپیکر صاحب کی بات سن کر ہمارا جی تو یہی چاہا کہ اس کم بخت کو الٹے ہاتھ کا ایک ایسا تھپڑ رسید کروں کہ اسے اپنی نانی یاد آجائے مگر صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا--- اور پھر ہمارا کوئی بس نہ چلا۔ ہمارے لاکھ پہلو بچانے کے بعد بھی ان دونوں نے ہماری بدقسمتی پر مشاعرے کی مہر ثبت کر ہی ڈالی۔

مشاعرے والے روز صبح صبح ہی سے دو بلائیں سپیکر اور بے سرا صاحب کی شکل میں ہمارے گھر نازل ہو چکی تھیں۔ انتظامات وغیرہ مکمل کرنے کے بعد یہ دونوں حضرات ہمارے دائیں بائیں منکر نکیر کی مانند بیٹھ گئے تھے اور گھنٹوں ہمیں اپنے قیامتانہ کلام سے نوازتے رہے' ساتھ ساتھ شعر اور شاعری کے ہزار ہا فوائد بھی بتا ڈالے تھے۔ جنہیں سن کر ہم زندگی سے بیزار ہو کر جنت دوزخ کے فلسفے پر غور کرنے لگے۔

بعد از مغرب بیس عدد راجہ داہر کے لشکری ہمارے ڈرائنگ روم میں جمع ہو چکے تھے جن میں بہتات ایسے انسانوں کی تھی جنہیں دیکھ کر یہی عقل میں آتا تھا کہ شاید ہاتھیوں سے پیوند کئے گئے ہیں---- اب یہ علم صرف بے سرا صاحب اور سپیکر صاحب کو ہی تھا کہ ان میں شاعر کتنے ہیں اور سننے والے کتنے۔ یہ دونوں حضرات تو ان تمام زندہ پہاڑوں سے ایک ایک کر کے خوب گلے بھی ملے تھے جبکہ ہم ان سب کو دیکھنے کے بعد اب تک تین مرتبہ شلوار تبدیل کر چکے تھے اور باقی شلواریں بھی سیف سے نکال کر کسی حادثاتی وقت کے لئے تار پر لٹکا رکھی تھیں۔ سپیکر صاحب کے مشورے کے مطابق مشاعرے سے پہلے ان شاعر نما حضرات کے کھانے پینے کا انتظام کیا گیا جس میں دیکھتے ہی دیکھتے من دودھ اور بیس کلو رس ختم ہو گئے جس کے باعث پانچ کلو خطائیاں' دس ڈبے بسکٹ اور پندرہ کلو دودھ اور لانا پڑا۔

بہر حال سو سو افراد کا کھانا کھا کر جب یہ بیس بائیس شاعر مشاعرے کے کمرے میں داخل ہوئے تو زلزلہ سا آ گیا۔ ہمارا پالتو کتا چیاؤں چیاؤں کی آواز نکالتا ہوا اچھل کر کھڑکی سے باہر کود گیا اور بلی اچار والے گھڑے میں گر پڑی جسے ایک شاعر نے دم سے پکڑ کر باہر نکالا اور پینتالیس کے زاویے پر گھما کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔

"اور یہ ہیں ہماری آج کی اس محفل مشاعرہ کے شاعر حضرات۔"

بے سرا صاحب اس وقت سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے بتا رہے تھے اور ہم صدارت کی کرسی (جس کی ایک ٹانگ چھوٹی تھی) پر بیٹھے ہوئے باضابطہ طور پر کانپ رہے تھے۔ جیسے جیسے شعرا اکرام کے نام سنائے جا رہے تھے' ویسے ویسے ہی ہمارے کانپنے کی رفتار میں تیزی اور پسینہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

"مجگو نیولا عرف چار سو صاحب' کرلا پہلوان المعروف چھری مار عرف شاعر بے ست' لکڑ پہاڑ عرف شاعر مغرب' ہڈی توڑ المعروف شاعر گردش' رودا پہلوان' خاکسار خان اور لاوہ صاحب۔"

بے سرا صاحب اپنی پوری ٹیم کا باقاعدہ تعارف کرانے کے بعد بولے۔ "اور یہ سٹیج سیکرٹری آپ کا پرانا خادم بے سرا' مہمان خصوصی سپیکر صاحب اور آج کی اس محفل کے صدر ہیں جناب طارق شاہین پنچھی صاحب جنہوں نے ہمیں بتلایا ہے کہ یہ آئندہ بھی ہر ماہ پابندی سے مشاعرہ منعقد کرواتے رہیں گے--- شاہین صاحب شاعروں کے بہت قدر دان ہیں۔ خود بھی ایک اعلیٰ ذوق شاعر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بے شک کوئی شاعر انہیں چوبیس گھنٹے اپنے پاس بٹھائے' کلام سناتا رہے یہ بڑی توجہ اور لگن سے سنتے رہتے ہیں اور کسی وقت بھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرتے۔ اگر آپ حضرات میں سے کوئی صاحب انہیں اپنا مکمل دیوان سنانا چاہے یا کسی قسم کی اصلاح لینا چاہے تو مشاعرے کے بعد بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے ان سے وقت لے سکتا ہے۔"

بے سرا صاحب کی زبانی اپنا اس قسم کا تعارف سن کر ایک دفعہ پھر حواس رخصت ہو گئے کہ خدا کی پناہ کہیں مشاعرے کے بعد بھی کوئی صاحب ہمیں نہ چمٹ جائیں۔ ویسے بے سرا صاحب کے بارے میں ہم یہی دعا کر رہے تھے کہ خدا کرے یہ ان کی زندگی کا آخری مشاعرہ ہو۔

بے سرا صاحب کی آواز پھر گونجی۔

”تو لیجیے صاحبان! سب سے پہلے میں دعوت دیتا ہوں جناب جگو نیولہ شاعر چار سو صاحب کو کہ وہ اسٹیج پر آ کر اپنا تعارف اور کلام سنائیں۔“

تالیوں کی گونج اور انسانی شکل میں ایک جن صاحب اسٹیج پر تشریف لائے۔ سب سے پہلے گرمجوشی سے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا۔ خدا کی پناہ بالکل یوں محسوس ہوا جیسے ہمارا ہاتھ کسی لوہے کے شکنجے میں کس دیا گیا ہو۔ بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پایا اور شاعر چار سو صاحب کی جانب متوجہ ہوئے جو کہہ رہے تھے۔

”سامعین وحضرات! اے صاحب برکات' جیسا کہ آپ سب جانتے بلکہ پہچانتے ہیں کہ میں اس دور کا ایک عظیم بلکہ عظیم الشان شاعر ہوں مگر--- مگر میں اس مقام تک کیسے پہنچا یہ ایک کہانی' ایک فسانہ' ایک ٹریجڈی وکامیڈی ڈرامہ ہے--- مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب میں نہ تو شاعر تھا نہ ریٹائر تھا۔ اس وقت میرا نام اے سے شروع ہو کر ڈی پر ختم ہو جاتا تھا مگر جب سے میں نے شاعری شروع کی تو پھر آپ حیران ہوں گے کہ میں شاعر بن گیا بلکہ شعروں کی بہتی ہوئی نہر بن گیا اور آہستہ آہستہ دریا کی موج اور سمندر کی لہریں بن گیا۔“

واہ واہ' سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں جنہیں سن کر شاعر چار سو صاحب کچھ اور پھول گئے اور بڑے اکڑ کر بولے۔

”اے میرے بھائیو' اے شاعری کے سپاہیو! شاعری ایک ایسی چیز ہے جو دماغ مانگتی ہے' محنت طلب کرتی ہے' توجہ چاہتی ہے اس لئے ہرایرا غیرا نتھو خیرا شاعر نہیں بن سکتا اس لئے جو شاعر ہوتا ہے' وہ شاعر ہوتا ہے۔ رات کو جاگتا ہے دن کو سوتا ہے۔ درد میں ہنستا ہے لذت میں روتا ہے۔ اپنا قلم خون دل میں بھگوتا ہے۔ کبھی کچھ پاتا ہے تو کبھی کچھ کھوتا ہے اور یہی نشانیاں ہیں ایک اصل شاعر کی' عشق کی لہر کی خالص زہر کی۔“

واہ جی واہ' کیا کہنے۔ ”نیولا صاحب زندہ باد' کا شور بلند ہوا جسے سن کر جگو نیولہ عرف شاعر سو صاحب نے گردن خم کر کے سامعین کا شکریہ ادا کیا اور آگے بولے۔

”تو سامعین! اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں ایک ڈائی فنر سے شاعر کیسے بن گیا۔ آج سے کوئی تیرہ چودہ یا دس پندرہ سال پہلے کا ذکر ہے' جب میں اپنی زمینوں پر خود ہی کاشتکاری وغیرہ کرتا تھا۔ بہت کھلا وقت ہوتا تھا سارے بدن پر صرف ایک کپڑا لپیٹے کھیتوں میں گھومتا پھرتا رہتا' گنے چوستا' شلجم کھاتا اور ماہیے ڈھولے گاتا تھا۔ ہماری بہت سی گائیں' بھینسیں اور بیل بکریاں ہوتی تھیں۔ ایک گائے سے تو مجھے بہت ہی پیار ہوتا تھا۔ وہ بھی میرے ہاتھ پیر چاٹتی رہتی تھی۔ میرے علاوہ اور کوئی بھی اس کا دودھ نہیں دوہ سکتا تھا۔ اگر کبھی کوئی اس کا دودھ نکالنا چاہتا تو اس کو ٹانگیں مارتی اور گھور گھور کر سینگوں سے بھی ٹکریں لگانے کی کوشش کرتی۔ ایک دفعہ اس کا مہینہ بھر کا بچھڑا مر گیا تھا جس سے گائے نے دودھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس گائے کا اپنا ایک اصول تھا کہ جب تک اس کا بچھڑا اس کے تھنوں کو منہ میں لے کر چوستا نہ تھا تو اس وقت تک گائے دودھ نہیں اتارتی تھی۔ اب جبکہ بچھڑا رضائے الٰہی سے اگلے جہان ہجرت کر چکا تھا تو یہ بات بہت پریشان کن تھی کیونکہ ہمیں بھی دودھ نہیں ملتا تھا اور گائے الگ بیمار ہو رہی تھی--- دو تین دن تو ایسے ہی گزر گئے۔ پھر میرے دماغ میں ایک ترکیب سمائی۔ چنانچہ اپنی اس

ملیں گے

جس طرح سے کنکر تمہیں دالوں میں ملیں گے
کچھ لوگ اسی جنس کے سالوں میں ملیں گے
اُمید دلاتا ہے یہ بجلی کا محکمہ
اِک دن تمام شہر اُجالوں میں ملیں گے
ناپید ہوئے جاتے ہیں کمھن سے یہاں لوگ
بڑی کی طرح لوگ کبابوں میں ملیں گے
چینی ہو یا چاول ہو کہ گھی ہو کہ ہو آٹا
کچھ دن میں ذرا دیکھنا' ساشوں میں ملیں گے
کیوں ڈھونڈتا پھرتا ہے کرپشن کے کھلاڑی
یہ لوگ تو سرکاری اداروں میں ملیں گے
اس دیس میں تعلیم و صحت' اَمن کے اعلان
جلسوں میں' حکمرانوں کے نعروں میں ملیں گے
بکرے کا بھنا گوشت' پراٹھے لذیذ تر
انڈے کے ساتھ خواب و خیالوں میں ملیں گے
وہ وقت بھی آئے گا کہ تم دیکھو گے سارے
جب اَمن کے قصے بھی کتابوں میں ملیں گے
اس دیس کے جو خیرخواہ لوگ ہیں اکبر
حیرت ہے کہ زنداں کی دیواروں میں ملیں گے

اکبر ملک' کراچی
موبائل: 0332-2136627

ترکیب پر عمل کرتے ہوئے میں چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلتا ہوا اور اچھلتا کودتا گائے کے پاس گیا۔ پھر اس کا تھن اپنے منہ میں لے کر چوسنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر گائے بہت خوش ہوئی اور میری ٹانگوں کو چاٹنے لگی اور اس نے دودھ بھی اتار لیا بلکہ پہلے کی نسبت دوگنا دودھ دیا۔ اَب مَیں روزانہ ایسے ہی کرتا۔ جب گائے دودھ اتار لیتی تو پھر برتن میں دودھ دوہ لیتا۔ یوں گائے کو مجھ سے اور مجھ کو گائے سے محبت ہوتی چلی گئی۔"

اِتنا کہنے کے بعد چار سو صاحب نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھری' جیب سے ایک کوریکس ڈیکف سیرپ کی چھوٹی شیشی نکالی اور ایک سانس میں ہی خالی کر کے پرے پھینک دی جو سیدھی جا کر سپیکر صاحب کی کھوپڑی سے ٹکرائی جس سے دھڑام کی آواز پیدا ہوئی اور سپیکر صاحب اپنا سر تھامے مادری اور قومی زبان کو ملا کر خالی شیشی کی شان میں گستاخی کرنے لگے مگر شاعر چار سو صاحب سپیکر صاحب کی حالت سے بے یاز گویا ہوئے۔

"ایک اندھیری رات کا ذکر ہے جبکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا اور ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی کہ ایسے میں چوروں کا داؤ چل گیا اور وہ بہت سے بیل' بھینس اور ساتھ ساتھ میری پیاری گائے کو بھی کھول کر لے گئے۔ صبح اٹھنے پر جب حالات کا علم ہوا تو میں بہت دیر تک روتا رہا۔ ڈیرے کے دوسرے لوگوں نے مجھے بہت دلاسے دیئے کہ صبر کرو' حوصلہ رکھو اور دل کو مضبوط کرو۔ کوئی بات نہیں ہمارا سارا مال مل جائے گا۔ ہم نے ایک بہت تجربہ کار کھوجی کو بلا بھیجا ہے۔ اس کو قدموں کی بہت پہچان رہتی ہے اب وہ آنے ہی والا ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد کھوجی بابا بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ہمارے ڈیرے پر آ پہنچا اور پھر ڈیرے کے تمام لوگ ایک جلوس کی شکل میں اس کی راہنمائی میں انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میری حالت بہت خراب تھی۔ مجھے باقی مویشیوں سے زیادہ اپنی گائے کی فکر تھی۔ میرا دل ہر لحہ خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ہر قدم پر میرے دل یں درد جاگ پڑتا تھا۔ رات کو زبردست بارش ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے قدموں کے نشان مٹ گئے تھے جس وجہ سے کھوجی کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا بالآخر کچھ دیر بعد کھوجی نے اعلان کر دیا کہ اب قدموں کے نشان تلاش کرنا ناممکن ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ واپس ہو لیا جائے اور پولیس کو اطلاع کی جائے۔

تھانے میں بھی مقدمہ درج کروایا۔ پولیس والوں نے بھی اپنے طور بہت کوششیں کیں یا شاید نہ کیں بہر حال کچھ پتہ نہ چلا کہ ہمارا مال کدھر نکل گیا ہے۔ میری حالت اب دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ ڈیرے پر جانا بھی چھوڑ دیا اور گھر میں بھی جی نہ لگتا تھا۔ اکثر پگڈنڈیوں پر یوں گاتا پھرتا---

نشاں بھی کوئی نہ چھوڑا کہ دل کو سمجھائیں
تیری تلاش میں جائیں تو ہم کہاں جائیں

اور کبھی کبھی بہت دل برداشتہ ہو کر یوں کہتا---

مجھ کو آواز دے تو کہاں ہے
تیرے بنا سونا سونا جہاں ہے

اسی طرح ایک دن چلتے چلتے گاؤں سے بہت دور نکل آیا اور پھر دوسرا' تیسرا' چوتھا' پانچواں نہ جانے کتنے گاؤں پیچھے چھوڑتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ رات ہوئی تو واپس آنے کا خیال آیا مگر اس وقت واپسی ناممکن تھی کیونکہ میں اپنے گھر سے بہت دور چلا آیا تھا۔ صحیح طور پر واپسی کے راستے کا علم بھی نہ تھا اور اندھیرا بھی چھا گیا تھا۔ قریب ہی ایک جھونپڑی پر نظر پڑی تو اس کے اندر چلا گیا۔ اس جھونپڑی کے اندر ایک ادھیڑ عمر کا شخص موجود تھا جس نے مجھے مسافر سمجھ کر رات اپنے ہاں رکھنے کی حامی بھر لی اور اچھی خاصی مدارت بھی کی۔ ایک چارپائی پر میرے لئے بستر کیا اور دوسری چارپائی پر خود سو گیا۔ مجھے نیند نہ آ سکی۔ گائے کی یاد رہ رہ کر مجھے تڑپاتی رہی جس سے دل برداشتہ ہو کر میں بالآخر انتہائی دردناک راگ میں گنگنانے لگا۔ پہلے پہلے چند فلمی نغمے گانے کے بعد پرسوز لے میں اپنے بنائے ہوئے گائے کے بارے میں یہ ذاتی شعر پڑھنے لگا---

میری پیاری پیاری گائے
تو جہاں کہیں بھی جائے
تجھے کوئی غم نہ آئے
رہیں سر پہ تیرے ہر دم
سدا بادلوں کے سائے
ہری ہری تو گھاس کھائے
تو ہمیشہ مسکرائے
میری پیاری پیاری گائے

یہ شاعری میں میرا پہلا قدم تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص رو رہا ہے۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور لالٹین روشن کی تو پتہ چلا کہ یہ میرا میزبان ہے جو کہ بستر کے اندر منہ کئے رو رہا ہے۔

پہلے تو میں بہت حیران ہوا' پھر حوصلہ کر کے آگے بڑھا اور اس کے منہ سے بستر ہٹا کر پوچھا کہ اے مہربان! تو آخر کس بات پر یوں بچوں کی

طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے؟ میری بات سن کر میرا میزبان آہستہ آہستہ اٹھا اور یوں بولا۔

''اے مسافر! تیری عبرتناک آواز اور جگر خراش اشعاروں نے میرے اندر مدت سے سوئے ہوئے درد کو جگا دیا ہے۔ میں بھی ایک شاعر تھا مگر بے قدر دُنیا نے میری قدر و قیمت کا اندازہ نہ لگایا اور ہمت افزائی نہ کی جس کے باعث نوبت فاقوں تک آ پہنچی اور میں بھوکا مرنے لگا۔ چوریوں کے باعث چور اور چور سے ڈاکو بن گیا۔ آج میرے پاس بہت کچھ ہے مگر وہ سکون جو بانسری بجانے اور اشعار لکھنے میں ملتا تھا' بالکل ختم ہو گیا ہے اور اب میں بتا کہ تو اتنا دکھی کیوں ہے اور یہ گائے کے شعر کیوں کر پڑھتا ہے؟''

اپنے میزبان کی بات سن کر مجھے پھر اپنی گائے کی یاد آ گئی اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنی ساری رام کہانی اس کے گوش گزار دی۔ جب میری درد بھری کہانی اختتام پذیر ہوئی تو میرا میزبان میرے قدموں میں گر پڑا اور بلک بلک کر رونے لگا ساتھ ساتھ کہتا رہا کہ اے شخص' اے مسافر تیری خوشیوں کا قاتل میں ہی ہوں۔ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے تجھے روگی بنا دیا ہے۔ میں ہی وہ بد بخت چور ہوں جس نے تمہارے ڈیرے پر چوری کی تھی۔ میرا گلا گھونٹ دو' مجھے جوتے مارو میں اس قابل ہی ہوں۔ تمہارے سارے جانور دوسرے صحن میں بندھے ہوئے ہیں وہ سب کے سب واپس لے جاؤ مگر افسوس! کہ تمہاری پیاری گائے میں تمہیں واپس نہیں کر سکتا کیونکہ--- کیونکہ جس دن میں چوری کے ڈنگر یہاں لایا تھا تو اس کے دوسرے دن ہی وہ گائے رو رو کر مر گئی۔ ہائے اللہ! اف میں کتنا ظالم ہوں۔''

جب اپنے میزبان کی زبانی مجھے یہ پتہ چلا کہ میری جند جان گائے میرے ہجر میں رو رو کر مر گئی ہے تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

اتنا کہنے کے بعد شاعر چار سو صاحب سٹیج پر ہی با آواز بلند رونے لگا۔ ان کو روتا دیکھ کر کمرے میں موجود بقایا شاعر بھی ڈھاریں مار مار کر رونے لگے اور مشاعرے کا کمرہ ماتم کدہ بن گیا۔ یکدم باہر کے دروازے پر دستک زبردست انداز میں مسلسل ہونے لگی۔ ہمارے گھر کے تمام افراد تو ایک شادی پر گئے ہوئے تھے۔ یہ دروازے پر کوئی اور ہی ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے صدارت کر کرسی چھوڑی اور اٹھ کر باہر کا دروازہ کھولا۔ باہر محلے بھر کے تمام افراد جمع تھے۔ ان میں سے ہمارا دوست اسد محمود دیر آگے بڑھا اور گھبرائے ہوئے انداز میں اسے رونے دھونے کی وجہ پوچھنے لگا۔ جواب میں ہم نے بھی باقاعدہ روتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا کہ اے بھائی! کوئی اور بات نہیں اندر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ ہماری اتنی بات کہنے کی دیر تھی کہ گلی میں موجود تمام افراد سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔ ہمارے کزن اسد محمود دیر نے ایک حسرت بھری نگاہ ہمارے چہرے پر ڈالی اور ایک گہری آہ بھرتا ہوا بوجھل بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس گیا۔

میں واپس مشاعرہ روم میں آ گیا۔ اس وقت تک بے سرا صاحب دلاسہ وغیرہ لے کر نیولہ صاحب کو چپ کرا چکے تھے۔

ان کو خاموش ہوتے دیکھ کر دوسرے افراد بھی نارمل حالت میں آ گئے۔ اب شاعر چار سو صاحب پھر گویا ہوئے۔

''بھائیوں' دوستو! اس کے بعد وہ چور خود ہی میرے سارے مویشی میرے ڈیرے پر چھوڑ گیا۔ دوسرے لوگوں کا بھی تمام مال و اسباب واپس کرنے کے بعد اس نے آئندہ چوری چکاری سے ہمیشہ کے لئے توبہ کی مگر میری پیاری گائے واپس نہ آ سکی۔ گائے کی جدائی میں ہی شعر کہتے کہتے میں شاعر بن گیا۔ دشمن شعراء کے لئے قہر بن گیا' قدر دانوں کے لئے نسیم سحر بن گیا۔ غزلیں لکھنے میں ماہر ہو گیا اور الغرض راجہ داہر بن گیا--- اور آج آپ کے سامنے شاعر چار سو کی حیثیت سے کھڑا ہوں تو لیجئے اب سنیئے میری ایک تازہ غزل۔''

نیولا صاحب نے پہلے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا پھر بولے---

ساجن میرے کی آنکھوں میں کاجل کی دھار ہے
جیسے کوئی اڑتی ہوئی کونجوں کی ڈار ہے
لنڈے کی ہے قمیص ہماری تو کیا ہوا
محبوب کی بھی ایسی ہی اک شلوار ہے
سن کر ہماری بات کہا میری جان نے
آج آ سکوں گی نہ ملنے مجھ کو بخار ہے
کاٹا تھا اس کو شہد کی مکھی نے آنکھ پر
مَیں نے یہ سمجھا یار پہ چھایا خمار ہے
کل اس نے کھینچ کر میری مونچھیں اکھاڑ دیں
مَیں درد سے چلایا تو بولی یہ پیار ہے
ڈالا تھا آج اس نے دوپٹہ گلے میں یوں
میں دور سے یہ سمجھا کہ جوتوں کا ہار ہے
اتنی تو تنخواہ بھی نہیں ابو جان کی!
جس قدر مارکیٹ میں اپنا ادھار ہے
چل قسمت آزمائیں کہیں اور چار سو
اس شہر میں تو ہر کوئی ہم سے بیزار ہے

واہ واہ کیا کہنا' کیا کہنے سبحان اللہ' سبحان اللہ! شاعر چار سو زندہ باد

کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور کمرے کے مغربی حصے کی دیوار گر پڑی مگر شاعروں کے اس سیلاب نے دیوار کے گرنے کا کچھ اثر نہ لیا اور بدستور اپنی آتش فشانی میں معروف رہے۔ شاعر چار سو اپنا کلام سنا کر یہ کہتے ہوئے سٹیج سے اتر گئے کہ اچھا شاہین خاں مشاعرے کے بعد تم کو اپنا مکمل دیوان سناؤں گا۔

بے سرا صاحب سٹیج پر آئے اور بولے۔۔۔

ڈالا تھا آج اس نے دوپٹہ گلے میں یوں
میں دور سے یہ سمجھا کہ جوتوں کا ہار ہے

یہ تھے جناب جگو نیولہ المعروف شاعر چار سو جنہوں نے اپنا تازہ اور باسی ملا جلا کلام آپ کو سنایا۔ اَب میں دعوت دیتا ہوں' جناب کرلا پہلوان المعروف شاعر جنوب صاحب کو جن کا نام سنتے ہی یہ فقرہ ذہن میں گونج اٹھتا ہے کہ۔۔۔:

"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہی ہے"

جناب شاعر جناب صاحب۔

تالیوں کی گونج میں ایک افریقی طرز کے شاعر محترم جھومتے ہوئے اسٹیج پر تشریف لائے اور آتے ہی گویا ہوئے۔

سامعین! تعارف وغیرہ بعد میں پہلے اردو کے چند شعر۔۔۔

جب کان میں ہو درد تو دارو ہی ڈال دیں
جب آنکھ میں ہو درد تو عینک اتار دیں

اور آگے عرض کیا ہے کہ
مکرر مکرر کا شور بلند ہوا۔۔۔

آیا کبھی جو لوٹ کے میں تیرے شہر میں
سب مل کے پھر نہائیں گے اس چھوٹی نہر میں

واہ واہ' مکرر مکرر' ماشاء اللہ سبحان اللہ' کیا کہنے' جزاک اللہ کے شور میں ہم نے بھی آہستہ سے کہہ دیا کہ "استغفر اللہ۔"

اچھا تو سامعین! ایک اور شعر عرض کرتا ہوں۔ یہ بھی اردو زبان کا ہی ہے۔ اس شعر کے بعد آپ کو اپنی ایک نظم سناؤں گا جو میری اپنی تخلیقی زبان میں ہے تو سنیئے یہ شعر۔۔۔

گرتے ہی چیخا زور سے وہ اُف اللہ ہم گئے

واہ واہ کیا کہنے کا شور بلند ہوا اور ہم سوچنے لگے کہ اس ماحول سے کب رہائی ممکن ہو سکے گی۔ ہم بالکل یہی محسوس کر رہے تھے کہ مشاعرہ نہیں ہو رہا بلکہ کسی جیل خانے میں آ گئے ہیں جہاں ہاتھیوں کی چنگاڑیں ہمارے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی ہیں۔

اسی لمحے شاعر جنوب سدھیر کی آواز میں گرجے۔۔۔

گرتے ہی چیخا زور سے وہ اُف اللہ ہم گئے
ہم بھی تھے گرنے والے ہی' یہ سن کر تھم گئے

"تھم گئے" کہتے ہوئے انہوں نے اپنے پندرہ کلو وزنی ہاتھ کو پچپن ڈگری کے زاویے پر گھماتے ہوئے ایک عدد بھرپور تھپڑ ہمارے کاندھے پر رسید کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کاندھا بمعہ بازو اپنی جگہ سے اتر گیا ہے۔ پھر دوسرے لمحے نے ہمیں اس ماحول سے بے نیاز کر دیا' ایک خوبصورت وردی تھی جس میں ہم چہل قدمی کر رہے تھے۔ چاروں طرف سبزہ زار پہاڑیاں' شہد ابلتے چشمے' ناریل اور سفیدے کے حسین درخت' دلکش بادِ صبا کے فرحت بخش جھونکے' شاندار جھیل' الغرض جنت کا سا سماں اچانک ایک طرف سے ایک پری اڑتی ہوئی آئی اور ہمارے پاس کھڑی ہوگئی۔ "تو کون ہے اور تیرا نام کیا ہے؟" گھنٹیوں کے بجنے کی نغماتی اور ترنم سے بھرپور آواز سنائی دی۔ اسی لمحے ایک کالے دیو نے ہماری گردن پکڑ کر کہا۔

"اب آخر میں آج کی محفل کے صدر صاحب سٹیج پر تشریف لاتے ہیں۔۔۔ سامعین! تالیاں۔"

اَب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم ابھی تک محفل مشاعرہ میں ہی موجود ہیں اور ہماری بے ہوشی کے عالم میں ہی تمام شعراء اکرام اپنا اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ خیر یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔

اچانک شور بلند ہوا کہ صدر صاحب جلدی آیئے اور اپنا کلام سنایئے۔ ہم کہاں اور شاعری کہاں۔ خیر اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کو پکڑ کر اٹھے جو کہ پہلے کی نسبت ڈبل ہو چکا تھا اور سٹیج پر پہنچ کر کہا۔

"میں آپ جیسا شاعر تو نہیں ہوں اور نہ ہی اتنے اُستادوں کے درمیان بول سکتا ہوں اس لئے ایک شعر میں ہی اپنے تاثرات بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ارشاد ارشاد کا شور بلند ہوا اور ہم نے اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہہ ہی دیا۔۔۔

بے وقوفیاں سمیٹ کے سارے جہاں کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا سر بنا دیا

یہ سنتے ہی بے سرا صاحب نے مشاعرے کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور ہمیں داد دینے کے سے انداز میں گردن پر ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ جی تو یہی چاہا کہ پھر بے ہوش ہو کر اسی مثالی وادی کا رخ کیا جائے لیکن خود کو سنبھال ہی لیا۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا' اس کی ایک جھلک تو شروع میں ہی آپ کو سنا چکا ہوں۔

☆☆

☆ محمد ریحان

قصہ ایک ماتم کا

''حضرات ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیں۔ ماسٹر احمد دین کے بھتیجے' غفور حیدر کے سالے' میاں ساجد کے بڑے بھائی' میاں ماجد دودھ جلیبی والے لنگوٹی یار' راجہ بشارت کے سگے چچا' مرحوم راجہ اقبال کے چھوٹے بیٹے' راجہ رحمت کے قریب یار زیڈ اے بخاری پہلوان کے والد رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ شام کے چار بجے نیو ٹائم اینڈ تین بجے اولڈ ٹائم کے مطابق پرانے قبرستان کی جنازہ گاہ میں ادا کی جائے گی۔ سب لوگ ٹائم نکال کر ضرور جنازہ پڑھنے آئیں۔ اس جنازہ کی خاص بات یہ ہے کہ شہر کے ناظم بھی تشریف لائیں گے۔ جنازہ کے بعد مرحوم کے رہائش گاہ پر ''ریفریشمنٹ'' کا خصوصی انتظام بھی ہے۔''

یہ اعلان ہمارے گھر کی قریبی مسجد میں ہو رہا تھا جس نے صبح سویرے ہمیں جگا کر رکھ دیا۔ موذن صاحب نے اعلان ایسا گھما پھرا کر کیا تھا کہ سمجھ ہی نہ آیا کہ کون صاحب فوت ہوئے ہیں۔ اعلان کرنے والے نے مرحوم کے دوست احباب کا ''شجرہ نصب'' تو گنوا دیا تھا مگر مرنے والے کا نام بتانا مناسب نہ سمجھا۔ جنازہ میں جانا ضروری تھا اس لئے نہیں کہ بعد میں ریفریشمنٹ کا اہتمام ہے بلکہ اس لئے کہ یہ محلے کا ماتم تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ کون صاحب فوت ہوئے ہیں' کس پہلوان جی کے ابا جی اس فانی دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں کیونکہ ہمارا محلہ پہلوانوں سے بھرا ہوا ہے' ہم نے فوراً میاں اعجاز صاحب کو فون کیا۔ اعجاز صاحب ہماری گلی کے آخری نکڑ والے گھر میں رہتے ہیں اور ہمارے جگری یار ہیں۔ جہاں کہیں بھی جانا ہو' ہم اکٹھے ہی جاتے ہیں۔

''یار! کون صاحب فوت ہوئے ہیں؟'' ہم نے فوراً ہی اعجاز سے پہلا سوال کر ڈالا۔

''مجھے تو اعلان کی سمجھ ہی نہیں آئی ---- تو یہ فوتگی کا اعلان تھا؟ میں سمجھ رہا تھا کہ کوئی جلسہ وغیرہ ہو رہا ہے ----'' اعجاز صاحب ہم سے بھی ایڈوانس نکلے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اعجاز صاحب مزید گویا ہوئے۔ ''یار! یہ میڈیا کا دور ہے' جیو لگاؤ ابھی سلائیڈ چل پڑے گی اور پتہ لگ جائے گا۔''

''ہاں' یار! دور تو میڈیا کا ہی ہے مگر اس قسم کی خبریں جیو نشر نہیں کرتا' کسی کے مرنے کی پہلی خبر ''آج'' والے نشر کرتے ہیں۔''

ہم نے بھی اعجاز صاحب کی معلومات میں اضافہ کیا اور فون بند کر کے T.V کے سامنے بیٹھ گئے۔

کافی دیر تک جب کوئی خبر نظر نہ آئی تو ہم گھر سے باہر آ گئے کہ شاید کسی سے اس بارے میں پتہ لگ جائے۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ ہمیں آنٹی غل ہما آتی نظر آئیں۔ یقیناً آنٹی کو علم ہو گا اور ویسے بھی خواتین کے پاس تو محلے بھر اور گرد و نواح کے محلے کی بھی خبریں ہوتی ہیں ---- حال احوال پوچھنے کے بعد ہم نے آنٹی سے پوچھا۔

''آنٹی! وہ ڈیتھ کس کی ہوئی ہے' جس کا صبح سویرے اعلان ہو رہا تھا؟''

آنٹی فوراً بولیں۔ ''ہاں میں بتانے ہی والی تھی۔ وہ کبڈی کے مشہور پہلوان اور فٹ بال کے سابقہ گول کیپر کے ابا جی کا انتقال ہوا ہے۔''

آنٹی کی وضاحت سے ہمیں تسلی ہوئی کیونکہ ہم ان پہلوان جی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہم نے آنٹی سے مزید انفارمیشن چاہی۔

''آنٹی جی! وہ کیسے مرے' انہیں ہوا کیا تھا؟''

وہ کہانی اور ہے

جو حقیت کل چھپی تھی ، وہ کہانی اور ہے
آج اک تازہ خبر ہے ، اک پرانی اور ہے
روز سنتا ہوں میں تیرے عشق کے قصے نئے
کل فسانہ اور تھا ، اور یہ کہانی اور ہے
کل جو وہ تھی ساتھ تیرے ، وہ بھی تھی بیگم تری
آج جو ہے ساتھ تیرے ، یہ زنانی اور ہے
عاشقی کے کھیل میں رسوا ہوئے ہم بھی بہت
اک نشاں ماتھے پہ گہرا ، اک نشانی اور ہے
بعد پٹنے کے ہوا یہ راز ہم پر بھی عیاں
عشق بازی چیزے دیگر ، چھیڑ خانی اور ہے
مجھ کو آپ سادہ دے کر ،کر دیا احسان ، بس!
جو گلابی پی رہا ہے ، وہ تو پانی اور ہے
روز کرتی ہے اشارے اپنی کھڑکی سے مجھے
ایک بیگم گھر میں میرے ، اک دیوانی اور ہے
دے کے خط قاصد نے مجھ سے یہ کہا کہ دیکھئے
اس میں مضمون اور ہے ، اور منہ زبانی اور ہے
آج پھر اخبار پڑھ کر دیر تک روتا رہا
لوڈشیڈنگ کی خبر ہے ، آنی جانی اور ہے
چلتے رکشے میں ہواپیدا وطن کا نونہال
ملک آگے جا رہا ہے ، یہ نشانی اور ہے
میں لکھوں ایسی غزل کہ جس کو گائے بے سرا
میری خواہش اور ہے ، حسرت موہانی اور ہے
یہ ضروری تو نہیں ، ہر شعر کی تعریف ہو
کہنہ مشقی اور محرم خوش بیانی اور ہے

✿ محمد رفیع یوسفی محرم

"بیٹا! مجھے صحیح طرح تو معلوم نہیں کہ انہیں کیا ہوا تھا ہاں' اتنا پتہ چلا ہے کہ مرحوم نے رضائی اوڑھی اور مر گئے۔"

"ہائیں' رضائی اوڑھنے سے؟---اس گرمی کے موسم میں رضائی اوڑھنے کی کیا ضرورت تھی' یہ آپ کو بتایا کس نے؟" ہم نے حیرت سے آنٹی سے دریافت کیا۔

"وہ بیٹا! ابھی مسجد میں اعلان ہوا تھا کہ وہ رضائی لے کر انتقال کر گئے ہیں۔"

"ارے' نہیں آنٹی!" ہم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "آنٹی! وہ رضائی لے کر نہیں بلکہ اعلان کرنے والا کہہ رہا تھا کہ رضائے الٰہی' یعنی اللہ کی مرضی کے مطابق انتقال کر گئے ہیں۔"

"ہاں' بیٹا! بس کچھ اسی قسم کا اعلان تھا۔ میں نے توجہ سے سنا تو نہیں تھا۔ مرنا تو ظاہر ہے اللہ کی مرضی سے ہی ہے۔" ہماآنٹی کچھ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"آنٹی ہما سے گپ شپ لگا کر ہم واپس گھر آئے اور آتے ہی بیگم سے کہا کہ ہمارا وائٹ والا سوٹ فوراً پریس کر دو' ہم نے جنازہ میں جانا ہے اور کھانے پر ہمارا انتظار نہ کرنا۔" اس سے قبل کہ ہم بیگم سے مزید کچھ کہتے' اعجاز کا فون آ گیا۔

"یار! پتہ چل گیا ہے کون مرا ہے۔" اعجاز نے خوشی اور غمی کے ملے جلے جذبات میں بتایا۔

"کس آنٹی نے بتایا؟" ہم نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اعجاز بھائی کچھ دیر خاموش رہے' شاید سمجھ ہی نہ سکے کہ ہم کیا کہنا چاہ رہے ہیں' پھر بولے۔

"مرنے کی خبریں آنٹیوں سے نہیں' انکلوں سے ملتی ہیں۔ آنٹیوں کے پاس تو شادی کی خبریں ہوتی ہیں۔"

"اوہ' خوب فرمایا۔ ہمیں بھی پتہ چل چکا ہے' تم یہ بتاؤ کہ کب آ رہے ہو؟"

"بس کھانا کھا کر ایک گھنٹہ تک آیا سمجھو۔"

"ارے' یار کھانے وانے کو چھوڑو' دیر ہو جائے گی۔ پہلوان جی سے کام وام بھی پوچھنا ہے۔ تمہیں پتہ تو ہے کہ پہلوان دیکھنے میں تو پہلوان ہے مگر عقل سے فارغ ہی ہے۔" ہم نے جلدی جلدی اعجاز کو آنے کی تلقین کی۔

"اچھا یار! ایک بات پوچھنی ہے؟" اعجاز نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں' دو باتیں پوچھو کیا مسئلہ ہے۔" ہم نے بھی آہستگی سے جواب دیا۔

سنا ہے عاشق کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلتا ہے' کیا بینڈ باجے والے ساتھ ہوتے ہیں؟ 😀 توصیف احمد

"یار! سوٹ کونسا پہن کے جا رہے ہو؟"

"ارے یار! تم نے تو پریشان ہی کر دیا تھا کہ پتہ نہیں شاید جنازہ کی دعا پوچھنے لگے ہو---" ہم نے مسکراتے ہوئے اعجاز سے کہا۔ "کوئی سادہ سا سوٹ پہن لو جنازہ میں جانا ہے۔"

وہ تو ٹھیک ہے مگر لگتا ہے دھلا ہوا کوئی نہیں ہوگا۔ میں تو جینز میں آ رہا ہوں۔" اعجاز نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

"یار! جس ڈریس میں مرضی ہے آؤ' بس کوئی پہن آؤ اور پہنچنے کی کرو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

ہم نے بھی فیصلہ کن انداز میں جواب دیا اور فون بند کر کے اعجاز کا انتظار کرنے لگے۔

آدھے گھنٹہ میں اعجاز اپنی گاڑی میں آن پہنچا۔

"یار! گھر تو پتہ ہے نا؟" اعجاز نے آتے ہی پوچھا۔

"یار! بچی بات ہے پتہ تو نہیں ہے۔ جہاں شامیانے لگے ہوں گے' سمجھو وہی ماتم کا گھر ہوگا۔" ہم نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اعجاز کو تسلی دی۔

کچھ ہی دیر میں ہم شامیانے والے گھر کے سامنے تھے۔ گاڑی ایک سائیڈ پر پارک کرنے کے بعد ہم اندر جانے کے لئے بڑھے۔ گیٹ پر دو نوجوانوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔ کرسیوں پر کافی سارے لوگ خاموشی سے بیٹھے تھے۔ لگتا تھا کہ مرحوم کے مرنے کا ان پر گہرا اثر ہے جبھی تو خاصے غمگین ہیں۔ ہمیں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آیا تو چند افراد کے بیچ ہم بھی بیٹھ گئے جو آپس میں سرگوشیوں میں مصروف تھے اور لگتا تھا کہ مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اعجاز صاحب نے خاموشی کو توڑا اور بولے۔

"بھائی صاحب! ہمیں انکل کی اس ناگہانی موت کا بڑا افسوس ہے۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آپ سب کو صبر دے۔"

"جی' آپ کیا فرما رہے ہیں' کس کے مرنے کا افسوس کر رہے ہیں آپ لوگ؟---آپ کہاں آئے ہیں اور کس سے ملنا ہے؟"

"جی' یہ پہلوان جی کے اباجی کا گھر نہیں ہے؟" ہم نے صورت حال خراب ہوتی دیکھ کر بیچ میں لقمہ دیا۔

وہ صاحب کچھ سمجھ گئے کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں' بولے۔

"برادران! آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ یہ ماتم کا گھر نہیں بلکہ یہاں تو شادی ہو رہی ہے۔"

روح آنیات (ہائیکو)

انٹرنیٹ

وہ انٹرنیٹ پہ سولہ سول کی تھی
پاس آئی' پچاس کی نکلی
مَیں نے دادا کو پھر Refer کر دی

ملکیت

اپنی محبوبہ پہ شاعر اکثر
جہان سارا وار دیتا ہے
جیسے یہ باپ کی ملکیت ہو

گیند

میری "ناکنگ" پہ وہ نکلی گھر سے
مَیں بولا' گیند آ گری ہے یہاں
بولی' ماں! گیند اس نے ماری ہے

چاہت

وہ بولی' کتنا چاہتے ہو مجھے
مَیں بولا' اتنی پسند ہو مجھ کو
کہ تیری جیسی ایک اور بھی ہو
مَیں ہوں نا

ایک ملا سے اک عورت بولی
اگر کوئی مجھ کو نہ بیاہے تو پھر؟
وہ بولا' مَیں تو ابھی زندہ ہوں

غیرتی شوہر

شوہر بیوی کا زیور بیچتے وقت
بولا' اتنا بھی نہ بے غیرت ہوں
ذرا یہ "نت" تو پاس رہنے دو

انوکھی داد

کسی نے داد نہ دی محفل میں
مگر شاعر کے شعر میں دم تھا
اچانک کتے زور سے بھونکے

میک اَپ

خدا غارت کرے میک اَپ کی وبا
کل جو بارش میں شرابور ہوئی
اپنی بیگم کو نہ پہچان سکا

L.B.W

مَیں دَر یار سے نہ جاتا' مگر
گیند "دُشمن" نے پیر پہ ماری
یار کا باپ بولا' L B W آؤٹ

روح' مردان
موبائل: 0300-5713018

یہ سنتے ہی ہمیں کچھ شرمندگی سی ہوئی' وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہم نے فوراً بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ باہر آ کر ہم نے بمشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کیا۔ اعجاز گلہ کرنے لگا کہ ہم نے گھر کا صحیح پتہ کیوں معلوم نہ کیا۔

''یار! ناراض مت ہو' یہاں حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ یہ شادی نہیں بلکہ ماتم کدہ ہی لگ رہا تھا خیر' اب جہاں بھی شامیانے نظر آئے' پوچھ کر ہی اندر داخل ہوں گے۔''

ابھی ہم گاڑی کے قریب ہی آئے تھے کہ ایک جانی پہچانی آواز سماعتوں سے ٹکرائی یہ فیضو نائی کی آواز تھی۔

''آؤ' فیضو! کہاں کا ارادہ ہے؟ شادی والے گھر دیگیں چڑھانی ہیں یا ماتم والے گھر؟''

''جا تیو! شادی والے گھر تو رات کافی کچھ پکا گیا تھا' اب صبح صبح ماتم والے گھر سے آرڈر آیا تھا' اسی طرف جا رہا ہوں۔'' فیضو نے تھکے تھکے اپنی سانس بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

''فیضو! پہلوان کے گھر کا تو پتہ ہے نا؟'' اعجاز نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر احتیاطاً پوچھا۔

''جی' باؤ جی! مجھے محلّہ کے ایک ایک پہلوان کا گھر پتہ ہے' آپ بےغم ہو جائیں۔'' فیضو نے پہلوانوں کی طرح اکڑتے ہوئے جواب دیا۔

یوں ہم ماتم والے گھر پہنچ گئے۔

یہاں کا ماحول شادی والے گھر سے خاصا مختلف تھا۔ کافی چہل پہل تھی۔ لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا' نہایت فینسی قسم کے شامیانے لگے ہوئے تھے اور لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے' بحث و مباحثے ہو رہے تھے۔ ہمیں ایک مرتبہ پھر شک ہوا کہ شاید یہ وہ جگہ نہیں جہاں ہمیں آنا تھا۔ مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی' کچھ چہرے جانے پہچانے نظر آئے۔ ہم بھی آرام دہ کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ ایک کونے پر پنکھے کے سامنے زیڈ اے بخاری پہلوان صاحب اداس بیٹھے نظر آئے۔ تعزیت کے لئے ہم بھی پہلوان صاحب کے پاس جا بیٹھے۔

''پہلوان بھائی! انکل کی وفات کا بڑا افسوس ہے۔ اللہ ان کی بخشش فرمائے' ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو صبر دے۔ ہمیں ان کی اس اچانک موت کا بڑا ہی افسوس ہے۔''

اعجاز نے ایک ہی سانس میں اپنے خیالات کا اظہار کر ڈالا اور کرسی پر ٹیک لگا کر پاؤں چوڑے کر کے بیٹھ گیا۔ ہمیں کچھ مزید کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی' سب کچھ تو اعجاز نے کہہ ڈالا تھا۔ اردگرد بیٹھے لوگ ہماری جانب متوجہ ہو گئے گویا ہم نے پہلوان صاحب سے تعزیت نہیں بلکہ کوئی انہونی بات کر دی ہو۔ شاید انہیں یہ توفیق نہیں ہوئی تھی۔ پہلوان صاحب خاموشی سے سر جھکائے ''آمین آمین'' کہتے رہے۔

''پہلوان صاحب! کوئی کام وام ہے تو بتائیں۔'' ہم نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

اس سے قبل کہ پہلوان صاحب کوئی کام بتاتے' باہر کی جانب سے ہائے وائے اور بین کرنے کی مختلف آوازیں سماعتوں سے ٹکرائیں۔ سارا مجمع باہر کی جانب لپکا کہ نا جانے باہر کیا بلا آ گئی ہے۔ یہ مرحوم کے قریبی رشتہ داری کی پارٹی تھی جو شاید دور کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ خواتین کا بین نمایاں تھا' مرد حضرات بھی کم نہ تھے' ان کے بین بھی جاری تھے--- بہرحال' ان کو اس وقت مرحوم کے بچھڑ جانے کا خاصا غم تھا جبھی تو گلے پھاڑ پھاڑ کر بین کر رہے تھے۔ اہلِ محلّہ انہیں ایسے اہتمام سے کھڑے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی مداری تماشہ دکھا رہا ہو۔ گھروں میں بند لوگ جو ٹائم پر باہر نہ آ سکے تھے' اپنے مکانوں کی چھتوں سے یہ سین براہ راست دیکھا۔ خواتین تو گھر کے اندر چلی گئیں' مرد حضرات پہلوان اور ان کے مزید قریبی عزیزوں سے گلے آن لگے۔

''یار' بخاری! بڑی مشکل سے آئے ہیں۔ کوئی گاڑی نہیں مل رہی تھی' اسپیشل ٹیوٹا بک کیا ہے۔ اسنے پورے تین ہزار یہاں تک لئے ہیں لیکن لایا بڑی تیز ہے۔ موٹر وے سے آیا ہے۔''

ایک اور صاحب آگے بڑھے اور پہلوان صاحب سے گلہ کرنے لگے۔

''بیٹا! انکل جب معمولی بیمار تھے تو تم کو بتا دینا چاہئے تھا' کم از کم ہم ان کو زندہ حالت میں دیکھ تو لیتے' ہائے' اب افسوس ہی رہے گا۔''

ایک اور بزرگ آگے بڑھے اور بولے۔ ''دو ماہ قبل شہر ملاقات ہوئی۔ لنڈے میں کچھ تلاش کر رہے تھے' اس وقت تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ چال ایسی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ دو ماہ بعد مر جائیں گے۔ ہائے' میرے تو بڑے پکے دوست تھے۔''

غرض مرحوم کے دوست اور رشتہ دار آتے اور اپنی اپنی سنا کر مجمع میں بیٹھتے جاتے۔ افسوس کم ہی کر رہے تھے' اپنی اپنی زیادہ سنا رہے۔ پہلوان جی بھی بڑی دلجمعی سے برداشت کر رہے تھے۔ یہ تمام احباب پہلوان سے ہاتھ ملاتے اور کرسیوں پر جا کر تشریف فرما ہو جاتے اور بس پھر لمبی بحث و مباحثے شروع ہو جاتے۔ کچھ ہی دیر میں اس مجمع نے مختلف ٹولیوں کی صورت اختیار لی۔ ہر ٹولی میں چار سے پانچ افراد تھے۔ انہوں نے کرسیاں آگے پیچھے کر کے دائرہ کی صورت اختیار کی۔ زیادہ بحث ''ججز'' کے ایشوز پر چھڑی ہوئی تھی۔ ایک دوسرے گروپ میں

لوڈشیڈنگ کا مسئلہ زیر بحث تھا' سابقہ گورنمنٹ کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا تھا۔ کہیں پنجاب گورنمنٹ کی دو روپے کی روٹی پر نظریں لگی ہوئی تھیں' کہیں آٹا نہ ملنے کا شکوہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ چاند نظر آنے یا نہ نظر آنے پر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کو بھی لوٹا کریسی سے تشبیہ دی جا رہی تھی۔ ہر موضوع پر گپیں لگ رہی تھیں' کوئی موضوع اگر نہیں تھا یہ کہ مرحوم کو کوئی اچھے لفظوں میں یاد نہیں کر رہا تھا۔ کوئی اس کے ساتھ بِتی یادوں کو زبان پر نہ لا رہا تھا اور نہ ہی کوئی مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا گو تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی ہانک رہا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر صاحب لڑکھڑاتے قدموں مجمع میں داخل ہوئے اور پہلوان صاحب کو دیکھتے ہی بولے۔

''کیا مر گئے--- ہائے' میرے تو بڑے ہی عزیز تھے۔ منع بھی کیا تھا ان حکیموں کے چکروں میں نہ پڑو' یہ دیسی کشتے مہنگے پڑیں گے مگر ہائے اس نے اپنے باپ کی بھی نہ مانی تو میری کیا مانتا--- ہزار بار کہا کہ اچھے ڈاکٹر سے چیک کراؤ مگر ڈاکٹروں کو تو مانتا ہی نہ تھا۔''

یہ ادھیڑ عمر صاحب ایسے انداز میں باتیں کرنے لگے گویا وہ تعزیت کرنے نہیں' گلے شکوے کرنے آئے ہیں۔ افسوس صد افسوس! کہ مرحوم نے ان کی ایک نہ سنی ورنہ شاید آج زندہ ہی ہوتے۔

''قبر تیار ہو گئی ہے۔''

اس سے قبل کہ ادھیڑ عمر صاحب کچھ اور بولتے'' مجمع میں ایک نوجوان نے داخل ہوتے ہی اعلان کیا۔ مجمع میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''اتنے دور کے قبرستان میں دفن کرنے کی کیا ضرورت ہے' یہیں کہیں ''سپرد خاک'' کر دیتے۔''

ایک صاحب نے پریشانی کے عالم میں دوسرے صاحب سے سرگوشی کی گویا انہوں نے روزانہ نہار منہ جا کر فاتحہ پڑھنی ہو۔

ہمیں بھی یہاں آئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اعجاز بار بار پیٹ کی جانب اشارے کر رہا تھا' ہمیں بھی کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ہم اور اعجاز مجمع سے باہر آ گئے۔ گھر کے پچھواڑے ایک خالی پلاٹ میں فیضو دیگیں پکانے میں مصروف تھا۔

''یار فیضو! کھانا تیار ہے کیا' مہمان بھی خاصے آ چکے ہیں؟ ہم نے فیضو کی مصروفیت دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں' باؤ جی! بس تیار ہی ہے۔ بتائیں کیا پیش کروں؟'' فیضو نے پسینہ صاف کرتے ہوئے ہم نے پوچھا۔

''رہنے دو فیضو! یہ بتاؤ کیا کیا پکا رہے ہو؟''

''باؤ جی! قورمہ' سٹیم روسٹ' چکن بریانی تیار ہے۔''

فیضو نے ایک بڑی سی ٹرے میں یہ سب کچھ پیش کرتے ہوئے مزید بتایا کہ آدھے مہمان یہاں پر ہی آ کر نوش کر چکے ہیں۔ صبح سے آئے ہوئے ہیں سارا دن بھوکا تو نہیں رہا جا سکتا۔ ہم نے اور اعجاز کے خوب سیر ہو کر کھایا اور مجمع میں وہی پہلی سی معصوم سی صورت لے کر آن بیٹھے۔

کچھ دیر بعد پہلوان صاحب کے ایک رشتہ دار مجمع میں داخل

گرمی

وہ یہ کہتی ہے ، مری گرم جوانی ، گرمی!
میں یہ کہتا ہوں ذرا لاؤ نا پانی ، گرمی!
سردیاں اور نہانے کا تصور ، توبہ!
ہے محبت کی بڑی خاص نشانی ، گرمی!
ایک سورج کی طرف سے یہ برستی ہوئی آگ
آگ ، اور آگ نگاہوں کی کہانی ، گرمی!
روٹیاں سینک لو چاہو تو بدن پر اس کے
جان کی جان میں آئی ہے وہ جانی ، گرمی!
سرتاپا آج پسینے کا ہے دریا جاری
آج گرمی کو بھی آئی ہے جوانی ، گرمی!
ہر طرف آگ اگلتی سی ہوا چلتی ہے
ہے بڑی بات مرے یار نبھانی ، گرمی!
تم اسے آج کی سمجھے ہو کوئی تازہ غزل
یہ چلی آتی ہے صدیوں سے پرانی ، گرمی!
سارے ماحول میں گرمی کی ہے گرمی کیسی
ہے زباں سے جو جہاں بھر میں زبانی ، گرمی!
اک ذرا قورمہ ، حلوا و پلاؤ چن دو
سرد پڑ جائے گی اکبر یہ زمانی ، گرمی!

اکبر بخاری
03017560073

ہوئے اور بولے۔

''جنازہ تیار ہے۔''

ایک بزرگ جو شاید کم سنتے تھے' بولے ''شکر ہے کھانا تیار ہے' بڑی زور کی بھوک لگی ہوئی تھی۔''

ان بزرگ نے اپنی اپنی لاٹھی سنبھالتے ہوئے کھڑے ہوتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے برابر میں بیٹھے صاحب جل بھن کر بولے۔

''ارے میاں جی! کھانے کے تیار ہونے کا اعلان نہیں ہوا بلکہ جنازہ کی تیار ہونے کی بات ہوئی ہے' بیٹھے رہیں ابھی۔''

بزرگوار کی خوشی خاک میں مل گئی اور وہ معصوم سی صورت بنا کر بولے۔

''اچھا یہ بات ہے۔ میرا تو وضو ہی نہیں ہے' میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔''

میت کو باہر لایا جا چکا تھا اور جنازہ کا رخ اب قبرستان کی جانب تھا۔ آگے آگے جنازہ اور پیچھے مرحوم کے سینکڑوں مداح اور عزیز واقارب۔ کسی نے اونچی آواز میں کلمہ شہادت کا کہہ دیا تو باقیوں کو بھی یاد آ گیا ورنہ یونہی نڈھال چلتے رہے اور اپنی قیمتی آراء سے میت اٹھانے والوں کو نوازتے رہے۔ مثلاً آہستہ آہستہ چلیں بھائی! اوڑیں نہ لگائیں' پیچھے سے چارپائی کو اونچا رکھیں' باری باری چارپائی اُٹھائیں کسی ایک پر بوجھ نہ ڈالیں' وغیرہ وغیرہ--- جنازہ کو چند رشتہ داروں کے گھروں کے قریب سے گزارا گیا اور خاصا لمبا سفر طے کرنے کے بعد قبرستان کے جنازہ گاہ میں پہنچ گیا۔ ایک موٹے درمیانے قد کے صاحب نے اپنی کی شرٹ کی آستینیں چڑھاتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔

''بھائیو! ذرا جلدی جلدی صفیں بنالیں۔''

بھائیوں نے آگے پیچھے ہونا شروع کیا۔ دو چار اکٹھی آوازیں آئیں کہ صفیں طاق ہونی چاہئیں۔ بس اتنا کہنا تھا کہ سب نے صفیں گننی شروع کر دیں۔ مولانا صاحب نے صفوں کا جائزہ لیا اور فرمایا۔

''حضرات! ذرا توجہ سے جنازہ کی ترکیب سماعت فرمالیں۔''

اور بس پھر کیا تھا' ایک نہ ختم ہونے والی تقریر شروع ہو گئی۔ ایک تو چل چل کر نڈھال ہو گئے تھے' اب یہاں کھڑے کھڑے تو ٹانگیں بھی جواب دینے لگیں اور اوپر سے آگ برساتا سورج' گرمی اور پیاس کی شدت سے برا حال۔ اعجاز کی برداشت جواب دے گئی اور ہمارے منع کرنے کے باوجود با آواز بلند مولانا صاحب کو مخاطب کیا۔

''حضرات تمام احباب حاضر ہو چکے ہیں' جنازہ کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر یہ ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ مختصر کریں۔''

مولانا نے کھا جانے والی نظروں سے اعجاز کو گھورا اور بولے۔

''بس دو منٹ میں بات ختم کرتا ہوں۔''

اور پھر دو منٹ سے مزید چھ منٹ بعد مولانا کی بات ختم ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر صفیں درست کی گئیں اور چند لمحوں میں جنازہ کی نماز ادا ہو گئی۔ فوراً بعد لوگوں نے مطالبہ کر دیا کہ وہ میت کا چہرہ دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے طویل لائن بنوائی گئی۔ احباب لائن میں ایسے انداز میں کھڑے ہو گئے جیسے کچھ ہی دیر لائن میں لگ کر آ تا مل جائے گا۔ اس کے بعد میت کو قبر کے قریب لے جایا گیا اور تیز تیز کام شروع کیا جانے لگا۔ ایک صاحب نے با آواز بلند اعلان کیا۔

''وہی جوان قبر میں اتریں جو اس سے قبل بھی یہ کام کر چکے ہوں' اناڑی بندے آگے نہ آئیں۔''

میت کو قبر میں اتارا جانے لگا۔ کچھ لوگ جو قبر کے قریب تھے' اپنی قیمتی آراء سے مستفید کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ احباب جو صرف جنازہ پڑنے آئے تھے' وہ غائب ہو چکے تھے۔ باقی افراد جو مجبوراً رک گئے تھے' کچھ تو درختوں کے سائے تلے اور کچھ پتھروں پر بیٹھ کر ایک طویل بحث وگپ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ احباب اب بھی ٹولیوں کی صورت میں تشریف فرما تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان احباب کو اندازہ ہی نہ ہوا کسی بھلے مانس نے آ کر اطلاع دی کہ دعا ہو رہی ہے۔

مرحوم کو قبر میں دفنا دیا گیا تھا۔ قبر میں منوں مٹی ڈال کر رکھ دیا گیا تھا۔ دعا کے بعد پہلوان جی نے اعلان کیا کہ پرسوں مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے دعا ہو گی اور اس وقت تمام لوگ گھر تشریف لے جائیں۔ کھانا تیار ہے سب کھانا کھا کر جائیں۔

کچھ احباب نے پہلوان جی کی بات سے اتفاق کیا اور ان کے گھر کی جانب چل دیئے۔ باقیوں نے آخری سلام کیا' پہلوان صاحب سے کھانا نہ کھانے کی معذرت کی اور پرسوں آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھروں کی جانب چل دیئے۔ یہ وہ احباب تھے جنہوں نے فیضو کے پاس جا کر پیٹ پوجا کر لی تھی۔ پیٹ پوجا تو ہم نے بھی کر ہی لی تھی لہذا پہلوان صاحب کو تسلی اور دعا دے کر پرسوں آنے کا کہہ کر ہم بھی اپنے اپنے گھروں میں لوٹ گئے۔

اللہ ربّ العزت تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے' آمین!

☆☆

☆ فاروق احمد انصاری

جانِ عالم

جانِ عالم کو مَیں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھ میں تو کافی تبدیلیاں آ ئیں۔ قد بھی بڑھ گیا۔ پہلے سے اسمارٹ ہو گیا۔ سکول کالج کو پھلانگتا ہوا اَب گریجویشن کر رہا ہوں لیکن عالم صاحب ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ میلے سے 'گنجے سے' کالے سے نام اِن کا جانِ عالم ہے۔ میرے بڑے بھائی کے دوست ہیں۔ نظر اُن کی عقاب سے بھی تیز ہے۔ کباڑ کے مال سے ایسی چیزیں چھانٹتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اُن کے گھر میں چلنے والے وی سی پی میں جو "ہیڈ" لگا ہے وہ اُنہوں نے پندرہ روپے کا خریدا تھا اور بڑے مزے سے بیٹھ کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ آج کل ڈش انٹینا بنا رہے ہیں اور خود ہی بنا کر بڑی تکنیک سے چینل بدلتے ہیں۔ ہمیں بھی آفر ہوئی لیکن میرا چونکہ علیحدہ کمرا نہیں تھا لہٰذا شکریہ کہہ کر منع کر دیا۔ سوچا جیسے ہی ہمارا کمرا بنا فوراً جانِ عالم سے کہہ کر ڈش لگوا لیں گے۔

پچھلے دِنوں حالات خراب تھے' رینجرز کافی آ ئی ہوئی تھی۔ ہم اپنے گھر کی چھت پہ تھے کہ ہمارے اُوپر سے سامنے والی بلڈنگ پر رینجرز نے فائرنگ کی۔ ہم سب نیچے بھاگے۔ عالم صاحب بھی تھے۔ فوراً لیٹ گئے اور جیسے فوجی کرالنگ کرتے ہیں ویسے ہی لیٹے لیٹے اُترے اور نیچے اُترتے ہی جانِ عالم گویا ہوئے۔

"یقیناً اُنہوں نے مجھ پر فائرنگ کی تھی---"

یہ سن کر ہم لوگوں کے چہروں پر ٹینشن کے باوجود مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑے بھائی جن کی اُن سے دوستی ہے اور مذاق بھی ہے' بولے۔

"ارے عالم بھائی! آپ کی ٹنڈ کی چمک دیکھ کر اُنہوں نے فائرنگ کی ہوگی۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اِن پر لائٹ پڑ رہی ہے۔"

"یار' تم تو ہر وقت مذاق کرتے ہو۔" عالم صاحب نے منہ ? بنایا۔

"ویسے عالم بھائی اگر گولی آپ کو لگتی بھی تو پھسل جاتی---" بھائی نے پھر اُن کی چندیا پر چوٹ کی اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

جانِ عالم کا مَیں نے جوانی کا فوٹو دیکھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی کہ یہ جانِ عالم ہو سکتے ہیں لیکن اَب یہ عالم ہے کہ ہم سب محلے والوں کا خیال ہے کہ وہ عید پہ یا بارش کے بارش نہاتے ہیں اور کپڑے اِس وقت بدلتے ہیں جب تک وہ گھس کر حدود آرڈیننس کا خطرہ نہ بن جائیں۔ ایک دِن پتہ چلا کہ بہت غصے میں تھے۔ شرارتی لڑکوں نے پتھر میں کاغذ لپیٹ کر اُن کے گھر میں پھینک دیا جس پر لکھا تھا۔

"عالم بھائی! کبھی نہا بھی لیا کرو۔"

مَیں نے ایک دفعہ بڑے بھائی سے پوچھا۔ "عالم بھائی! واقعی نہیں نہاتے؟" بڑے بھائی نے کہا۔ "نہانے کی کیا ضرورت ہے ایک کپڑا اُٹھاتے ہیں سر پر مارتے ہیں اور ٹنڈ چمک جاتی ہے اور اسی کپڑے سے جوتے بھی صاف کرتے ہیں۔"

پچھلے دِنوں کی بات ہے۔ ہمارے گھر پر تھے۔ ہمارے بڑے بھیا سے چھوٹے بھائی نے کہا۔ "یار' مجھے بال کٹوانے ہیں---" جسے سن کر عالم صاحب سنجیدگی سے بولے۔

"ہاں یار! مجھے بھی بال کٹوانے ہیں۔" جسے سن کر میری بھابی کی ہنسی ایسی زور سے چھوٹی کہ عالم صاحب حیرت سے دیکھنے لگے اور بڑے بھائی نے منہ موڑ لیا۔ بعد میں قصہ سنا تو پتہ چلا کہ عالم صاحب نائی کی دوکان پر پہنچے تو نائی نے اُنہیں حیرت سے دیکھا۔

"یار، بال کاٹ دو---"

"مذاق مت کرو---" نائی غصے سے بولا۔ نائی بھی بھائی کا جاننے والا تھا۔

"کیا مطلب کیسا مذاق---؟" عالم صاحب حیرت سے بولے۔

"تمہیں ہمارے پیشے کا مذاق اڑاتے شرم نہیں آتی۔ ہم بال کاٹتے ہیں، محنت کے پیسے لیتے ہیں---" نائی نے کہا۔

عالم صاحب کو غصہ جلدی آتا ہے۔ غصے سے اپنی جھالریں دکھاتے ہوئے بولے۔ "یہ بال نہیں ہیں تو کیا ہیں---؟"

نائی نے یہ سن کر سر جھکالیا اور بال کاٹنے شروع کر دیے۔ بال کاٹنے کے بعد عالم بھائی نے پیسے پوچھے۔ "جتنی مرضی ہے دے دو---" نائی نے کہا لیکن اُن کا سر ابھی بھی جھکا تھا۔ عالم بھائی نے پندرہ روپے دیے۔" نائی نے چونک کر کہا۔ "یہ کیا صرف پندرہ روپے---"

"تو کیا پچاس روپے دوں۔ پندرہ روپے ہی تو ہوتے ہیں۔" عالم بھائی نے چڑ کر کہا۔

"پندرہ روپے تو بال کاٹنے کے ہیں۔ باقی پندرہ روپے بال ڈھونڈنے کے۔" نائی نے کہا اور عالم بھائی نائی کو گولیاں دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔

جب مجھ سے بڑے بھائی فائرنگ میں زخمی ہو گئے تو ہسپتال میں خون دینے کے لیے میرے اور سب سے بڑے بھائی کے دوست بھی ہسپتال پہنچ گئے۔ ہسپتال پہنچ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ عالم صاحب بھی گریس اور آئل سے لتھڑے کپڑوں کے ساتھ موجود ہیں۔ بھائی کو عالم صاحب نے کہا کہ یار! اگر خون چاہیے تو میرا ابھی لے لو۔ تب اچانک میرے منہ سے نکلا۔

"عالم بھائی! آپ میں سے خون کی بجائے آئل اور گریس ہی نکلے گی۔"

"آئل اور گریس نہیں کچھ نکلے گی---" بھائی کا دوست بولا۔

"کیا فائدہ! رفیق صحیح ہو کر پیچ کس سے گھر کی چیزیں کھولنا اور جوڑنا شروع کر دے---" بڑے بھائی بولے۔

ہمارے زخمی رفیق بھائی بھی بولے۔ "ہاں یار! گھر کی ٹیوب لائٹیں اُتار کر ڈش انٹینا بنایا کروں گا---"

مختلف لوگوں کے مختلف ریمارکس سن کر عالم کی چندھیا سرخ ہو گئی۔

کاٹھ کباڑ کی اس مشہور شخصیت کو ایک مرتبہ کباڑ میں سے ایک شاعری کی کتاب مل گئی جو انہوں نے پڑھ ڈالی۔ تب اُنہوں نے شوق چڑھا لیا کہ وہ مشاعرے اٹینڈ کیا کریں گے--- حسن اتفاق کہ اسی دورے کے دوران ایک شاعر حضرت اُن کی دوکان پہ نکل آئے۔

"ارے میاں! تم کیا کیا ٹھیک کر سکتے ہو---"

"فرج، وی سی آر، ریڈیو--- ٹی وی وغیرہ سب کچھ۔" عالم صاحب نے جواب دیا۔

"ارے میاں! منہ دھو کر--- تم اور بیوی کو ٹھیک کرو گے---"

شاعر حضرت کچھ بہرے بھی تھے۔ ادھر عالم صاحب منہ دھونے کی بات سن کر غصے میں آ گئے اور شاعر حضرت کا گریبان پکڑ کر بولے۔

"منہ دھونے کی بات کی تو دانت توڑ دوں گا۔"

"تم--- تم--- اور میرے دانت توڑو گے۔ مشہور شاعر--- عالم جان پوری کے دانت توڑو گے۔"

یہ کہہ کر عالم جان پوری نے اپنی بتیسی نکالی اور کانپتے ہوئے جان عالم کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ "توڑ کر دکھاؤ، ماں کا دودھ پیا ہے تو---"

کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جان عالم نے جب سنا کہ وہ عالم جان پوری سے اُلجھ پڑے ہیں تو اُنہیں سخت شرمندگی ہوئی کیونکہ اُنہوں نے انہی کی کتاب پڑھی تھی اور اِن کے پیڈسٹل فین بھی بن چکے تھے۔ فوراً قدموں میں گر پڑے اور معافی مانگنے لگے۔

"غلطی ہو گئی حضرت! غلط فہمی کی بنا پر آپ کو پرانے ہیٹر کی طرح ادھیڑنے لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ہی وہ شخصیت ہیں جس نے جان عالم کے دل میں جذبات و کیفیات کے وہ پھول کھلائے ہیں جو کھلنا چاہ رہے ہیں---"

عالم جان پوری نے بتیسی منہ میں رکھی اور گویا ہوئے۔ "کوئی مائی کا لعل اِس بتیسی کو ہاتھ نہیں لگا سکا، تم تو کل کے بچے ہو۔"

ہائے بل

مانی ہزار منتیں ، رو نہ ہوئی بلائے بل
بل بھی میرا کچھ اور بڑھا ، کی جو دعا ، کم آئے بل
میری طرح خدا کرے ، تیرا بھی اتنا آئے بل
تو بھی جگر کو تھام کے کہتا پھرے کہ ، ہائے بل!

✿ محمود بابا

''آیئے حضرت! دوکان کے اندر آیئے' فرمایئے کیا ٹھیک کروانا ہے---''

''عالم صاحب نے شاعر حضرت کو اندر بلایا اور باقی تماشائی بھی وہاں سے چلے گئے۔

''ارے بھئی' ہمارا اے سی خراب ہو گیا ہے چل کر صحیح کر دو۔''

''چلئے صاحب! میں تیار ہوں---'' جان عالم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''میاں' پیسے کتنے لو گے؟''

''ارے' آپ سے کیا پیسے لینے' ہم دونوں کا اِتنا گہرا تعلق ہے کہ آپ کا کام کر کے مجھے خوشی ہو گی۔'' جان عالم نے کہا۔

''کیا مطلب--- ہمارا تعلق کیا بھئی! ہم تو بہت شریف آدمی ہیں؟'' عالم جان پوری نے حیرت سے کہا۔

''تو میں نے کیا بدمعاشی کی ہے---؟'' جان عالم بھی بُرا مان گئے۔

''تو ہمارا گریبان فرشتوں نے پکڑا تھا۔'' عالم جان پوری نے پوچھا۔

''وہ دراصل نہانا اور منہ دھونا لوگوں نے میری چڑ بنا دی ہے۔'' عالم صاحب چندیا کھجاتے ہوئے بولے۔

''رونا---''

''رونا نہیں منہ دھونا---'' جان عالم صاحب چلائے۔

''تو آہستہ سے کہو--- ہم بہرے ہیں کیا۔'' عالم جان پوری صاحب نے غصے سے کہا۔ ''ہاں تو تمہارا میرا تعلق کیسے ہوا---'' عالم جان پوری نے پوچھا۔

''میرا نام جان عالم ہے۔ آپ کا نام مجھ سے اُلٹ ہے۔ یعنی عالم جان پوری--- آپ بھی پرانے ہیں۔ میں بھی کباڑیا ہوں' آپ شاعر ہیں۔ میں آپ کا قدردان ہوں' یعنی آپ فین ہوں۔'' جان عالم نے بتایا۔

''ہاں یاد آیا' ہمارے اے سی کا فین خراب ہے۔'' عالم جان پوری صرف آخری جملہ سن سکے۔

''چلئے صاحب! آپ کے علاقے میں حالات تو صحیح ہیں نا!'' جان عالم نے پوچھا۔

''حالات کہاں اَب وہ رہے' ناصر کاظمی مرحوم نے خوب کہا ہے۔

دل تو میرا اُداس ہے' ناصر
شہر کیوں ٹھائیں ٹھائیں کرتا ہے

''ٹھائیں ٹھائیں؟'' جان عالم بڑبڑائے۔

''ہاں بھئی' اگر مرحوم آج زندہ ہوتے تو یہی کہتے۔'' عالم جان پوری صاحب نے پان کی پیک ماری۔

دونوں گھر پہنچے تو لائٹ گئی ہوئی تھی۔

بھئی لائٹ نہیں ہے کمبخت--- ناصر کاظمی نے بھی کیا خوب کہا ہے۔

نمکین غزل

ایک ویسے میں ہوں ، اک ویسے کے بعد
کھانے پینے میں ہوں ، کھانے پینے کے بعد
دوڑ ہے بوٹیوں کی گی آج پھر
جو پسینے میں ہوں میں ، پسینے کے بعد
کھا لیا اس قدر ، سانس کی جاہ نہیں
جینے مرنے میں ہوں ، مرنے جینے کے بعد
پھر پریگننٹ کیا الٹرا ساونڈ نے
وہ مہینے سے ہیں ، پھر مہینے کے بعد
کرچیاں ہو کے بکھرا ہوا ہوں ، گر
آبگینے میں ہوں ، آبگینے کے بعد
اب تو پینے پلانے کے دن بھی گئے
وائے پینے میں ہوں ، چائے پینے کے بعد
دل میں ہوں اب ، کبھی میں انگوٹھی میں تھا
کس کمینے میں ہوں ، کس نگینے کے بعد
تیری آنکھوں سے گر کر گٹر میں گرا
کس دفینے میں ہوں ، کس دفینے کے بعد
تو بھی اکبر ابھی پاؤں دھو دھو کے پی
ماں کی نظروں میں چڑھ ، ماں کے سینے کے بعد

✿ اکبر بخاری
03017560073

دم گھٹا جاتا ہے افسردہ دلی سے یارو
کوئی افواہ ہی پھیلاؤ کچھ رات کٹے
چھوڑ آئے ہو سرشام اُسے کیوں ناصر
اُسے پھر گھر میں بلاؤ کہ کچھ رات کٹے

''یہ لوڈشیڈنگ کے بارے میں کہا تھا ناصر کاظمی نے---؟'' جان عالم حیرت سے بولے۔

''اور کیا تو تمہارے لیے کہا ہے---'' عالم جان پوری تپ کر بولے۔

''آپ کی کتاب پڑھی تھی 'لڑکیاں چھچھوری ہیں۔'' جان عالم نے کہا۔

''ہیں---تم نے پڑھ لی--- یقیناً خریدی ہوگی؟ اللہ کی قسم تم جیسے باذوق اور علم سے محبت رکھنے والے موجود ہیں ورنہ زمانہ تو ہماری قدر نہیں کرتا---'' عالم جان پوری پھولے نہ سمائے۔

''وہ مَیں بھی شاعری کرتا ہوں' آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہوں۔'' جان عالم دل کی بات لبوں پہ لاتے ہوئے بولے۔

''یعنی عظیم شاعر عالم جان پوری کی شاگردی میں آنا چاہتے ہو؟ پہلے پانچ کلو لڈو' ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک ہزار شعر یاد کرو جس میں آدھے تقریباً میرے ہوں۔''

عالم جان پوری کی شرط سن کر جان عالم کی گھگی بندھ گئی جو اُنہوں نے مشکل سے کھولی لیکن ایک نامور شاعر ہونے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کھونا پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر جان عالم نے شرط منظور کرلی۔

''ایک شعر نازل ہوا چاہتا ہے---'' عالم جان پوری نے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہاں یہاں پہ؟'' جان عالم نے دونوں ہاتھ بے اختیار اپنی چندیا پہ رکھتے ہوئے بولے۔

''ابے' اس خالی ڈھکن پہ کیا نازل ہوگا' نازل بھی ہوگا تو پھسل جائے گا۔ گیسو دراز ہوں تو عالم جان پوری جیسے---'' عالم جان پوری نے ہاتھ اپنے اُلجھے ہوئے بالوں پہ پھیرا۔

لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم
مَیں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے

''ہاں تو تم واحد شخص ہو جس کے سامنے عالم جان پوری اپنا تازہ کلام براہِ راست سنائیں گے اور ہاں تمہارے لیے رعایت کا سوچ رہا ہوں کہ تم ہزار شعر یاد نہ کرو بلکہ میری کتاب ''لڑکیاں چھچھوری ہیں'' کے سارے شعر یاد کرلو کیونکہ سارا اُدب اور تخلیق اور شاعری کی گہرائی اِس میں موجود ہے تو تمہیں اِدھر اُدھر خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے' سنو پھر---'' عالم جان پوری نے وقفہ لیا اور جان عالم ہمہ تن گوش ہوگئے۔

؎ دل کا درد بے سبب ہوتا ہے

''واہ---واہ---واہ---'' جان عالم پھڑک اُٹھے۔ عالم جان پوری خوشی سے پھول گئے۔ پھر مزے سے بولے۔

دل کا درد بے سبب ہوتا ہے
دل کا درد بے سبب نہیں ہوتا

''واہ---واہ---کیا شعر مارا ہے---'' جان عالم نے داد دی اور وہ لفظ سوچنے لگے وہ اِس موقع پر بولا جاتا ہے۔ پہلے تو اِن کے ذہن میں آیا۔ ''ونس مور'' (Once More) لیکن جان عالم پوری نے خود ہی کہا۔

''ضرور---ضرور---ارشاد---'' جان عالم نے کہا۔

دل کا درد بے سبب ہوتا ہے
کہ دل کا درد بے سبب نہیں ہوتا ہے

عالم جان پوری نے گنگنایا تو جان عالم چلا اُٹھے۔ ''دوبارہ---دوبارہ---حضرت! دوبارہ---''

''کیا مطلب---یہ دوبارہ کا مطلب کیا ہے---؟'' عالم جان پوری غصے سے بولے۔

''دوبارہ سنایئے---'' جان عالم نے کہا۔

''ابے--- شاعر کی اولاد! مکرر کہتے ہیں مکرر--- میم' کاف' رے اور پھر رے۔''

''میرا مطلب وہی تھا---'' جان عالم بولے۔

''ابے' تجھے اِتنی تمیز نہیں کہ شاعروں کو کہتے کیا ہیں' تو تو کیا شاعری کرے گا اور کیا شاگردی کرے گا؟ چل نکل یہاں سے---'' عالم جان پوری غصے میں آ گئے۔

''حضرت! غلطی ہوگئی' آئندہ مکرر ہی کہوں گا۔'' جان عالم گھگیائے۔

''جی نہیں' جس کو اُدب اور آداب نہ آتا ہو وہ مرزا عالم جان پوری کی شاگردی نہیں کرسکتا۔ دفعہ ہو جایئے---'' عالم جان پوری نے ہانپتے ہوئے غصے سے کہا اور کھانسنا شروع کردیا۔

جان عالم نے مایوسی سے سر ہلایا اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے نکل کر اپنے کباڑ خانے میں آ گئے اور ابھی تک افسوس سے کہتے ہیں کہ ملک ایک بہت بڑے شاعر جان عالم کباڑیا کے شعروں سے محروم ہو گیا۔

☆☆

انشائیہ

☆ گل نوخیز اختر

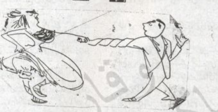

الحمدللہ ہم شیخ ہیں۔ یقین نہ آئے تو عبدل پٹواری سے پوچھ لیں۔ ہمارا خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے شیخ ہوا تھا۔ سعودی عرب اور شیخوپورہ ہماری جدی پشتی ریاستیں ہیں جبکہ "چلی" سے ہمیں برادرانہ انسیت ہے---اماں بتاتی ہیں کہ پہلے ہم سکھ تھے، پھر ہندو ہوئے، پھر دوبارہ سکھ ہو گئے کیونکہ اس دور میں سکھوں کو اچانک وظیفہ ملنا شروع ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہم مسلمان ہو گئے لیکن ذات کا فیصلہ نہ ہو سکا---چوہدری بنے تو کسی نے بتایا کہ انگریزوں کے دور میں جو لوگ ان کی دریاں اٹھاتے تھے، وہ اب "چاؤ---دری" سے چوہدری کہلاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی دادا ابا نے فرمایا۔

"لاحول ولاقوۃ---قسم لے لیجے، ہم تو "سندھڑ" ہیں۔"

پتا چلا کہ برسوں پہلے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر خانہ بدوشوں کی بستیاں تھیں۔ ایک دفعہ سیلاب آیا تو سب کو بہا کر لے گیا۔ چونکہ سیلاب کو پنجابی میں "ہاڑ" کہتے ہیں اس لئے جو لوگ بچ گئے، انہوں نے خود کو "سندھ ہاڑ" کہنا شروع کر دیا۔ جو بگڑ کر "سندھڑ" بن گیا---دادا بھی ڈھیٹ تھے۔ پھر بدل گئے کہ آپ کو سننے میں غلطی لگی ہے، ہم تو "ٹوانہ" ہیں۔ جواب ملا، مبارک ہو۔ انگریز اپنے خاص ملازموں کو روزانہ "دو آنے" بطور بخشش دیا کرتے تھے۔ اس دور میں ہندی کرنسی "ٹوانے" کہلاتی تھی۔ آج کل وہی لوگ ٹوانہ کہلاتے ہیں---دادا کھسیانے ہو کر سر کھجانے لگے جبکہ ابا نے بڑے اطمینان سے کہا۔

عبدل پٹواری! گواہ رہنا، آج سے ہم شیخ ہیں۔"

اصلی شیخوں کا تو پتا نہیں البتہ ہمارے ہاں کھانے پینے کا سسٹم بڑا اچھا تھا۔ ہم تینوں وقت پانچ پانچ گالیاں کھاتے اور دو دو گلاس غصے کے پیتے۔ شام کو صبر کا پھل کھانا بھی ہمارا معمول تھا۔ جب کبھی گالیوں سے دل بھر جاتا تو جوتے یا مار کھا لیتے---اللہ کا شکر ہے، جب بھی کھایا پیٹ بھر کر کھایا۔

یاد رہے کہ جاوید شیخ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ ہاں، شہناز شیخ کی بات اور ہے۔ ہم سب اسے اپنی بہن سمجھتے ہیں (خالہ زاد بہن)---لوگ کہتے ہیں کہ ہم بچوں سے گنڈیریاں چھین لیتے ہیں۔ یہ سراسر الزام ہے، ہم صرف قلفیاں چھینتے ہیں۔ ہم پر کنجوسی کا الزام بھی غلط ہے۔ اصل میں ہم اللہ کی نعمت کو ضائع نہیں کرتے اس لئے کھجور کے ساتھ ساتھ گٹھلی بھی کھا جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، ہمارے ابا ہم سے بہت پیار کرتے تھے۔ ہر سال شام کو ہمیں آئس کریم کھلانے لے کر جاتے تھے۔ چھوٹی عید پر ہر بچے کو ایک ایک ٹانی لے کر دیتے، وہ ٹانی جو آج بھی چار آنے میں ایک ہزار ہوتی ہیں۔

ہم نے گھر کی چیزوں کے نام بھی کھانے کی چیزوں کے نام پر رکھے ہوئے تھے۔ مثلاً جوتی کو ہمارے گھر میں "کھیر" کہا جاتا تھا، گالیوں کو "بھنڈیاں" اور مار کو "گوبھی"۔ اس طرح سے کبھی ہم کھیر کھاتے، کبھی بھنڈیاں اور کبھی گوبھی---ابا نے لکڑی کی ایک جہازی سائز قلفی صحن میں لگا رکھی تھی، ہم سب بچے سارا سارا دن اسے چاٹتے رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ ایک دن وہ واقعی گھس گھس کر ختم ہو گئی۔ مجھے یاد ہے جس دن قلفی ختم ہوئی تھی اس روز ابا نے سب بچوں کو بہت مارا تھا۔ اماں چھڑانے کے لئے آئیں تو غصے سے کانپتے ہوئے بولے۔

"ہٹ جاؤ، میں ان کی کھال اتار دوں گا۔ یہ بہت فضول خرچ ہو گئے ہیں۔"

آپ یقین نہیں کریں گے کہ ہمارے ہاں ہر سال بکرا عید پر قربانی ہوتی تھی۔ قربانی والے روز ابا زور زور سے چلاتے۔

"بے--- بے--- بے---" پھر خود ہی کہتے۔ "جا، تجھے قربان کیا۔"

بعد میں سب بچوں کو جمع کر کے ایک ایک فرضی بوٹی پکڑا دیتے اور پسینہ پونچھتے ہوئے کہتے۔

"ران تو اطمینان سے روسٹ کرا کے کھائیں گے۔"

ہمارے گھر میں خیالی پلاؤ بھی ہفتے بعد پکتا تھا کیونکہ اماں کہتی تھیں کہ روز روز چاول کھانے سے زکام ہو جاتا ہے--- "لنگر لوٹنا" ہماری تربیت کا ایک اہم حصہ تھا اور اس لئے ابا نے اس تربیت کا خاطر خواہ انتظام کر رکھا تھا۔ ایک ماہر لنگر لوٹر جو خود کو ایل ایل بی (لنگر لوٹنے میں بے مثال) کہتا تھا، شام کو ہمیں ٹیوشن پڑھانے آیا کرتا تھا جسے فیس کے طور پر اچھا خاصا حوصلہ دیا جاتا۔

رمضان کے دنوں میں ہمارے عیش ہو جاتے۔ ابا ہم سب بچوں کو لے کر افطار کے لئے 4 بجے ہی مسجد میں پہنچ جاتے اور مختلف پوزیشنوں پر بٹھا دیتے۔ جیسے ہی خورد و نوش کی کوئی چیز مسجد کے احاطے میں داخل ہوتی، بائیں طرف والے کونے سے ابا گردن نکال کر چیختے۔

"نعرہ تکبیر---!"

اور ہم "اللہ اکبر" کہتے ہوئے پلیٹ لانے والے کو یرغمال بنا لیتے۔

ایک دفعہ ابا 5 بجے ہی روزہ کھولتے ہوئے پکڑے گئے۔ لوگوں نے آنکھیں نکالیں تو بڑے اطمینان سے فرمایا۔

"کیا آپ نے نہیں سنا کہ روزہ دیر سے کھولیں تو مکروہ ہو جاتا ہے؟"

کھانے کے معاملے میں ابا کے اصول بڑے سخت تھے۔ وہ ہمیشہ شام کا کھانا باہر کھاتے لیکن خدا گواہ ہے کہ کبھی سالن نہیں منگواتے تھے بلکہ ہمیشہ "گریبی" پر ہی اکتفا کیا۔ یہ ان ہی کا کمال تھا کہ وہ چائے کی "گریبی" بھی منگوا لیتے تھے۔

ایک دفعہ میرا چھوٹا بھائی کھیل کر آیا اور روٹی کا تقاضا کرنے لگا۔ ابا نے دو تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیے اور بولے۔

"تو آدمی ہے یا ہاتھی، ابھی تین دن پہلے تو پیٹ بھر کر کھایا تھا۔"

ہم جیسے شیخ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ خود میری جب شادی کی عمر ہوئی تو ایک روز ابا نے پاس بلا کر پوچھا

"بیٹے! تجھے جوہی چاولہ کیسی لگتی ہے؟"

میں گڑبڑا گیا۔ "وہ--- جی--- بس--- اچھی ہی ہے--- کیوں؟"

"شاباش--- کیا تو چاہتا ہے کہ وہ تیری بیوی بنے؟" ابا نے دھماکا کیا۔

"ہائیں---" میرے ہوش اڑ گئے۔ "کک--- کیا؟"

"ہاں ہاں، بول کیا کہتا ہے--- کیا تجھے ہے اس سے محبت؟"

"وہ--- میں--- وہ---" الفاظ میرے حلق میں اٹک گئے۔

"ابے، بولتا کیوں نہیں--- کرتا ہے نا، اس سے محبت؟"

"جج--- جی ہاں---" میں نے ہونقوں کی طرح سر ہلا دیا۔

"بہت اچھے--- اب سن---

چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں
محبت ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں

"مم--- میں سمجھا نہیں، ابا---!" میں بوکھلا گیا۔

"میں سمجھتا ہوں، بیٹے! اب جبکہ تو جوہی چاولہ سے محبت کا اقرار کر چکا ہے تو تجھ پر لازم ہے کہ تو اگر شادی کرے تو صرف اسی سے ورنہ نہیں، کیا سمجھے---؟"

ابا نے بڑے اطمینان سے کہا اور میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں ابا کی چرائند سمجھ گیا تھا۔ جوہی چاولہ تو مجھے چاول بھی نہ ڈالے۔ ابا کا پلان کامیاب رہا تھا۔ نہ جوہی چاولہ ملے گی اور نہ میری شادی ہو گی۔ میں نے احتجاج کے لئے زبان کھولی لیکن ابا نے تیزی سے اپنی چھتری سیدھی کر لی اور میں وہیں دبک گیا--- پہلے تو جی میں آئی کہ کھانے کی ہڑتال کر دوں لیکن پھر سوچا کہ کھانا پکتا ہی کب ہے؟--- اچانک مجھے ایک انوکھا طریقہ سوجھا۔ میں نے گھر میں اعلان کر دیا کہ اگر ایک ماہ کے اندر اندر میری شادی کا فیصلہ نہ کیا گیا تو میں احتجاجاً "بیت الخلاء" نہیں جاؤں گا--- یہ سنتے ہی ابا اچھل پڑے۔

"ابے، کیوں محلے میں بدنام کرائے گا--- شرم نہیں آئے گی، قبروں کی بے حرمتی کرتے ہوئے؟"

"میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے، میں اپنا احتجاج ختم نہیں کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ابا نے کچھ دیر مجھے گھورا۔ "یہ تیرا آخری فیصلہ ہے؟"

"جی ہاں---" میں نے روکھے پن سے کہا۔

"ٹھیک ہے، بیٹے! میں بھی دیکھتا ہوں، کب تک یہ جدائی برداشت کرتے ہو۔"

ابا نے سہلایا اور باہر چلے گئے۔

میں نے سنا، وہ سب کو کہہ رہے تھا کہ اب جو بھی باتھ روم جائے، وہ ان سے چابی لے کر جائے اور واپسی پر تالا لگا کر آئے---میں نے لاپرواہی سے سر جھٹکا اور بستر پر گر کر آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے گہری نیند آگئی اور میں سو گیا۔

رات پونے بارہ بجے کے قریب حسب معمول میری آنکھ کھلی۔ میں نیم غنودگی کے عالم میں باہر نکلا، صحن میں پہنچا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔

''ہائے، مر گیا---''

دروازہ پٹاخ سے میری ناک سے ٹکرایا اور مجھے ہوش آگیا۔ میں نے حیرت سے بند دروازے کو دیکھا اور پھر جیسے ہی میری نظر تالے پر پڑی، مجھے ابا کا گھٹیا اقدام یاد آگیا۔ میں نے دانت بھینچے اور واپس آکر لیٹ گیا لیکن نیند کیسے آسکتی تھی؟ میں نے صحن کے چکر کاٹنا شروع کر دیئے۔ اچانک ابا باہر نکلے۔ مجھے دیکھ کر قریب آئے اور بولے۔

''خیریت---؟''

میں گھبرا گیا۔ ''ہاں---ہاں وہ---مم---میں کھانا ہضم کر رہا تھا۔''

''کھانا---'' ابا زور سے اچھلے۔ ''کتنا اچھا لفظ ہے یہ---اتنے دنوں بعد سنا ہے، سنتے ہی پیٹ بھر گیا لیکن تو نے کہاں سے کھایا کھانا اور میرا حصہ کدھر ہے؟''

میں سمجھ گیا، اب نئی مصیبت آئی۔ اچانک مجھے اپنا احتجاج یاد آگیا۔ میں نے منہ بنا کر کہا۔

''آپ کو اس سے کیا، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

ابا یہ سنتے ہی بھڑک اٹھے، کن انکھیوں سے تالے کی طرف دیکھا اور واپس جاتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے، ناک سے لکیریں نہ نکلوائیں تو شیخ نہیں---''

میں کانپ اٹھا۔ بات برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک مجھے یاد آیا یہ ہماری گلی میں ابھی تک گٹر سسٹم نہیں ہے۔ زندگی میں پہلی بار نالیوں کی افادیت کا احساس ہوا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں گلی میں پہنچا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں جائے واردات ڈھونڈنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا، ایک ان پڑھ، جاہل اور گنوار کتا انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر لپکا۔ میں نے اسے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور انتہائی سکون سے چار چھلانگیں لگا کر گھر میں گھس گیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اماں کو جھنجوڑا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

''کک---کیا ہوا---کون ہے؟''

''کچھ نہیں، اماں! سب خیریت ہے---یہ میں ہوں۔'' میں نے اماں کو تسلی دی۔ ''یہ بتا، چابی کدھر ہے؟''

''چابی---کونسی، بوتل کھولنے والی---؟''

اماں نے حیرت سے پوچھا اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''اماں! میں سرنڈا پینے نہیں آیا، مجھے باتھ روم کی چابی چاہئے۔''

''مگر وہ تو تیرے باپ کے پاس ہے۔''

''اماں---!'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''خدا کے لئے کسی طرح چابی لے آ ورنہ یاد رکھ، تیرا بیٹا ایسی ذلیل موت مرے گا کہ کوئی بھنگی بھی میت کے قریب نہیں پھٹکے گا۔''

''لیکن وہ---تیرا اباپ---؟''

''اماں---!'' میں نے کانپتے ہوئے بات کاٹی۔ ''میرے پاس دو منٹ ہیں۔ کچھ کر سکتی ہو تو کر لو، بعد میں الزام نہ دینا۔''

اماں گھبرا گئی۔ ''اچھا، ایسا کرتی ہوں، تیرے باپ سے خود چابی لے آتی ہوں۔ اس کو کیا پتا چلے گا کہ تیرے لئے لائی ہوں---ٹھیک ہے، نا؟''

''ہاں ہاں---ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے---لیکن اس سے پہلے کہ سب خراب ہو جائے، جاؤ جلدی سے چابی لے آؤ---تمہیں اللہ کا واسطہ---!'' میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

اماں نے چپل پہنی اور ابا کے کمرے میں گھس گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نکلیں تو ان کے ہاتھ میں ''خزانے کی چابی'' تھی۔ میں نے جھپٹ کر چابی ان کے ہاتھ سے لی اور صحن کی طرف بھاگا۔

ابھی اس بات کو پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ ابا پانی پینے کے لئے باہر آئے۔ اماں کو کمرے میں لیٹے دیکھ کر غرائے۔

''میں نے کہا تھا کہ واپسی پر چابی مجھے دے کر جانا؟''

''اماں ٹپٹا گئیں۔ ''وہ---وہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔''

ابا نے منہ بنایا اور باتھ روم کی طرف چل دیئے۔ چابی تالے کے ساتھ ہی لٹک رہی تھی۔ انہوں نے اطمینان سے تالہ بند کیا، چابی نکالی اور واپس آکر سو گئے۔

ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دھک سے رہ گیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میری روح فنا ہو گئی۔ یہ ایک نیا عذاب آن پڑا تھا۔ اب کم از کم صبح تک کسی مدد کی امید نہیں کی جا سکتی

تھی۔ میں نے کچھ دیر غور کیا۔ بالٹی کو الٹا کر کے میز بنایا اور اس پر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔

پتا نہیں میری آنکھ کیسے لگ گئی۔ ہوش اس وقت آیا جب سر پوری قوت سے واش بیسن سے ٹکرایا۔ میری کربناک چیخ سے فلش کا دل بھی دہل گیا۔ ابا فوری طور پر باہر لپکے۔ صبح ہو چکی تھی۔ پہلے تو کچھ نہ سمجھے، پھر جیسے ہی میرے بستر پر نگاہ ڈالی اور اماں کو نظریں چراتے دیکھا تو فوراً ہی سارا معاملہ سمجھ گئے۔ اچانک ان کے منہ سے ایک زوردار قہقہہ نکلا اور پھر وہ ہنستے ہی چلے گئے۔ جب ہنستے ہنستے تھک گئے تو دروازے کے پاس آکر چلائے۔

''الو کے پٹھے! اندر تو گھس گیا ہے، دیکھتا ہوں باہر کیسے نکلتا ہے؟''

''ابا! رحم---یہ ظلم نہ کر، مجھے معاف کر دے۔'' میں گھگھیایا۔

''ابے، ہزار معافیاں مانگ لے۔ کم از کم دروازے راستے تو تجھے باہر نہیں آنے دوں گا---ہاں، اگر فلش کے راستے آجائے تو وہ تیری ہمت ہے۔''

''ابا! میں انسان ہوں، لال بیگ نہیں---میں---میں تیری بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔ شادی کروں گا تو صرف جوہی چاولہ سے ورنہ نہیں۔''

''سوچ لے---''

''سوچ لیا۔''

''پھر سوچ لے---''

''پھر سوچ لیا۔''

''احتجاج کرے گا---؟''

''میری توبہ---!''

''باہر نکل کر مارے گا تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں---''

''ٹھیک ہے---'' ابا نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''ایک موقع اور دیتا ہوں لیکن اگر دوبارہ ایسی حرکت کی تو گٹر میں بند کر دوں گا، سمجھے؟''

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے پتے تو بٹ سکتے ہیں، چھوارے نہیں۔ میں نے کمرے کی دیوار پر کوئلے سے لکھ دیا۔

''چھوارے بانٹو، اس سے پہلے کہ تمہارے پتے بٹیں۔''

مایوسی حد سے زیادہ بڑھی تو میں نے جوہی چاولہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ان ہی لمحات میں ایک روز فلم میں میری نظر جوہی چاولہ پر پڑی۔ وہ بڑی حسرت سے گا رہی تھی---

مجھ سے محبت کا اظہار کرتا

کاش ، کوئی لڑکا مجھے پیار کرتا

میں نے عامر خان کے پنگا لینے سے پہلے پہلے ایک ارجنٹ لیٹر جوہی چاولہ کو لکھا۔

''جیتا ہوں جس کے لئے ، جس کے لئے مرتا ہوں

اک تو ہی وہ لڑکی ہے جسے میں پیار کرتا ہوں''

اگلے روز لفافہ واپس آگیا، اوپر لکھا تھا۔

''پاگل دیا پترا! جوہی چاولہ انڈیا رہتی ہے، ملتان نہیں۔

☆☆

دسمبر کی ایک گرم ترین رات کو دوپہر ایک بجے میں نے شادی کر لی۔ جی ہاں، میں نے شادی کر لی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنے باپ کو اپنی بیوی کے ہمراہ یہ خبر سنائی تھی تو اس کا رنگ غصے سے سبز ہو گیا تھا۔

''تو نے معاہدے کی خلاف ورزی کی؟'' وہ چلایا۔

''ابا! وہ---میں---''

''ابے، میں تجھے طبلے میں بند کرا دوں گا، تجھ پر حسن جہانگیر چھوڑ دوں گا---کدھر ہے میرا زنگ آلود خنجر، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا---جا، میں نے تجھے قتل کیا۔''

''ابا! خدا کے لئے---'' میں گڑگڑایا۔ ''اس کا نام تو پوچھ لے ایک دفعہ---!''

''کیوں پوچھوں---کون ہے یہ؟---اے لال دوپٹے والی! ذرا نام تو بتا---'' ابا چیخے۔

''وہ---وہ جی---وہ---مجھے شرم آرہی ہے۔'' اس نے منہ چھپا لیا۔

''دیکھا، دیکھا---'' ابا چلائے۔ ''اسے نام بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے---ابے، کوئی قابل اعتراض قسم کا نام تو نہیں ہے، چھاپہ پڑ گیا تو سب اندر ہو جائیں گے۔''

''نن---نہیں، ابا! ایسی بات نہیں---بتاؤ اپنا نام ابا کو---'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''وہ---م---میرا نام---جوہی چاولہ ہے۔''

اس نے آہستہ سے کہا اور ابا بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ قریب آکر اس کا جائزہ لیا، پھر میری طرف مڑے۔ مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر مجھے گھورتے رہے، پھر میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''آج سے تو میرا باپ ہے۔''

☆☆

توہمات کی دنیا

☆ ڈی۔ زیڈ فیض

مرغا بانگ نہ دے گا تو صبح نہ ہوگی۔ جی ہاں کسی زمانے میں اس توہم پر بھی لوگ اعتقاد رکھتے تھے لیکن آج کل سائنس کا دور ہے اور عام طور پر سننے سنانے میں یہی آتا ہے کہ انسان توہمات کی دنیا سے نکل چکا ہے لیکن آیئے آج ہم آپ کو ایسے حقائق سے آشنا کرتے ہیں کہ جن کو جان لینے کے بعد آپ اس حقیقت سے آشنا ہو جائیں گے کہ توہم پرستی جسے پاکستان، ہندوستان یا برصغیر کا خاصہ سمجھا جاتا ہے حقیقت میں وہ مغربی ''ترقی یافتہ'' ممالک میں بھی اسی شدت سے موجود ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد آپ بھی یہی کہیں گے کہ ''توہمات کے اس حمام میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب ننگے ہیں۔'' ترقی یافتہ ممالک میں برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، ہالینڈ، جرمنی اور فرانس جیسے ممالک میں توہمات پر بے پناہ اعتقاد دیکھنے میں آیا ہے۔

''توہمات کی دنیا'' کی باتوں کی ابتداء ہم چونٹیوں سے کرتے ہیں۔ چونٹیاں اگر کسی کو کاٹ لیں تو کہا جاتا ہے کہ چونٹی نے کس Kiss کیا ہے لیکن بیشتر مغربی ممالک میں چونٹیوں کے متعلق یہ وہم موجود ہے کہ ان کی آمد برے موسم کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور یہ کہ اگر آپ چونٹیوں کی قطار پر چلنا شروع کر دیں تو سمجھ لیجئے کہ بارش شروع ہونے والی ہے (میرے خیال سے یہ بارش کروانے کا اکسیر نسخہ ہے۔) ان لوگوں کی توہم پرستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ چونٹیوں کے ٹھکانے تباہ نہیں کرتے اور اسے اپنے لئے منحوس خیال کرتے ہیں۔ برطانیہ، ہالینڈ اور آئرلینڈ کے عوام میں یہ وہم پایا جاتا ہے کہ اگر چونٹیوں کے انڈے شہد میں ملا کر کھائے جائیں تو یہ محبت کے لئے تریاق ثابت ہوتے ہیں اس لئے اگر آپ کو کسی سے محبت ہو تو چونٹیوں کے انڈے محبوب کو کھلا دیں، محبوب آپ کے قدموں میں ہوگا۔

چونٹیوں کی طرح چمگادڑ بھی موسم پر اثر انداز ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کوئی چمگادڑ کسی عمارت سے ٹکرا جائے تو یہ بارش کی پیشن گوئی ہے۔ کچھ یورپی اقوام میں تو چمگادڑ کو بہت زیادہ نیک فال سمجھا جاتا ہے۔ اگر چمگادڑ کی کوئی ہڈی آدمی اپنے پاس رکھ لے تو وہ خوش قسمت ہوگا۔ آسٹریلیا اور افریقہ کے کچھ ممالک میں اس وہم پر اعتقاد ہے کہ چمگادڑ ایک انسان کی زندگی ہے اور اگر کوئی شخص کسی چمگادڑ کو ہلاک کرے گا تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔

شہد کی مکھی کو مارنا برا شگون خیال کیا جاتا ہے اور عیسائیوں کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی چھوٹی خادمائیں ہیں۔ ہمارے ہاں جس طرح کوے کا چھت کی منڈیر پر کائیں کائیں کرنا مہمان کی آمد کا اعلان سمجھا جاتا ہے، اسی طرح یورپی ممالک میں شہد کی مکھی کا گھر میں داخلہ مہمان کی آمد کا پتہ دیتا ہے اور اگر شہد کی مکھی کسی سوئے ہوئے بچے پر اڑتی نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس بچے کی خوش بختی کی علامت ہے۔

شہد کی مکھی کی طرح بھونرا بھی ''توہمات کی دنیا'' کا شکار نظر آتا ہے اگر بھونرا کسی انسان کے جوتے پر سے گزر جائے تو یہ اس آدمی کی موت کی خبر ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے دنیا کے اکثر ممالک میں ایک ہی جاندار کے بارے میں دو الگ طرح کی رائے بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً بھونرے کو ہی لیجئے، سکاٹ لینڈ کے لوگ اسے مارنا برا تصور کرتے ہیں اور بعض یورپی ممالک میں اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

اب ذرا پرندوں کی طرف آتے ہیں۔ آج سے پہلے رات کو اگر

آپ نے پرندوں کو کسی درخت کے گرد چکر لگاتے دیکھا ہے اور آپ نے اس کا نوٹس نہیں لیا تو آئندہ احتیاط رکھیے گا' خاص طور پر اگر آپ آئیرلینڈ' برازیل یا آسٹریلیاں میں ہوں کیونکہ وہاں یہ اعتقاد عام ہے کہ اگر بھورے اور سیاہ رنگ کے پرندے رات کو درختوں کے چکر کاٹتے نظر آئیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ان درختوں پر روحیں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہی ہیں۔ فرانس میں اگر آپ سفر پر روانہ ہونے والے ہوں اور پرندوں کا غول دیکھیں تو یہ آپ کے سفر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی طرح دو سیاہ پرندے اگر فرانس میں اکٹھے ہوں تو یہ اچھا شگون ہے اور اگر یہ بیچارے بدقسمتی سے جا کر دوسری جگہ اکٹھے ہوں اور وہ جگہ ولندیزیوں کی ہو تو یہ منحوس ہے اور وہ اسے کسی کے مرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب سیاہ پرندوں کی قسمت دیکھیے بے چارے!

اب آتے ہیں۔ "ترقی یافتہ" امریکہ کی طرف۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ امریکن اس اعتقاد کے ہیں کہ ریچھ سات سال بعد بچے کو جنم دیتا ہے اور اس جس سال وہ جنم دے' اس سال ان کے ضلع میں کوئی بیماری پھوٹ پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکیوں میں کالی کھانسی کا توہمانہ علاج یہ ہے کہ اگر کسی بچے کو کالی کھانسی ہو اور اس بچے کو ریچھ کی سیر کروائی جائے تو کالی کھانسی ختم ہو جائے گی۔

کالی بلی اگر راستہ کاٹ جائے تو فوراً واپس گھر آ جائیں بشرطیکہ آپ برصغیر پاک و ہند میں ہوں کیونکہ جس کام سے آپ جا رہے ہیں' وہ نہیں ہو گا لیکن یقین کیجئے برطانیہ میں اسی بات کو خوش قسمتی کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس بات کو بھی تسلیم کر لیجئے کہ سیاہ بلی اگر برطانیہ میں آپ کے گھر میں داخل ہو گی تو باعث رحمت اور برصغیر میں ہو تو باعث زحمت اور ہاں اگر آپ نے برطانیہ میں سیاہ بلی کو ہلاک کر دیا تو آپ نے اپنی تباہی کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ امریکہ میں البتہ کالی بلی بدشگون اور بھوری اور سیاہ سفید بلیاں نیک فال سمجھی جاتی ہیں۔

اس "توہمات کی دنیا" میں مرغا بھی سخت توہمات کا شکار ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک سفید مرغا باعث رحمت اور سیاہ مرغا شیطان کی روح خیال کیا جاتا ہے اگر امریکہ میں آپ کسی کام سے جا رہے ہوں اور مرغ بانگ دے دے تو پر یقین ہو جائیے کہ کام ہو جائے گا اور ہاں اگر آپ برطانیہ میں ہیں اور بدقسمتی سے بیمار ہو گئے ہیں تو دوائی مرغ کی بانگ کے ساتھ کھائیے گا' دوائی جلد اثر کرے گی اور آپ کی بیماری بھی جلد رفع ہو جائے گی۔

سکاٹ لینڈ میں سفید گائے کے دودھ کو ادنیٰ خیال کرتے ہیں اور اگر گائے کسی کے باغ کو نقصان پہنچائے تو یہ بے چارے مالک کی موت کا اعلان ہے اور سنئے' اگر امریکہ میں گائے دم کو اوپر اٹھالے تو بارش کی آمد آمد ہے اور اگر یہی دم برطانیہ میں کسی درخت پر ماری جائے تو خراب موسم کی نشاندہی خیال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تو محکمہ موسمیات والے گائے سے کافی مدد لیتے ہوں گے۔ اگر گائے سے نہیں تو کم از کم اس کی دم سے تو لیتے ہی ہوں گے۔

اگر ایشیا کے ہندوؤں میں گائے قابل ستائش ہے تو اہل یورپ میں یہ مقام جھینگر کو حاصل ہے۔ اگر آپ کو اپنی آواز خوبصورت بنانے کا

شغل + مغل

✿ مرد کی اِک شہ اِک چیز خالی ہوتی ہے' کبھی جیب تو کبھی کھوپڑی ---- نازیہ ناز نازی
☆ ---اور خالی کرنے والی عورت ہی ہوتی ہے' نا!

✿ اپنے آپ کو شاہ رُخ سمجھنے والوں کے گھر آئینے شاید ٹوٹے ہوتے ہیں---- نازیہ ناز نازی
☆ اور اپنے آپ کو کرینہ کپور' ایشوریہ رائے اور رانی مکھرجی سمجھنے والیوں کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

✿ کون کہتا ہے شادی نہیں کرنی چاہئے' مجھے بتاؤ میں اس کے ہاتھ چوم لوں---- توصیف احمد
☆ بیر جنگلی---- انہوں نے ایک ہفتے سے ہاتھ نہیں دھوئے' اسی بہانے ان کے ہاتھ بھی صاف ہو جائیں گے۔

✿ زبان دراز مرد گونگا کب بنتا ہے---- جب اس سے بینک بیلنس کا پوچھا جائے---- نازیہ ناز نازی
☆ اور زبان دراز عورت گونگی کب بنتی ہے جب اس سے اس کی عمر پوچھی جائے۔

✿ "جانو! سو روپے کا ایزی لوڈ بھیجنا" تمہارے رقیب کو بُرا بھلا کہنا ہے"---- محبوبہ---- محمد کامران شہزاد
☆ اس جھانسے میں آ کر پھر آپ نے کتنے کا ایزی لوڈ بھیجا؟

✿ کسی لڑکی کا دل جیتنے کے لیے موبائل کا تحفہ کامیاب نسخہ ہے---- محمد کامران شہزاد
☆ اور یوں لڑکی کو جیتنے کے لیے بھی کوئی نسخہ بتا دیجئے؟

✿ عورت کی خوبصورتی کو ماپنے والا آلہ اس کی زبان ہے---- توصیف احمد
☆ اگر اس طرح عورت کی خوبصورتی کو ماپا جائے تو جا بجا چڑیلیں ہی نظر آئیں گی۔

✿ مجھے اگر ایک دن کی حکومت مل جائے تو ان کچھوروں کو تیر کی طرح سیدھا کر دوں---- نازیہ ناز نازی
☆ بلی کو خواب---- !

✿ یہ ماننا پڑے گا کہ صنف نازک کو بگاڑنے میں ٹی وی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے---- ظفر ندیم داہرہ
☆ ---- اور نوجوان لڑکوں نے بھی۔

✿ جوں جوں شادی پرانی ہوتی جاتی ہے' شوہر کی محبت کا پارہ ڈاؤن ہوتا جاتا ہے---- نازیہ ناز نازی
☆ کاش آپ کی بھی کوئی بیوی ہوتی تو "وجہ" آپ کو معلوم ہو جاتی۔

✿ لڑکے کی نظر لڑکی کے چہرے پر ہوتی ہے---- نازیہ ناز نازی
☆ اور لڑکی کی نظر لڑکے کی جیب پر۔

محمد صابر مغل عبدو پوری

جنون ہو تو آپ امریکیوں کے اس وہم پر عمل کر سکتے ہیں جس کے مطابق وہ کہتے ہیں کہ مرے ہوئے جھینگر کو ابال کر پیا جائے تو اس سے آواز میں خوبصورتی پیدا ہو جائے گی۔

جھینگر کو ابال کر پینے سے آواز خوبصورت ہو نہ ہو کوے کی آواز ہمارے کانوں کو جتنی بھلی لگتی ہے وہ سب جانتے ہیں۔ ویسے اسے کووں کی بدقسمتی ہی کہیے کہ ان بے چاروں کو پوری دنیا میں برا خیال کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں کوے کا منڈیر پہ چلنا موت کے فرشتے کی آمد کا اعلان ہے جبکہ یہی بات برصغیر میں مہمان کی آمد خیال کی جاتی ہے۔

یورپ والوں کی توہمات بھی عجیب قسم کی ہیں ککو (کوئل جیسا پرندہ) یورپ والوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ککو کی آواز کانوں میں پڑ جائے تو منحوس اور اگر بستر سے اٹھ کر جار ہے ہوں تو نیک فال۔ امریکہ میں کسی غیر شادی شدہ لڑکی کا ککو کی آواز سننا شادی کا پیغام ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ جتنی بار ککو کی آواز سنی' اتنے سال شادی کا انتظار کرنا ہوگا۔

ہندوستان والے یہ خیال کرتے ہیں کہ بھوک کی حالت میں مگرمچھ انسانوں کی آواز نکال کر اپنے شکار کو متاثر کرتے ہیں۔ ہندو اور امریکی انڈین یہ خیال کرتے ہیں کہ کتے کسی بیماری یا برائی کو گھر سے نکالنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ مسلمانوں کیک یہ خود بیماری خیال کیے جاتے ہیں۔ آئرش لوگوں کے نزدیک صبح کے وقت کتے کے بھونکنے کی آواز بدشگونی ہے اور برطانوی کہتے ہیں کہ راہ چلتے اگر کوئی انجان کتا آپ کے پیچھے چلنے لگے تو یہ آپ کے لئے نیک فال ثابت ہوگا۔ امریکہ میں اگر کوئی کتا پنجوں کو سکیڑ کر اور اپنی دم کو گول کر کے لیٹا یا سویا ہو تو اس کا مطلب ہے کہ کہیں کوئی مر گیا ہے اور کتے کی دُم موت کی صحیح سمت کی نشاندہی کر رہی ہے۔ فرانس میں اگر کسی شادی شدہ جوڑے کے درمیان سے کتا گزر جائے تو یہ ان کی جلد علیحدگی کا اعلان ہے۔

گدھے کے متعلق بعض توہمات بے حد مضحکہ خیز ہے۔ برطانوی کہتے ہیں کہ اگر امریکی کالی کھانسی کا علاج ریچھ پر سیر کروانے سے کرتے ہیں تو ہم کالی کھانسی کا علاج مریض کو گدھے پر بٹھا کر دائرے میں نو چکر لگانے سے کرتے ہیں۔ اس سے بیماری کا علاج ہو جائے گا (آزمائش شرط ہے) یورپ اور برطانیہ میں اب تک یہی خیال کیا جاتا ہے کہ صرف گدھا ایک ایسا جانور ہے جسے اپنے مرنے کے صحیح وقت کا علم ہوتا ہے اور وہ اپنی موت کے وقت چھپ جاتا ہے اور اگر کوئی مرا ہوا گدھا دیکھ لے تو یہ اس کے لئے نیک شگون ہے۔

یورپ اور برطانیہ میں فاختہ واحد پرندہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس پر شیطان کا سایہ نہیں پڑ سکتا اور اسے ایک مقدس پرندہ خیال کیا جاتا ہے۔ انڈین اسے مارنا بدشگونی سے تعبیر کرتے ہیں۔

فاختہ کے ساتھ ساتھ شاہین کی بھی سنتے چلئے کہ دنیا میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شاہین کے انڈے چرا لے تو وہ ہمیشہ کے لئے دماغی مریض بن جاتا ہے۔

آیئے اب آپ کو مچھلی کے بارے میں دلچسپ توہمات سے آگاہ کرتے ہیں۔ مچھلی کا گوشت کھانے سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ جی ہاں' برطانوی صدیوں سے اسی اعتقاد پر قائم ہے۔ امریکہ میں ایک مچھلی

شغل + مغل

(روحِ فراز سے معذرت کے ساتھ)

میری خوشی کے لیے بھی کس قدر مختصر تھے فراز
ابھی اُس کو مسکرا کر دیکھا ہی تھا کہ اُس کے بھائی نے دبوچ لیا

برسوں کا پیاسا ہوں' فراز
پاپ منہ میں رکھ کر کوئی موٹر چلا دے

سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں اکثر' فراز
بیوی سے بحث میں آج تک کوئی بھلا جیت سکا ہے

وہ جانتا تھا کہ اُس کی ہنسی مجھے پسند ہے' فراز
نہ جانے پھر وہ کمبخت اپنی بتیسی کہاں چھپا گیا

محبت ملی تو نیند بھی اپنی نہ رہی' فراز
کاش کوئی محلے میں چوکیدار ہی لگوا دے

میں اور اُس کو بھلا دوں کیسی باتیں کرتے ہو فراز
ظالم نے چائے میں جمال گھوٹا مجھے پلا دیا تھا

دُنیا کا یقین کریں بھی تو کیسے کریں فراز
سب نے ہی قرض لے کر منہ پھیر لیا آخر

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
ایک مشرق کی جانب اور ایک مغرب کی جانب

لوگ میری دیوانگی کو فقیری سمجھتے رہے' فراز
تعویذ لینے والوں کا اک ہجوم اکٹھا ہو گیا میرے گرد

اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے' فراز
اُس کے بچے ہمیں ماموں کہنے لگے

ہماری زندگی میں ہی اندھیرے لکھے ہیں فراز
کاش ہمیں بھی کوئی نظر کی عینک لگوا دے

بوندیں گریں تو آنکھوں میں آنسو بھی آگئے' فراز
وہ کمبخت سمجھا کہ پیاز کاٹ کر آیا ہوں

پیار کی خاطر ہم نے کیا کچھ نہیں کیا' فراز
ظالم نے پھر بھی بھائی بنا لیا مجھے

محبت کے انداز جدا جدا سے ہیں' فراز
ہم نے ٹانگ توڑی تصیبو نے سر

محمد صابر مغل عبدوپوری

کو "ڈاکٹر مچھلی" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کے کھانے سے ہر طرح کی بیماری رفع ہو جاتی ہے۔

توہمات بنانے والوں نے تو پسوؤں اور کھٹملوں کو بھی نہیں بخشا۔ جرمن یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی کھٹمل کسی کے ہاتھ پر کاٹتا ہے تو یہ اسی چیز کی نشانی ہے کہ اسے کوئی اچھی خبر ملنے والی ہے۔ یورپین خیال کرتے ہیں کہ اگر ایسٹر سے قبل جمعرات کو بستر کو کھلی ہوا میں رکھا جائے تو اس بستر میں کبھی کھٹمل داخل نہیں ہوتے اور دنیا کے کچھ علاقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کسی آدمی کو زیادہ کھٹمل کاٹیں تو یہ اس آدمی کی موت کا شگون ہے۔ اس وہم سے کافی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوتی ہے کیونکہ دنیا کے کئی خطوں میں کھٹمل بکثرت پائے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی شرح اموات بھی بے پناہ کم ہے۔ اس سلسلے میں نائجیریا کے کچھ افریقی قبائل قابل ذکر ہیں۔

لومڑی کو مکار ترین جانور شمار کیا جاتا ہے لیکن ولندیزیوں کا خیال ہے کہ اگر لومڑی اکیلی نظر آ جائے تو خوش قسمتی کا باعث ہے۔

بکرے "توہمات کی دنیا" میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ برطانوی خیال کرتے ہیں کہ اگر شیطان چاہے تو وہ بکرے کی شکل میں سامنے آ سکتا ہے۔ کچھ انگریز ممالک میں آج بھی اس بات پر اعتقاد قائم ہے کہ کوئی انسان بکرے کو متواتر چوبیس گھنٹے نہیں دیکھ سکتا کیونکہ ہر بکرے کو ایک وقت متعین پر اپنے مالک یعنی شیطان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ایک خاص مقام پر ملنا ہوتا ہے اور اس کی نشانی یہ خیال کی جاتی ہے کہ اس وقت کے دوران بکرے کے چہرے پر لٹکے بال سلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امریکن کہتے ہیں کہ گھر سے بیماری نکالنے میں بکرا آپ کا بہترین معاون ہو سکتا ہے بشرطیکہ کہ وہ آپ کے ساتھ کام کرنے پر رضامند ہو اور اپنے جسم کو زمین پر رگڑے تو بیماری بھاگ جائے گی۔

سیٹی بجاتی عورت اور کڑکڑاتی مرغی بدبختی کی علامت ہے۔ جی ہاں "برطانوی توہم پرستی" میں مرغی کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ "توہمات مرغی" کی رو سے اگر کوئی مرغی گھر کے قریب کڑکڑاتی ہوئی نظر آئے تو بدقسمتی کی علامت ہے۔

گھوڑا انسان کا جتنا قریبی اور پرانا ساتھی ہے اس سے توہمات بھی اسی قدر زیادہ ہیں۔ یونانی دور میں گھوڑے کی پوجا کی جاتی تھی لیکن آج کل اس کی توہمات کی پوجا کی جاتی ہے۔ برطانویوں کے نزدیک سیاہ گھوڑا خوش قسمتی اور چتکبرا گھوڑا بدقسمتی کی علامت ہے۔ برطانوی دیہاتی سفید گھوڑے سے بے پناہ گھبراتے ہیں مگر وہ سفر پر جا رہے ہوں اور سفید گھوڑا نظر آ جائے تو ان کو واپس آنا پڑتا ہے۔ برطانیہ میں اس کے علاوہ بھی گھوڑی کے متعلق کافی نامعقول توہمات ہیں۔ مثلاً وہ ایک ایسا لفظ رکھتے ہیں جسے ضدی سے ضدی گھوڑے کے سامنے بھی کہا جائے تو وہ شریف گھوڑا بن جاتا ہے لیکن ہاں! ہم وہ لفظ آپ کو نہیں بتائیں گے کیونکہ وہ لفظ "خفیہ" خیال کیا جاتا ہے اور صرف چند آدمیوں کے پاس محفوظ ہے۔

برطانوی توہم پرست مشہور ہیں لیکن امریکی بھی اب کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ سرخ سر والی کوئی لڑکی سفید گھوڑے پر آپ کے راستے میں سامنے سے گزر جائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی بدبختی آ گئی۔

چھپکلی ہمارے ہاں نفرت کی علامت ہے اور بیچاری کا یہی حال مغربی ممالک میں ہے۔ برطانوی اور یورپین خیال کرتے ہیں کہ اگر دولہا دلہن کو گرجا گھر میں چھپکلی نظر آ جائے تو یہ بدشگونی ہوتی ہے تاہم فرانس میں چھپکلی کسی حد تک بچی ہوئی ہے، فرانسیسیوں کے نزدیک اگر کوئی چھپکلی کسی عورت پر گر جائے تو وہ عورت سلیقہ شعار ثابت ہوگی۔

چکاوک ایسے خوبصورت اور پیارے پرندے کو کہتے ہیں جو گانے میں بہت مشہور ہے اور یورپ میں اسی وجہ سے یہ بہت زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ یورپ میں یہ توہم موجود تھی کہ اگر ان پرندوں کو سرخ سلاخوں سے اندھا کر دیا جائے تو ان کی آواز میں سوز و گداز آ جاتا ہے اور یہ اچھی آواز میں گاتے ہیں یورپ میں ان پرندوں کو اندھا کرنے کا بہت رواج تھا۔ انہیں جانوروں کے متعلق ایک اور توہم یہ ہے کہ اگر اتوار کے روز گرجے کی گھنٹیوں کے بجنے سے قبل چکاوک پرندوں کے تین انڈے کھائے جائیں تو آواز بہت خوبصورت ہو جائے گی۔ سکاٹ لینڈ کے لوگ اس توہم کا شکار ہیں کہ اگر کسی کھیت میں الٹے لیٹ کر ان پرندوں کی آواز کو سنا جائے تو آدمی ان کے ادا شدہ الفاظ کو بہت اچھی سمجھ سکتا ہے۔

☆☆

قابلِ دید

حوالدار بلند خان ایک دن ڈیوٹی پر روانہ ہونے کے لیے تھانے سے نکلا تو اس کے سامنے سے ایک ٹیکسی سست رفتاری سے گزر رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اچھل کر اس کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ جو تمہارے آگے آگے ٹیکسی جا رہی ہے، اس کا پیچھا کرو۔ یہ مجھے مشکوک لگتی ہے، مجھے ہر حال میں اس کا پیچھا کرنا ہے۔"

"صاحب جی!" ڈرائیور نے عاجزی سے کہا۔ "وہی گاڑی تو میری خراب گاڑی کو باندھ کر لے جا رہی ہے۔"

حافظ ریحان، ملتان

دلچسپ سفر

☆ عاطف

گاڑی کراچی جانے کے لئے آنے والی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر فقیر اس طرح چہل قدمی کر رہے تھے۔ جس طرح شہنشاہ جہانگیر اپنے محل میں چہل قدمی کر رہے ہوں۔ جس وقت گاڑی آئی تو بہت رش تھا۔ اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اتنے میں سیٹی بجی اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ہمارے دوست جو ہمیں چھوڑنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہیں ایک دم ہوش آیا اور ہمیں جھارے پہلوان کی طرح اس طرح ڈبے میں اٹھا کر پھینک دیا جسطرح کسٹم والے سامان پھینکتے ہیں۔ ہم سری کانت کی وکٹ کی طرح اڑتے ہوئے فوم کے گدے پر گرے تھے۔ بڑا عجیب طرح کا گدا تھا۔ ابھی اس پر جھولے ہی لے رہے تھے کہ ایک گرز ہماری پسلیوں پر پڑا۔ ہم اچھل کر نیچے جا گرے مڑ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی مگر گرے ہی اس طرح تھے کہ ہماری پشت ہمارے سامنے آ گئی۔ غور سے دیکھا تو فوم کا گدا ایک موٹی لڑکی کا روپ دھار چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھتے اس نے اپنا بھاڑ سا منہ کھولا اور بولی۔ ''تمہارے دوستوں نے مجھے ناگاساکی یا ہیروشیما سمجھ لیا تھا کہ ایٹم بم کی طرح مجھ پر پھینک گئے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ دو سیٹوں پر اکیلی ''سیٹ'' ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس صورت حال سے ہم بھی بالکل اسی طرح پریشان تھے جس طرح انجمن شادی کے بعد سلطان راہی کی طرف سے پریشان ہیں۔

ہماری مسکین صورت دیکھ کر اس گوشت کے پہاڑ کا دل نرم ہوا تو اس نے پوچھا۔ ''آپ شکل سے ہی پریشان کیوں دکھائی دیتے ہیں؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''جی دراصل میں نے پریشانی کی گولیاں کھائی ہیں۔''

گاڑی نے پٹڑی بدلی اور ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ ہمارے صندوق پر برف کے تودے کی طرح گری اور اس کے ساتھ ہی ہمارے صندوق کی حالت بھی بدل گئی' گو کہ اس وقت ہمیں پتہ نہ چلا۔ اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی کہ پھر مجھ سے کہا کہ مجھے اٹھاؤ۔ میں نے دل میں کہا کہ یا خدا جتنی تکلیف مجھے اس کو اٹھانے میں ہوگی اس سے بہتر ہے کہ تو ہی اسے اٹھا لے۔ میں نے اسے اٹھانے کے لئے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ہیروئن کی طرح اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا لیکن جب اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ہم پہاڑ کو اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پسینے سے شرابور یا خدا مدد کا نعرہ بلند کر کے ایک مرتبہ پھر اس ہتھنی کو اٹھانے کی کوشش کی جس میں خدا نے عزت رکھ لی۔ ایک تو پہلے ہی پسینہ نکل چکا تھا اوپر سے ہم شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ جب وہ اٹھی تو ہمارے جسم سے تین گھڑے پانی ضرور نکلا ہوگا۔ ڈبے میں پانی دیکھ کر ہم غش کھا کر گر گئے۔ مسافروں نے گتے کا پنکھا بنا کر ہوا دی تو کچھ ہوش آیا۔ پینے کے لئے پانی مانگا تو کہنے لگی کہ پہلے مجھے دو۔ کسی صاحب نے ''لیڈی فرسٹ'' والے اصول کے مطابق اسے پینے کے لئے پانی دیا تو اس نے گلاس کی مدد سے پورا واٹر کولر ہی خالی کر دیا۔ ان صاحب کے بچے نے پوچھا کہ ابو ہم اب کہاں سے پانی پئیں گے تو لڑکے کی ماں نے غصے سے کہا کہ بیٹا اگلے اسٹیشن پر اس موٹی کو ہی ٹونٹی لگوا لیں گے۔

اسی ڈبے میں کچھ اور لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمارے چہرے پر بجے ہوئے بارہ دیکھ کر انہوں نے اپنے قریب ایک خالی سیٹ پر بیٹھنے کی دعوت دی جسے میں نے اس طرح قبول کر لیا' جس طرح کچھ سرکاری افسر رشوت قبول کرتے ہیں۔ میرے بیٹھنے پر انہوں نے پوچھا کہ کہاں

سے تشریف لائے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ گجرات سے۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے پھر پوچھا۔ کیا آپ تعارف کرانا پسند کریں گی تو انہوں نے زلفوں کو زور سے جھٹکا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ چار پانچ کٹے (کیونکہ جوئیں کہنے سے تو جوؤں کی توہین ہوگی) ان کے سفید دوپٹے کی زینت بن گئے۔ ایک ادا سے جواب دیا۔ ''ہم ''واہیات سسٹرز'' ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وضاحت کی کہ ہم دوسری قسم کی ''واہیات'' نہیں ہیں بلکہ ہمارا نام واہیات سسٹرز اس لئے پڑ گیا ہے کہ ہمارے بھائی جان شاعر ہیں اور ان کا نام حیات ہے جب وہ اکثر اپنا کلام سناتے ہیں تو ہم کہتی ہیں واہ حیات' واہ حیات۔ اس لئے لوگوں نے ہمیں ''واہیات سسٹرز'' کہنا شروع کر دیا اور یہ نام ہمیں پسند ہے۔ اس کے علاوہ ہم سب کو شاعری سے بھی تھوڑا بہت شوق ہے۔ پھر اس نے باقی لڑکیوں سے اس طرح تعارف کرایا۔

''ان سے ملیئے یہ ہیں جمیلہ مریم مریل۔ جیسا کہ ان کی شکل سے ہی ظاہر ہے ایک دفعہ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چھپکلی کو سوکھے کی بیماری لگ گئی ہو۔ یہ میری دوسری بہن ہیں غزالہ بیگم گڑ گڑ جھلو۔''

میں نے کہا۔ ''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں ان کا اتنا لمبا نام کیوں ہے؟''

اس پر انہوں نے کہا کہ ان کو دراصل گڑ سے بہت پیار تھا جہاں گڑ ہوتا' مکھیوں سے پہلے یہ وہاں پہنچ جاتیں اس لئے ہم انہیں پیار سے گڑ گڑ جھلی کہتے اور پھر ان کی ترقی ہوئی اور یہ جھلی سے جھلو ہو گئیں۔

ابھی تیسری سے تعارف نہیں ہوا تھا کہ اس نے ہماری طرف بڑی تیز نظروں سے دیکھا۔ ہم نے اپنے جگر پر ہاتھ رکھا اور یہ شعر منہ سے نکل گیا---

اُف تیرا تیر نظر' زخمی جگر' جاؤں کدھر
ہم ریل میں ہیں جان من' ملنے کا نہیں کوئی ڈاکٹر

یہ سنتے ہی انہوں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور تڑاخ سے جوتا ہمارے سر پر دے مارا۔ عزت تو ہماری خاک میں مل ہی گئی تھی مگر ہم نے پھر انہیں کلام سنایا---

سو جوتیوں سے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا

پھر ہم نے بال سنوارنے کی کوشش کی جو کہ سینڈل کی شرارت سے آوارہ ہو گئے تو پتہ چلا کہ سر میں جوؤں کے لئے ایک چھوٹا سا ''مل اسٹیشن'' قائم ہو چکا ہے جہاں وہ آسانی سے خرمستیاں کر سکتی تھیں۔

سب سے آخر میں میزبان نے اپنا تعارف کروایا کہ اس ناچیز بندی' گندی مندی کو افیشن آفندی کہتے ہیں اور ہمیں بھی آپ کی طرح مزاحیہ شعر پسند ہیں۔ پھر اس شیطان کی کالہ گرم مصالحہ نے کہا کہ آپ ہمارا مقابلہ کریں گے۔

میں نے ان کے خطرناک تیور بھانپ لئے اور کہا کہ میں ایک مرد ہوں اور مرا عورتوں سے کیا مقابلہ؟ مگر آپ کہتی ہیں تو تفریح کے لئے کر لیتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ شعر آپ پڑھیں گے یا ہم ابتدا کریں۔ میں نے اخلاقاً کہا کہ بسم اللہ کریں تو اس نے پہلے ہی شعر میں ہمارے طوطے تو کیا کوے تک اڑا دیئے۔ شعر ملاحظہ کریں---

مجھے اچھا نہیں لگتا تمہارا کھرلی جیسا منہ
ڈر فٹے منہ' ڈر فٹے منہ' ڈر فٹے منہ

یہ سن کر ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ شرم کے مارے آنکھوں سے پانی اور کانوں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ دماغ میں سیٹیاں سی بجنے لگیں مگر ہمت کر کے جواب میں کہا---

پیپل کا پتہ توڑ کے پتنگ اڑاؤں گا
تیری بے بے کو بیچ کے پکوڑے کھاؤں گا

اپنی امی کے متعلق ایسی نامعقول سی بات سن کر غزالہ بیگم نے سٹیل کا گلاس اس طرح ہماری طرف پھینکا جس طرح وسیم اکرم نے سری کانت کی طرف باؤنسر پھینکا تھا مگر ہم سری کانت کی طرح بدقسمت نہیں تھے سو بچ گئے مگر جس رفتار سے گلاس ہمارا سر توڑنے آیا تھا ہمیں نہ پا کر کھڑکی کا شیشہ توڑ کر باہر فرار ہو گیا۔ ہم نے گھبراہٹ میں بھی مقابلہ جاری رکھا اور کہا---

شیشہ ٹوٹے تو ٹوٹ جائے کوئی بات نہیں
سر نہ توڑو بیگم کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں

پسندیدہ

فیکٹری میں ایک سپروائزر نے کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد محسوس کیا کہ ورکر اسے پسند نہیں کرتے۔ ایک روز اس نے ایک ورکر کو علیحدگی میں بلایا اور اس سلسلے میں اُسے کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے لوگ یہاں مجھے پسند کیوں نہیں کرتے؟ اس سے پہلے میں جس کارخانے میں کام کرتا تھا وہاں ورکر مجھے اتنا پسند کرتے تھے کہ جب میں نے وہاں سے نوکری چھوڑی تو انہوں نے مجھے بہت شاندار فیرویل پارٹی دی اور تحفے کے طور پر ایک ٹی سیٹ پیش کیا۔''

''صرف ٹی سیٹ---؟'' ورکر نے حیرت سے کہا۔

''سر! جس دن آپ یہاں سے نوکری چھوڑ کر جائیں گے' ہم آپ کو اس سے بڑی فیرویل پارٹی دیں گے اور تحفے میں ڈنر سیٹ پیش کریں گے؟''

سحرش نثار' ملتان

شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر سب ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ اس میں کسی نے ٹی ٹی کو خبر کر دی۔ ہم نے اسے دور سے دیکھ لیا اور لوٹا پکڑ لیٹرین کی طرف یہ سوچ کر ہو لئے کہ لڑکیوں کا کچھ تو لحاظ کر ہی لے گا جونہی ہم دروازے کے قریب پہنچے تو اندر سے "پکے راگ" کی مشق کرنے کی آواز آئی۔ ہم نے دل میں سوچا کہ اسے بھی اب ہی مشق کرنی تھی۔ ابھی ہم دروازہ کھٹکھٹانے ہی والے تھے کہ دروازہ کھلا اور وہ صاحب باہر آ گئے۔ کپڑے پسینے سے بھیگے ہوئے پیشانی عرق آلود' ندامت سے جھکا سر' خفت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ہم نے پوچھا صاحب مانا کہ آپ کلاسیکی موسیقی بہت جانتے ہیں لیکن یہ جگہ سر لگانے کے اعتبار سے مناسب نہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ بس جی کیا کروں قبض کی وجہ سے اندر "سر ساگر" پروگرام چل رہا تھا۔ جس میں 'میں مہمان تھا اس لئے مظاہرہ تو کرنا ہی تھا۔

مختصر یہ کہ ہم وقت ضائع کئے بغیر لیٹرین میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلے تو مطلع صاف تھا۔ جب ہم اس موٹی لڑکی جس نے بعد میں اپنا نام بتول بیگم صہگال بتایا تھا' کے قریب سے گزرنے لگے تو نیچے لوہے کے ایک رنگدار ٹکڑے پر نظر پڑی۔ بہت یاد کیا کہ اسے ہم نے پہلے کہاں دیکھا ہے کہ اچانک ذہن میں ایک دھماکہ ہوا اور یاد آیا کہ اس جگہ تو ہمارا ایک صندوق پڑا ہوا تھا جس پر گوشت کا پہاڑ بتول بیگم گری تھیں۔ جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے میرا ناتواں بازو اس طرح اپنے ہاتھ کے شکنجے میں پکڑا جس طرح چوڑیاں نکالنے کے لئے لوہے کے پائپ کو مشین میں کسا جاتا ہے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے کچھ دیر پہلے میری مدد کی مگر اب آپ یہاں سے اٹھ کر ان مریل چوہیوں کے پاس کیوں بیٹھ گئے ہیں۔ میری طرف دیکھئے۔ کیا میں صحت مند نہیں ہوں؟ کیا آپ نے میری تصویر دودھ کے ڈبے میں نہیں دیکھی؟ میں نے کہا کہ آپ بجا فرما رہی ہیں اور آپ کے لئے تو کسی شاعر نے پہلے ہی سے ایک عدد شعر بھی لکھ دیا ہے۔۔۔۔

حسن کی اک اک ادا پر دل وجان سے صدقے مگر
لطف کچھ اس کے وزن سے دامن بچا کر گزر جانے میں ہے

یہ کہہ کر ہم نے اپنا بازو چھڑایا مگر کس حال سے چھڑایا یہ ہمیں ہی معلوم ہے۔ واپس اپنی سیٹ پر پہنچے اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے کہ ٹی ٹی چلا گیا تو افیشن آفندی نے کہا مگر آپ تو بزدلوں کی طرح بھاگ گئے تھے۔ یہ سن کر ہم غصے میں آ گئے اور دھاڑ کر کہا کہ ہم اس لئے چلے گئے تھے کہ خون خرابہ نہ ہو۔

یہ سن کر وہ چپ ہو گئیں۔ گاڑی کھٹا کھٹ دوڑ رہی تھی۔ باہر جھانک کر دیکھا تو حیدر آباد کا اسٹیشن آ چکا تھا۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ اوپر والی برتھ سے غزالہ بیگم کی زلفیں نیچے لٹکنے لگیں جن میں جوئیں کوہ پیماؤں کی طرح نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آ جا رہی تھیں۔ ہم نے بھی

شگوفے

"میں نے سنا ہے کہ تم نے مسٹر پال سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے آخر کیوں؟"

"پاپا کا خیال ہے کہ پال کو زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔ ممی کہتی ہیں کہ اس کی عمر زیادہ ہے۔ آنٹی سوچتی ہیں کہ وہ میرے شوہر کی حیثیت سے موزوں نہیں ہے۔ انکل نے اس کے بارے میں کئی افواہیں سنی ہیں اور میری کزن قسم کھا کر کہتی ہے کہ وہ لڑکیوں کو فریب دینے کا عادی ہے۔ اور میں ۔۔۔۔"

"ہاں ہاں' خاموش کیوں ہو گئیں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں سوچتی ہوں کہ وہ باقاعدہ شادی کا پیغام بھیج دے تو سارے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔"

☆☆

ایک ٹیسٹ میچ میں ملک کا مایہ ناز کھلاڑی پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہو گیا اور وکٹ کیپر کو بہت افسوس ہوا۔ وہ ازراہ ہمدردی بول اٹھا۔

"کوئی بات نہیں دوست! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو نا پچھلے میچ میں آپ نے بولروں کی خوب ٹھکائی کر کے ڈبل سنچری مکمل کی تھی۔"

"ہاں ہاں بھئی پچھلی دفعہ میں خوب جم کر کھیلا تھا اور جب میں آؤٹ ہو کر واپس پویلین پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء اور مشروبات تمام ٹیم ختم کر چکی تھی اور مجھے بھوکا رہنا پڑا۔" مایہ ناز کھلاڑی نے جواب دیا۔

☆☆

ایک جوڑا سپر اسٹور میں دیر سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ دونوں کبھی کسی شیلف میں رکھی ہوئی چیزوں کے نام زور سے پڑھنے لگتے اور کبھی ایک دوسرے سے پوچھنے لگتے کہ فلاں شیلف میں کیا رکھا ہے۔ سیلز مین نے قریب جا کر ان دونوں سے کہا۔

"اگر آپ کو کسی خاص چیز کی ضرورت ہے تو میں نکال دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں' ہمیں خریدنا کچھ نہیں ہے۔" عورت نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم میاں بیوی نے نئے کانٹیکٹ لینس لگوائے ہیں' ہم تو ذرا انہیں چیک کر رہے ہیں۔"

☆☆

اسکول میں ایک کلاس کے بچوں کو کسی سواری کے بارے میں ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا۔ ایک بچی نے لکھا۔

"میرے ابو نے ایک پرانی کار خریدی پہلی رات وہ ہمیں اس میں بٹھا کر سپر ہائی وے پر بہت دور ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ راستے میں کار خراب ہو گئی۔ ہمیں کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملی اور کسی نے ہمیں لفٹ بھی نہیں دی۔ ہمیں کئی میل تک پیدل چلنا پڑا۔ بس! یہ تقریباً پچاس الفاظ ہو گئے۔ تقریباً دو سو الفاظ وہ ہیں جو ابو نے راستے میں بولے مگر وہ لکھنے کے قابل نہیں۔"

احمد علی سعدی' ملتان

جوؤں سے اٹکیلیاں کرنی شروع کر دیں۔ جس جوں کو چاہتے پکڑ کر چوٹی پر پہنچا دیتے اور جس جوں کو چاہتے ہرا دیتا دیتے اور ہاری ہوئی جوں اس طرح شرمندہ ہوتی جس طرح ورلڈ ہاکی کپ میں پاکستان ہوا تھا۔ ابھی ہم جیت ہار میں ہی مشغول تھے کہ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا مگر اس جھٹکے سے ہی غزالہ بیگم گڑ گڑ جلو ہمارے کاندھے مبارک پر آ گریں۔ ہم اس ناگہانی آفت سے گھبرا گئے۔ ابھی پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں آئے تھے کہ ٹی ٹی دوبارہ ایک سپاہی باؤ ٹیٹری کے ساتھ آیا اور جھگڑا کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے دیکھا کہ لڑکیاں سپاہی کی وجہ سے ڈر گئی ہیں تو غصے میں بدقسمتی سے سپاہی سے کہہ دیا کہ لڑکیوں سے لڑتے ہوئے شرم نہیں آتی کسی مرد سے لڑو تو پتہ چلے۔ اتنا واقعہ ہمیں یاد ہے پھر جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔

ڈاکٹر ہمارے اوپر جھکا ہوا تھا ہوش میں آتے دیکھا تو پوچھنے لگا۔

''کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟''

میں نے پہلے اپنے چہرے کے زخم دیکھے پھر سر پر پٹیوں کی قطار محسوس ہوئی تو میں نے شرمندہ سا ہو کر جواب دیا۔ ''مگر میری لڑائی بیوی سے نہیں ٹی ٹی سے ہوئی تھی۔''

ابھی سوال و جواب جاری تھے کہ کالے بادل کی شکل والے ڈاکٹر نے اپنی جگہ بدلی تو ایک چاند سی نرس اس کی اوٹ سے طلوع ہو گئی۔ ڈاکٹر تو سوال و جواب کر کے چلا گیا لیکن اس نرس کی ڈیوٹی مجھ پر تھی۔ پہلے تو کاغذ پر وہ کچھ لکھتی رہی مگر بعد میں اس نے ایک بار میرا بھرپور جائزہ لیا اور پھر نظریں پھر لیں۔ میری زبان سے کراہتا ہوا یہ شعر لنگڑاتا ہوا نکل گیا۔۔۔

اک بار مجھے دیکھ کے کیوں پھیر لیں نظریں
انسان تھا اخبار کا کالم تو نہیں تھا

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ عجیب آدمی ہیں۔ آپ اتنی حجامت بنوانے کے بعد بھی مجھ سے گنجا ہونا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے مذاق کی عادت ہے۔ دیکھئے نا میں کتنی تکلیف میں ہوں مگر آپ کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں۔''

جواب دینے کی بجائے اس نے ڈبیہ میں سے پان نکالا۔ ایک خود کھایا اور ایک مجھے دیا۔ میں نے پان منہ میں رکھا اور ایک شعر ارشاد کیا۔۔۔

نہ دوا دیتے ہیں نہ دعا دیتے ہیں
اپنے بیمار کو بس پان کھلا دیتے ہیں

دل سی شے لے کے پلاتے ہیں لیمن کا گلاس
سخت حیرت ہے کیا چاہتے ہیں کیا دیتے ہیں

یہ سن کر اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''گو کہ آپ دلچسپ آدمی ہیں مگر ایک بات آپ نے غلط کہی ہے۔

میں نے پوچھا۔ کیا؟

اس نے جواب دیا۔ ''یہی کہ آپ کو دوا نہیں دی۔''

میں نے جواب میں کہا۔ ''دوا تو ڈاکٹر نے دی ہے آپ کا نام تو میں جب لوں گا جب آپ مجھے پلائیں گی۔''

اس نے پوچھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''حمید اعینکاں والا۔''

''مگر آپ نے عینک بھی نہیں پہنی پھر؟''

میں نے کہا جس طرح آنکھوں والے لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں عینکوں کے بغیر عینکوں والا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ آپ کی لڑائی کس بات پر ہوئی تھی؟ میں نے بات ٹالتے ہوئے پوچھا کہ اس وقت میں کس ہسپتال میں ہوں۔ اس نے جواب دیا۔ کراچی ہسپتال میں۔ کراچی کا نام سن کر جان میں جان آئی۔ میں نے کہا لیکن آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ اس نے جواب دیا۔ میرا نام افیشن ہے کیا آپ مجھ پر کوئی شعر لکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا آپ پر تو میں دیوان لکھ سکتا ہوں اور تھوڑی دیر غور فرمانے کے بعد شعر پڑھے۔۔۔

میں اک شعر بے قرار کہوں تجھ پر
سوچتا ہوں کہ تو میری افیشن نہ ہو
تجھے کسٹرڈ میں ملا تو لوں لیکن
سوچتا ہوں کہ مگر تو کہیں نمکین نہ ہو

یہ سن کر وہ ناراض ہو گئی کہ آپ نے مذاق کی بھی بے عزتی کر دی ہے۔ کبھی اپنا منہ دیکھا ہے چھوہارے جیسا۔ میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ پھر کہنے لگی کہ میرے وہ پچاس روپے دو جو پہلی دفعہ مرہم پٹی کے دوران میں نے اپنی جیب سے خرچ کئے تھے۔ میں نے بھی غصہ میں آ کر کہا۔ دے دوں گا' ایسے ہی نہیں بھاگ جاؤں گا۔ جانے سے دو دن پہلے اس نے پوچھا کہ میرا قرض بھول تو نہیں گئے۔ میں نے کہا۔ نہیں تھوڑی اور مہلت دو تو بھول جاؤں گا۔

ہسپتال سے فارغ ہو کر جیسے تیسے ہم گھر پہنچے تو گھر والوں نے خاطر تواضع کے بعد سفر کے متعلق تفصیلاً پوچھا۔ جواب میں ہم نے کان پکڑے اور کہا کہ آئندہ سے کبھی ریل گاڑی میں سفر نہیں کریں گے۔

☆☆

چاند نگر

مختلف موضوعات پر ہنستی مسکراتی، کھلکھلاتی ننھی تحریریں

''چاند نگر'' ایسی شوخ تحریروں سے آباد ہوتا ہے جو طوالت کے لحاظ سے ''نابالغ'' لیکن شوخی اور شرارت میں بالغ ہوتی ہیں۔ آپ بھی اس میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ کی تحریر میں مزاح کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونس ٹھونس کر بھرا گیا ہو۔ یہ خیال بھی رکھیے کہ یہ مسکراہٹیں آپ کی اپنی تخلیق ہوں، کہیں سے اُڑائی نہ جائیں۔ اپنے مختصر مضامین اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ''چاند نگر'' تمیں روزہ ''چاند'' 31-F، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ لاہور 54600

کبھی ہاں، کبھی ناں

فصیح انجم، لاہور

کسی دانشور نے کہا ہے کہ جس سے پیار ہو جاتا ہے اس کی جگہ دِل میں ہوتی ہے لیکن ہمارے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ ہم نے جس ہستی کو دِل میں بسایا تھا وہ بیشتر اوقات ہماری نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ یعنی وہ ہمارے لیے ایک ایسی خوبصورت تصویر کی شکل اختیار کر چکی تھی جسے دِل کے آئینے میں سر جھکا کر دیکھنا نہیں پڑتا تھا۔ جس آنکھوں کی ذرا سی جنبش سے اِس پیاری ہستی کا دیدار ہو جایا کرتا تھا اور وہ پلک جھپکتے ہی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ دراصل وہ ہماری خالہ کی بڑی چہیتی اور اکلوتی بیٹی تھیں اور اِن کا مکان بھی ہمارے گھر کے ساتھ تقریباً ہم آغوش تھا جس کی وجہ سے ہمارا زیادہ تر وقت دَرِ محبوب پر ہی گزرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں ہماری ملاقاتوں میں وہ والہانہ پن نہیں تھا جو پیار کے پُر خلوص جذبوں کی جان ہوا کرتی ہے۔ ہم اکثر اِن کی اِس بے رُخی اور تغافل شعاری کو دیکھ کر سوال کر بیٹھتے۔ ''خیر تو ہے' آج آپ کا موڈ کچھ آف سا لگ رہا ہے۔'' تیکھی چتونوں سے جواب دیا جاتا۔ ''کیوں میرے موڈ کو کیا ہوا۔ اچھی بھلی تو ہوں۔'' اس مختصر سے جواب کے بعد وہ گھر کے چند کام سنوارنے کے لیے چل دیتیں۔ پھر چند لمحوں بعد بڑی ادا سے اپنے چاند سے چہرے کو نازک ہتھیلیوں کے پیالے میں سجا کر ہمارے سامنے بیٹھ جاتیں۔ چہرے پر کچھ سوچ کی لکیریں اُبھرتیں پھر سوال کیا جاتا۔ ''ابھی تک آپ کہاں تھے۔ امی آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔'' یہ سنتے ہی ہم اُلٹا سوال کر بیٹھتے۔ ''اور آپ---آپ کو ہماری یاد نہیں آتی؟'' اونہہ کہہ کر وہ بڑی لاپرواہی سے اپنا رُخ پھیر لیتیں۔ پھر بڑی کٹیلی آواز میں کہا جاتا۔ ''میرے پاس اِتنا وقت کہاں کہ کسی کی یادوں کے فضول سے گلستان کی سیر کرتی پھروں۔'' حقیقتاً امی تو صرف بہانہ ہی ہوتا تھا۔ وہ خود کسی دِن ہمیں اپنے گھر میں نہ پا کر بے چین ہو جایا کرتی تھیں۔ اِس دو رُخی پالیسی کو وہ اِس وقت سے ہم پر آزما رہی تھیں جب سے ہم دونوں نے ہوش سنبھالا تھا۔ دیکھا جائے تو اُنہوں نے اپنے عقل و ہوش کو بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ باقی رہے ہمارے ہوش تو وہ اِن کے حسین سروپا پر نظر پڑتے ہی کسی خوبصورت پرندے کی طرح پُھر سے اُڑ جایا کرتے تھے اور اگر اِتفاق سے کوئی فلمی قسم کا ڈائیلاگ ہمارے ہونٹوں سے پھسل جاتا تو اِسے سن کر اُن کی چاند سی پیشانی پر دو کے بجائے چار بل پڑ جاتے اور وہ اپنے ہونٹوں پر آئی کوئی بات کو اِس مہارت کے ساتھ اپنے دِل کے نہاں خانے میں دھکیل دیتیں جیسے کوئی سپاہی مجرم کو جیل کے دروازے پر دھکا دیتا ہے۔ حقیقتاً یہ غصہ، ضد اور ہٹ اِن میں خالہ جان کی طرف سے ورثے میں ملی تھی اور اِن دو غصیلی، ضدی اور ہٹیلی ہستیوں کے دو پاٹوں کے بیچ ہماری معصوم محبت سرسے کی طرح پس کر رہ گئی تھی جسے اُنہوں نے بڑی احتیاط سے اپنی نرگسی آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ تاکہ ہم کہیں اِسے چرا نہ لیں لیکن کہاں تک وہ اِن پر اپنی نگاہوں کے پہرے بٹھائے رکھتیں لہٰذا ہماری یہ خبر کسی نہ کسی طرح اُڑتے اُڑتے بھابی جان تک پہنچ گئی۔ اُنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھٹ سے ہماری اِس مست رو رومانی ٹرین کو سرخ جھنڈی دکھا کر سیدھا امی جان کے سامنے لا کھڑا کیا اور اپنی بے پناہ مسرتوں کو ہونٹوں میں دبا کر غصے سے حکم دیا۔ بس بس بہت ہو چکا' اپنی اِس ڈھچر پچر ٹرین کو یہیں پر روک لو۔ آگے نہ لے جانا اَب یہی تمہاری منزل ہے۔ ہم اِس خوشخبری کو سن کر بجائے اِس کے کہ خوشی سے مر جاتے اپنی اِن بکھری بکھری سانسوں کو سمیٹنے لگے جنہوں نے ہمیں دَمِ مرگ کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر جب کچھ دَم میں دَم آیا تو ہم اِن عنابی ہونٹوں کے بارے میں سوچنے لگے جن پر ہمارا نام برسرِ الزام بھی نہیں آیا تھا اور غیریت کا چھوٹا سا لفظ ''آپ'' کبھی ''تم'' جیسے اپنائیت بھرے لفظ سے نہ بدلا گیا تھا۔ اَب ہم یہ سوچ کر پاگل ہو رہے تھے کہ کیا ''تین دفعہ قبول ہے'' کہنے سے کسی غیر ہستی کو اپنا بنایا جا سکتا ہے اور کیا وہ بھی دِل و جان سے

"تم" کہہ کر ہمیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے گی۔ بہر حال ہماری اِس خانہ آبادی اور شادی کا تعلق کیونکہ اِن کی ذا● سے بھی تھا اِس لیے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ پیار کی اس ریشمی گتھی کو سلجھانے کے لیے اِن نرم و نازک ہاتھوں کے حوالے کر دیا جائے جو ہمیں اپنے پوشیدہ رومانی جذبات چائے کی پیالی میں گھول کر ہمیں پلایا کرتے تھے۔

یہ سب سوچ کر ہم ایک خوبصورت سی شام کو خالہ جان کے یہاں جا پہنچے۔ جیسے ہی "اُن" کی نظر ہم پر پڑی وہ چھپاک سے کچن میں جا گھسیں۔ ہم نے خالہ جان کو آداب کہنے کے خیال سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن جب وہ ہمیں کہیں نظر نہ آئیں تو ہمارے قدم بے اختیار کچن کی طرف اُٹھ گئے جہاں وہ شرم و حیا سے سکڑی سمٹی ایک گوشے میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہم نے اُن کے پھول سے کھلے شرم آگیں چہرے پر نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"خالہ جان کہاں ہیں؟"

شرم سے بوجھل پلکیں اُٹھیں پھر آہستہ سے کہا گیا۔ "پڑوس میں گئی ہیں۔"

اُن کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہم نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

"آج تو آپ کا موڈ ہوا ہنستا اور مسکراتا نظر آ رہا ہے اور چاندی پیشانی پر سلوٹوں کے بل بھی نہیں۔"

"آپ کا چہرہ بھی تو آج نکھرا نکھرا سا لگ رہا ہے۔ خوشیوں اور مسرتوں کے پھول سے کھل رہے ہیں۔"

اِن الفاظ کو ادا کرتے وقت اُن کی آواز میں کلیوں جیسی نرماہٹ تھی۔ ہم نے ذرا غمگین سے لہجے میں کہا۔

"لیکن افسوس اِن خوشیوں اور مسرتوں کے پھولوں کو سمیٹنے والا کوئی نہیں۔"

جواب میں اُنھوں نے اپنے دوپٹے کا رنگین آنچل پھیلا دیا۔ "یہ کس لیے ہے۔"

ہم نے خوشی سے بے قابو ہو کر اِن ہاتھوں کو تھام لیا جن میں وہ دھنک رنگ آنچل لہرا رہا تھا۔

"کیا سچ ---؟"

ہم نے خوشیوں میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔ وہ شرم آمیز آواز میں سر جھکا کر بولیں۔

"ہاں نہیں تو کیا جھوٹ۔"

اور ہم اِس "ہاں نہیں" کو اپنے دل کے دامن میں سمیٹ کر خوشیوں اور مسرتوں میں جھومتے گھر لوٹ آئے۔

☆☆

شوہروں کی چند اقسام

معراج یاسمین، ڈیرہ اسماعیل خان

مردوں کا یہ معاملہ ہے کہ جسے "محبوبہ" کے رُوپ میں جی بھر کر چاہا ہو وہ شادی کے بعد بیوی کے رُوپ میں زہر لگتی ہے جبکہ عورتوں کے ساتھ یہ معاملہ بالکل اُلٹ ہے۔ وہ جسے ایک بار محبوب مانتی ہے وہی اِس کا محبوب رہتا ہے چاہے شوہر کے رُوپ میں ہی کیوں نہ ہو مگر عورت کے ساتھ یہ المیہ ہے کہ مرد محبوب سے جب شوہر بنتا ہے تو اس کی ذہنیت بدل جاتی ہے اور وہ تمام خوبیاں جو کہ محبوبہ میں ہوتی ہیں بیوی بننے کے بعد وہ خامیاں بن جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں شوہروں کی چند اقسام ملاحظہ فرمائیں۔

چالو شوہر: شوہروں کی یہ قسم نہایت ہی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہ مسلسل اپنے اِن کارناموں کو بیان کرتے رہتے ہیں جو کہ اصل میں کارنامے ہوتے ہی نہیں ہیں اور اپنی دِن بھر کی مصروفیات کو اِس کی تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس لیے اِن کا یہ دیرینہ مقصد پورا ہو جاتا ہے کہ بیوی کو نہ تو بولنے کا موقع ملے گا اور نہ ہی وہ اپنی کسی تکلیف یا ضرورت کا بتا سکے گی۔

چغل خور شوہر: یہ شوہروں کی نہایت ہی خطرناک قسم ہے۔ یہ اپنی ماں اور بہن کو ہر وہ بات بتا دیتے ہیں جو کہ بیوی نے اِن کے خلاف کی ہو جبکہ ماں اور بہن کی کوئی بات بیوی کو نہیں بتاتے ہیں اور یوں بیوی بالکل "بے یار و مددگار" ہو جاتی ہے۔

حاسد شوہر: اِس قسم کے شوہر دیکھنے ہی میں خوفناک نظر آتے ہیں کیونکہ یہ اپنے سسرال والوں کو کبھی بھی خوشحال نہیں دیکھ سکتے ہیں اور گاہے بگاہے بیوی سے لڑ کر اس کو میکے بھیج دیتا ہے اور پھر بیوی کو واپس لانے پر اپنی پسند کی چیزیں اور پیسے بٹورتا ہے۔

سڑیل شوہر: اِس قسم کے شوہر کو بیوی کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا ہے اور ہر وقت غصہ اِس کے ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کھانے میں ذرا نمک مرچ کم تیز ہونے پر کھانا پھینک کر چلا جاتا ہے اور باہر ہوٹلوں کے کھانے کے مزے اُڑاتا ہے۔

بہانے باز شوہر: سینما میں فلمیں دیکھنے اور دوستوں کے ساتھ ہلا گلا کرنے کے بعد روزانہ جب دیر سے گھر آتا ہے تو ہر روز اِس کے پاس

عورتوں کی بدولت ہی ملک کے ٹی وی چینل چل رہے ہیں ورنہ انہیں کون دیکھتا ☾ غزل رانی

ایک نیا اور جاندار بہانہ ہوتا ہے اور اس کے ہر بہانے میں اس کے دوستوں کا تعاون حاصل ہوتا ہے اور بیوی "بے چاری" کو یہ بہانے ماننے ہی پڑتے ہیں۔

افسر شوہر: یہ سارا دن آفس میں ماتحتوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اپنے آپ کو گھر میں بھی افسر ہی سمجھتے ہیں اور ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ بیوی بھی اس کی ہر بات پر "یس سر، یس سر" کہتی رہے اور اس کی خوشنودی کے لیے ماتحتوں کی طرح خوشامد کرتی رہے۔

سر چڑھے شوہر: اس قسم کے شوہر نہ صرف بیوی کے سر چڑھے ہوتے ہیں بلکہ اپنے سسرال والوں کے بھی سر چڑھے ہوتے ہیں۔ سسرال میں جتنی بھی اس کی خاطر مدارت کی جائے مگر وہ اپنے آپ کو مریخ کی مخلوق سمجھتے ہوئے اکڑ کر بیٹھا رہتا ہے۔

خرچیلے شوہر: یہ اپنی تمام تنخواہ اپنی عیاشیوں میں خرچ کر دیتا ہے۔ بیوی وبچوں کی ضروریات کا اس کو خیال نہیں ہوتا ہے۔ اگر بیوی جاب کرتی ہے تو اس کی نظریں اس کی تنخواہ پر رہتی ہیں اور اس کی تنخواہ لے کر ہی اس کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔

آوارہ گرد شوہر: ایسے شوہر دفتر سے آنے کے بعد کبھی بھی گھر پر نہیں رہتے بلکہ وہ شادی سے پہلی والی تمام عادات اپنا لیتے ہیں کہ دفتر سے سیدھے گرلز کالج کے سامنے ڈیوٹی دیتے ہیں اور پھر بازاروں اور مارکیٹ میں لڑکیوں کو تاڑتے ہوئے اور کہنی مارتے ہوئے اپنا تمام وقت اسی قسم کی آوارہ گردی میں گزار دیتے ہیں۔

نخریلے شوہر: یہ شوہروں کی بڑی پائیدار قسم ہے۔ یہ ہر علاقے میں بڑی وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ نخریلا شوہر بیوی کی بات ماننے کے لیے سو نخرے دکھاتا ہے۔

ملنسار شوہر: یہ اس قدر ملنسار ہوتے ہیں کہ گھر کی بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں ہر وقت اس کے نکمے دوستوں کا ہجوم رہتا ہے اور ہر وقت تاش کی بازی اور چائے کا دور چلتا رہتا ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو مگر یہ اپنے دوستوں کو چائے پلائے بغیر جانے نہیں دیتے۔

13/14

خاموش گھنا شوہر: یہ اتنا معصوم ہوتا ہے کہ بیوی کے چیخنے چلانے یا بات کا جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے اور اپنے آپ کو اخبار پڑھنے میں غرق رکھتا ہے۔ مگر دل ہی دل میں بیوی کو اس طریقے سے تنگ کر کے خوش ہوتا ہے۔

چالاک شوہر: یہ شوہروں کی نمایاں ہی خوفناک قسم ہے یہ اپنی آمدنی اور اپنے ہر نئے پرانے عشق کی ہوا تک بیوی کو نہیں لگنے دیتے ہیں اور تو اور گھر میں نوکرانی اور پڑوسن سے بیک وقت عشق بگھارتا ہے اور بیوی کا بھی وفادار شوہر بنا رہتا ہے۔

کاہل شوہر: اس قسم کا شوہر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بیوی کی کمائی پر پلتا رہتا ہے اور گھر پر رہ کر روٹیاں اور چارپائیاں توڑتا رہتا ہے اور ان دو چیزوں کے توڑنے کے سوا وہ کچھ اور توڑ ہی نہیں سکتا ہے۔ اس قسم کے شوہر پر یہ محاورہ بالکل صادق آتا ہے "کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔"

دیوانے متوالے شوہر: یہ شوہر دیکھنے میں بیوی کا بہت دیوانہ ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی تعریف کر کے اور اس سے کھانوں کی فرمائش کر کے اس کو کچن میں مصروف رکھتا ہے اور خود مزے سے بیٹھ کر ڈش کے تمام چینلز سے اپنی آنکھیں سیراب کرتا ہے۔

منہ پھٹ شوہر: یہ شوہر اتنا منہ پھٹ ہوتا ہے کہ سسرال والوں کی کوئی چیز اچھی نہ لگے۔ فوراً ہر بات میں کئی خامیاں نکالتا ہے اور تو اور سالی بے چاری کے متوقع سسرال والوں کے سامنے سالی وساس کی خوب خوب برائی کرتا ہے۔ اس کی بلا سے رشتہ ہو یا نہ ہو اس کو پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

خوشامد شوہر: اس قسم کے شوہر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بیوی کو بہلاتے رہتے ہیں اور اپنے گھر والوں کی خدمت اس سے کرواتے رہتے ہیں۔ اپنی خوشامد کی وجہ سے وہ بیوی کو حقائق سے دور رکھتے ہیں اور سسرال میں یوں اس کا سب سے بڑا دشمن اس کا سرتاج ہوتا ہے۔

فیشن زدہ شوہر: اس قسم کا شوہر آپ کو ہمیشہ ٹپ ٹاپ میں نظر آئے گا۔ دس بچوں کا باپ ہونے کے باوجود وہ لڑکا بننے کی کوشش میں رہتا ہے۔ اس کے سفید بال ہمیشہ کالے نظر آئیں گے اور شیو انتہائی رگڑ رگڑ کر کرتا ہے کہ اوپر والی جلد اتر کر دوسری نظر آنے لگتی ہے۔ یہ روزانہ ایک پرفیوم کی بوتل اپنے کپڑوں پر خالی کر کے گھر سے باہر جاتا ہے۔ ☆☆

کراچی ✿ ڈرائیور عبدالرؤف

کراچی دیکھنے کی خواہش بھی تھی پھر ڈیوٹی بھی وہاں لگ گئی اس طرح کراچی دیکھنے کی خواہش پوری ہوگئی۔ حیدرآباد سے بذریعہ ٹرین سفر کیا راستے میں نیند آ گئی تو برتھ پر چڑھ کر سو گیا۔ نا جانے کب گاڑی کراچی پہنچی مجھے تو اس وقت پتہ چلا جب سوئپر نے جھاڑو مار کر جگایا کہ صفائی کرنی ہے۔ وہ ایک سوئپر تھا میں اس کی بات کیسے مان لیتا۔ میں نے اُسے آنکھیں دکھائیں اور پھر لمبی تان کر سو گیا پھر تھوڑی دیر بعد ایک پولیس مین نے ڈنڈا مار کر جگایا تو اُٹھنا ہی پڑا اس لیے اگر آپ کو اس طرح گاڑی کے اندر کوئی جھاڑو مار کر یا ڈنڈا مار کر جگائے تو سمجھ جائیں

کراچی آ گیا ہے۔

پلیٹ فارم سے اُتر کر پہلے رکشے والے سے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کا کرایہ پوچھا جو کہ اس نے تین سے ضرب دے کر بتایا لیکن میٹر سے دس روپے زیادہ پر بات پکی ہو گئی۔ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے میں بیس منٹ پیدل لگتے تھے جبکہ رکشے میں بیٹھے ہوئے پینتالیس منٹ ہو گئے تو مَیں نے عمارتوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ زیادہ ٹائم گزرنے کا راز اس وقت کھلا جب ہم تیسری دفعہ جناح ہسپتال کے سامنے سے گزرے مَیں نے رکشہ رُکوایا اور نیچے اُتر کر گیٹ پر موجود پولیس مین کو ڈرائیور کی چالاکی کی بابت بتایا تو پولیس والا بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے منزل پر پہنچا کر بغیر کرایہ لیے وہ اسے ساتھ لے گیا۔ آخر اس کے بھی بچے ہیں پھر کم تنخواہ اور کراچی جیسی جگہ ہزار سے کم پر تو پولیس کو شرم آتی ہے پیسے لیتے ہوئے بھی۔

کراچی قائد کا شہر ہے جگہ جگہ اس کے بورڈ آویزاں ہیں لیکن یہ نہیں پتہ کہ قائد کے شہر سے مراد قائداعظم محمد علی جناحؒ ہے یا قائد حزب اختلاف کیونکہ اتنی پذیرائی مقبرہ محمد علی جناحؒ اور جناح ہاؤس کو نہیں جتنی قائد حزب اختلاف کے فرمان کو ہے اس لیے آئے دن ہڑتالیں اور دنگا فساد ہوتا رہتا ہے۔

کبھی سنا کرتے تھے کہ یہ روشنیوں کا شہر جب مَیں یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ سب غلط ہے۔ یہ روشنیوں کا نہیں پتلونوں کا شہر ہے کیونکہ یہاں کے باسی جس مقدر کی ماری پتلون کو پہن لیتے ہیں چنیوٹ والے بِل کی طرح آپ لاکھ خطرناک قرار دے دیں اسے اُتارنا اپنی توہین سمجھتے ہیں پتلون خود ہی رنگ بدل بدل کر آخر کار پیچھے سے پھٹ جاتی ہے۔

اَب آپ کو چند علاقوں کی بابت بتاتے ہیں۔

''لیاری'': روڈ کے اُوپر کھڑے ہو کر حزدہ ہاکرز نے شور مچا رکھا تھا کہ لیاری اے لیاری اے مَیں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ لیاری کتنا دودھ دیتی ہے کیونکہ پنجاب میں لیاری ہمیشہ اس پالتو جانور کے علاوہ گدھی، گھوڑی کو بھی کہتے ہیں جو دودھ دیتا ہو تو دوست نے بتایا کہ لیاری جانور نہیں بلکہ ایک علاقہ ہے تو ذہن میں بات آ گئی کہ شائد پورا علاقہ ہی دودھ دیتا ہو۔

''صدر'': یہاں کوئی صدر وغیرہ نہیں رہتا بلکہ ایک بازار ہے یہاں پر آپ کو جوڑوں کے درد کے مریض دواء بیچتے ہوئے نظر آئیں گے اور جن کو اپنے باپ کا پتہ نہیں، اولاد کی خوشنودی صرف کیپسول میں بتائیں گے۔ گنجے، شیمپو اور گنجے پن کا علاج بتائیں گے اَب یہ پتہ نہیں کہ گنج ختم کرنے کا یا گنج پیدا کرنے کا۔ یہ تو علاج کے بعد پتہ چلے گا یہاں سے آپ کو ماموں کی بھیجی ہوئی پتلون کم قیمت پر مل جائے گی جبکہ ماموں آپ کو گورا قبرستان سے ملے گا اور ممانی ہاکس بے پر جبکہ باجی کے لفظ کے پیچھے چھپی کال گرل کسی بھی بجلی یا ٹیلی فون بوتھ کے پاس کھڑی ہر آتے جاتے سے ٹائم پوچھتے ہوئے مل جائے گی جبکہ ماچس پوچھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

''گلف مارکیٹ'': تین تلوار کے سائے میں زنانہ سامان کی خرید و فروخت کا عظیم مرکز ہے یہاں آپ کو عورت برائے نام لباس میں کپڑے خریدتے ہوئے نظر آئے گی یہاں جس عورت نے فل شلوار قمیص پہنا ہو تو یقین کر لیں وہ غیر مسلم، غیر ملکی ہو گی جو پاکستانی ڈریس کو شوق سے گلے لگاتی ہے جبکہ پاکستانی ان کے ہاف ڈریس میں ہو گی اَب آپ کی مرضی کہ اخبار پر فلمی اشتہارات کی طرح اپنی نظروں سے ہی ننگی جگہ پر مار کر مار لیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بھائی اپنی محبوبہ اور بہن اپنے محبوب کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھ کر مستقبل قریب کے خواب دیکھ سکتی ہیں اور تنہائی میں ملنے کی جگہ سلیکٹ کر سکتے ہیں۔ تین تلواریں شجاعت اور مردانگی کا نمونہ ہیں جبکہ علاقہ، باہر کے کسی غیر مذہب علاقے کا نمونہ ہے۔

''ہاکس بے'': اگر آپ پاکستان کے کسی بھی علاقے کے ہیں اور شرم لپیٹ کر رکھ چکے ہیں تو یہاں آ جائیں۔ ان شاءاللہ شرم سے مر جائیں گے اگر پھر بھی نہ مر سکیں تو یہاں چلو بھر پانی کی ضرورت نہیں کہ آپ ناک ڈبو کر مر سکیں، سمندر بہت وسیع ہے۔ آپ پورے ڈوب کر مر سکتے ہیں یہاں کے سوئمنگ پول میں شرم و حیاء تیرتی ہوئی نظر آئے گی اور سبز گھاس پر سن باتھ لیتے ہیں جس آدمی کو یہاں بھی شرم نہ آئے اس کے لیے ضروری نہیں کہ یہاں رہے یا امریکہ میں ایک ہی بات ہے۔

''کلفٹن'': ساحل سمندر کا ایک خوبصورت نام۔ جہاں پر سمندر کے حسن کی لہریں ماند پڑ جاتی ہیں جبکہ صنف نازک کی حسن کی لہریں کئی جوانوں کے دلوں سے ٹکراتی ہیں۔ جوان ان لہروں میں ڈوبنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی خطرناک حسینہ کے حسن کی موج انہیں لے ڈوبتی ہے۔ اسلامی تعلیم کو بھولنے والے یہاں پر اُونٹ کی سواری کر کے اللہ کے نزدیک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمندر میں آبی مخلوق مگر کلفٹن کی لہروں میں شہر کی حسین جل پریاں تیرتی نظر آتی ہیں۔ معاشرے کے حالات سے اقتصادی طور پر ذہنی طور پر اور دلی طور پر تنگ اور اللہ کی دی ہوئی زندگی سے تنگ حرام موت مرنے کے لیے یہاں تشریف لائیں۔ بڑے آدمی کے کفن کے ساتھ بچے کا کفن مفت حاصل کریں یہ رعائت

مخصوص مدت تک ہے۔

''کیماڑی'': یہاں سے ہم اپنے ملک کی خوبصورت اشیاء باہر کے ملکوں کو بذریعہ بحری جہاز بھیجتے ہیں جس کے بدلے انگلش گالیاں' بے حیائی اور ضمیر فروشی جیسے جذبات بذریعہ ڈش حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں اتنے بڑے بڑے بحری جہاز ہیں کہ ہزاروں افراد بیچ میں کھپ جائیں لیکن کسی کے دل میں سوئی دھرنے کی بھی جگہ نہیں کس کو کسی کا خیال نہیں۔

''جناح ٹرمینل'': ایئرپورٹ کا ایک حصہ ہے۔ مگر جہاز یہاں ایسی کھڑے ہوتے ہیں جیسے کمہاروں کے گھر گدھے۔ یہاں لوگ اتنے سفر کرنے والے نہیں ہوتے جتنے ایئر ہوسٹس کو دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ ہر اُترنے والے جہاز میں لاکھوں خامیاں نکالتا ہے جیسے اُنہیں خریدنا تھا حتیٰ کہ پائیلٹ کی ڈرائیونگ میں بھی خامیاں نکالتے اور پان تھوکتے رہتے ہیں۔

''نیشنل اسٹیڈیم'': یہاں پر کھیلوں کے مقابلے کے ساتھ ساتھ محبت کے بھی کھیل کھیلے جاتے ہیں جیسے کرکٹ میں ایک گیند پر گیارہ کھلاڑی کھیلتے ہیں اِسی طرح کئی کئی لڑکوں کے درمیان ایک لڑکی ہوتی ہے اور جیت ہمیشہ کار کی ہٹ لگانے والے کی ہوتی ہے۔

''سر سیّد ٹاؤن'': نسیم احمد صدیقی کی جائے پناہ۔ میں نے یہاں آنے کی کوشش کی مبلغ پانچ ہزار روپے جیب سے نکلوا لیے پھر آپ کا کیا خیال کہ ماجھو کا رائیٹر جو خود کو جیب کترا ظاہر کرتا ہے اس کی جیب کاٹی جائے تو چور کو مور والی بات ہے۔

''موسم'': اگر لوگ شلوار قمیص پہن کر آئس کریم کھا رہے ہوں تو گرمی کا موسم اگر کوٹ اور جیکٹ پہن کر آئس کریم کھا رہے ہوں تو یقیناً سردی ہوگی۔ زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں چھتریاں ہوں تو لازمی ٹیلی ویژن والوں نے بارش ہونے کی نوید سنائی ہوگی۔ ☆☆

پھننیر

پروفیسر محمد ظریف خان' کراچی

فیض احمد فیض کی عظمت میں کلام نہیں۔ بلاشبہ وہ گزشتہ صدی میں اُردو کے ایسے منفرد انقلابی شاعر تھے جنہوں نے شاعری کے روایتی اسلوب کو نام نہاد جدیدیت کی بھینٹ نہیں چڑھایا مگر فیض مرحوم نے کسی نظم یا غزل میں اپنے نام یا تخلص کے ہم قافیہ الفاظ استعمال کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ اِس بارے میں فیض کے ہمعصر مشہور رومانوی شاعر مجاز کا کہنا تھا فیض اپنے نام کے قوافی اس لیے استعمال نہیں کرتا کہ اِن میں بعض الفاظ بہت گندے ہیں جن میں سے ایک صنفِ نازک کو ہر ماہ ہوا کرتا ہے مگر اَب اِس کا کیا کیجیے کہ کچھ لوگوں کے نام کا قافیہ گندا تو نہیں البتہ زہریلا ضرور ہوتا ہے جو اِن کی صفات کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔

حضرت ''پھنیر'' بھی ایسے ہی بڑے حضرت ہیں کہ اگر ''پھ'' کو ''م'' سے بدل کر اُوپر ''پیش'' لگا دیا جائے تو اِن کا اصل نام بن جاتا ہے اور اَب اِسے اُن کے مقدر کی ستم گری ہی جانئے کہ حرف ''م'' کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ ''پھنیر'' سانپ کا پھن ہی لگتا ہے اور اگر ''م'' کا جوڑ (صرف اگلا سرا) یعنی ''مر'' بنایا جائے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی قدرتی طور پر پھنیر صاحب ایسی جسمانی ساخت اور انداز خرام کے حامل ہیں کہ بالکل ''اِسمِ بامسمیٰ'' ہیں۔ گردن تنی ہوئی اور چہرہ پشت کی جانب جھکا ہوا۔ بالکل سانپ کے پھن کی طرح۔ آنکھیں بالکل گول' چڑھی چڑھی اور ہمیشہ کھلی بلکہ پھٹی پھٹی۔ ٹانگیں کسی محرابی دروازہ کی مانند' جب آپ چلتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی مست ناگ لہراتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

حضرت پھنیر کو دیکھ کر' اِن کی باتیں سن کر اور اِن کے کرتوتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد اِس روایت پر یقین ہو جاتا ہے کہ سانپ ایک مخصوص عمر گزار کر اپنی جون بدل سکتا ہے۔ ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ مدت ایک صدی ہے جس کے بعد وہ جس رُوپ میں چاہے تبدیل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ عرصہ حیات پچاس برس ہوگا کہ موصوف کی موجودہ عمر بھی اتنی ہی ہے۔ مجھے تو اِن کا طرزِ عمل اور حرکات دیکھ کر کچھ کچھ یوں گمان ہوتا ہے کہ آنجناب اِس سانپ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے جنت میں جا کر حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو بہکایا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ سانپ کے قالب میں شیطان تھا۔ حضرت پھنیر بھی اِس حوالے سے ناگ اور شیطان کی مشترکہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ یعنی لوگوں کو بہکانا' ایک دوسرے کے خلاف برگشتگی پیدا کرانا اور پھر موقع پاتے ہی کسی ایک کو ڈس لینا اور بعدازاں دوسرے کا بھی کام تمام کر دینا یا کرا دینا۔

مگر شیطان اور پھنیر صاحب میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر نے اپنی اَنا پرستی اور تکبر کے زعم میں حضرت آدم سے اِنتقام لینے کی خاطر اِنہیں بہکایا جبکہ پھنیر صاحب کسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی روزی روٹی کی خاطر یہ ''فرض'' انجام دیتے ہیں۔ دراصل وہ جس ادارے سے وابستہ ہیں اس کے سربراہ نے اِن کی ''خصوصیات'' کو خوب سمجھ کر اور چھان پھٹک کے بعد اُنہیں ادارہ کے دیگر کارکنوں کی جاسوسی پر مامور کیا ہے۔ پھنیر صاحب بھی اِس ''حرام'' فعل کو ''حلال'' کرنے کے لیے ہر

وقت کمربستہ رہتے ہیں اور صاحب کے روبرو ایک ایک کی چار چار لگاتے ہیں۔ اُنہیں اِس خدمت کا صلہ اِس طرح ملا ہے کہ اِن کی تنخواہ اور مراعات ادارہ کے اِن ملازمین سے زیادہ ہیں جو ایم ایس سی اور ڈبل ایم اے ہیں جبکہ بھمبیر صاحب VIA بھٹنڈہ بی اے (تھرڈ کلاس) کئے ہوئے ہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ''سرکاری دورے'' Offical Tours اور ٹی اے/ڈی اے/موسن کی پہچان ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا' دوسری بار ڈسے جانے کے خواہشمند کو کوئی دوسرا سوراخ ڈھونڈنا چاہئے۔ خود کو مہمانِ خصوصی بنتے ہم نے ایک بار دیکھا تھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس تھی اَب ہم ہر روز بالوں میں کنگھا کر کے اور ٹائی لگا کر بیٹھنے لگے کہ ہے کوئی اندھا محتاج جو دے کئی کو دعوت نامہ' بلائے اِسے صدارت کے لیے' اپنے دوستوں سے بھی باتوں باتوں میں ہم نے بہت کہا کہ ''آج کل ہم خالی ہیں اور خدمت قوم کے لیے تن من دھن حاضر ہے' کوئی یونیورسٹی' کالج یا اسکول ہماری ذات وصفات سے اپنے جلسے کی رونق بڑھانا چاہے تو ہم بخوشی اِس کے لیے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالیں گے۔'' بارے ایک جگہ سے دعوت نامہ آیا۔ اسپوٹنگ اِنگلش اسکول گولیمار کے پرنسپل صاحب نے ہم سے استدعا کی کہ آپ ہمارے ہاں مہمانِ خصوصی بن کر آئیں (اور اسکول کو اپنی جیبِ خاص سے کم از کم پانچ سو روپے عطیہ کریں) تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔'' ہم نے کہا۔ ''ہم ہیں تو بہت مصروف لیکن آپ کی خاطر آ جائیں گے اور پانچ سو روپے تو خیر زیادہ ہیں' دو سو روپے اسکول کو دیں گے تاکہ ہمارے ملک میں تعلیم کو ترقی حاصل ہو ہم ایسے نیک کاموں کی سرپرستی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟''

ایسا لگتا ہے اِن صاحبوں کو اِس سے زیادہ عطیہ دینے والا کوئی نہ ملا لہٰذا معاملہ پٹ گیا اور ہم نے اپنی شیروانی ڈرائی کلین ہونے کے لیے بھجوا دی۔

اسپوٹنگ اپنی جگہ اور اِنگلش اپنی جگہ لیکن نام کے اِس طمطراق کے باوجود تھا یہ ایک پرائمری اسکول اور ہم یہ سوچ کر کچھ آزردہ سے ہو گئے کہ یہی رفتار رہی' یعنی ہماری زندگی کے یہ دن پرائمری اسکولوں سے خطاب کرتے گزر گئے تو یونیورسٹی کنووکیشن سے خطاب کی نوبت کس عمر میں آئے گی۔ ابھی تو بہت مرحلے درمیان میں تھے۔ لوئر سیکنڈری اسکول' ہائر سیکنڈری اسکول' اِنٹر کالج' ڈگری کالج اور نہ جانے کیا کیا۔ خیر پچاس اسکول والوں کو ایڈوانس دے کر ہم نے بات پکی کی اور کہا۔ ''گولیمار تو بڑی پیچیدہ سی جگہ ہے' کوئی لینے آئے گا ہمیں؟'' جواب ملا۔ ''لینے تو کوئی نہیں آئے گا' آپ دو نمبر کی بس میں پاپوش نگر سے بیٹھیے اور گولی مار ۳ نمبر پر اُتریئے سامنے جس گلی کے نکڑ پر آپ کو ''اَپ ٹو ڈیٹ ہیئر کٹنگ سیلون' بے ضرر ختنہ کا بہترین مرکز'' کا بورڈ نظر آئے اِس میں سے نکل کر بائیں ہاتھ چوتھا موڑ آپ مڑیں گے تو آپ کو شامیانہ تنا ہوا ملے گا لیکن ساڑھے نو بجے آپ کا پہنچ جانا ضروری ہے کیونکہ گیارہ بجے خیموں اور کرسیوں والے اپنا سامان لینے آ جائیں گے' ہم نے کرایہ گیارہ بجے تک کا دیا ہے' اِس کے بعد یہ چیزیں ایک شادی والے کے گھر چلی جائیں گی۔''

ہم نے کہا۔ ''مضائقہ نہیں ہم بھی اِن کے ساتھ ساتھ شادی والے گھر چلے جائیں گے' آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔''

ملا نصیر الدین کو لوگوں نے دیکھا کہ ریگستان میں جابجا کھدائی کرتے پریشان پھر رہے ہیں' ایک صاحب نے ماجرا پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک جگہ اُنہوں نے کچھ روپے داب دیئے تھے اور نشانی یہ رکھی تھی کہ اُس وقت اِس جگہ کے عین اُوپر اَبر کا ایک ٹکڑا تھا جو اَب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شادیوں' بیاہوں' قوالیوں' مشاعروں' برسیوں' جشنوں اور تقریری مقابلوں کی ریل پیل کے دِنوں میں خیمے چھولداری کی نشانی سے کسی جگہ کو پانا کچھ ایسی بات تھی لیکن خیر' ہم اَپ ٹو ڈیٹ ہیئر کٹنگ سیلون کی گلی میں مڑ کر جائیں ہاتھ دیکھنے لگے حتیٰ کہ دُور ایک شامیانہ نظر آیا وہاں جا کر دیکھا کہ دریوں پر کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف کرسیوں پر کچھ بزرگ بیٹھے ہیں جو اِن کے والدین ہوں گے لیکن ہمارے میزبان صاحبان کا کہیں پتہ نہیں' خیر ہم بھی ایک طرف بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ آ گئے اور اَب ایک صاحب نے آ کر مؤدبانہ ہم سے پوچھا کہ ''آپ لڑکے والوں کی طرف سے ہیں نا؟ باقی بارات کہاں ہے؟'' ہم نے کہا۔ ''مذاق بند کرو' ہمیں یہاں تقریر کر کے اور بھی کئی جگہ صدارتیں کرنی ہیں' بس اَب کارروائی شروع ہو' کہاں ہے کرسیٔ صدارت؟'' تھوڑی سی مزید اور قدرے تکلیف دہ گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ ہمیں اِس سے اگلی گلی میں جانا چاہیے تھا وہاں ہم خوب وقت پر پہنچے اعلان ہو رہا تھا کہ ''آج کل اچھے اچھے لوگ غیر ذمہ داری برتتے ہیں' وعدہ کر کے تشریف نہیں لاتے' ہمارے آج کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے۔ خیر اَب میں بی ڈی ممبر جناب تاج الدین تاج سے درخواست کرتا ہوں کہ اُن کی جگہ۔۔۔''

لیکن ہم نے بےنفسِ نفیس نمودار ہو کر تاج صاحب کی صدارت میں اسی طرح کھنڈت ڈال دی جس طرح ہماری فلموں میں کوئی بزرگ عین نکاح کے وقت پہنچ کر ساری کارروائی روک دیتے ہیں۔ ''ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

مذہب کے نام پر جان قربان کرنے والے کاش! مذہب پر عمل بھی کرتے ☺ مجاہد ادیب شیخ

اس کے بعد جو کارروائی ہوئی اس میں سے ہمیں فقط اتنا یاد ہے کہ عبدالعزیز جماعت اوّل نے ہمیں ہار پہنایا۔ دوسری جماعت کے بچوں نے انگریزی میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ جماعت سوئم کی ایک بچی نے ایک فصیح و بلیغ تقریر پڑھی۔ جو اس کے والدین کی لیاقت، وسعت مطالعہ اور زبان پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت تھی۔ اس کے بعد چوتھی جماعت کے ایک طالب علم نے "ہم مرد مجاہد ہیں" کا ترانہ گاتے ہوئے جوش میں آکر اپنی تلوار سے ہم پر وار کیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ایسے موقعے پر تلواریں گتے کی استعمال کی جاتی ہیں۔ ازاں بعد ہم نے کھنکار کر اپنا صدارتی خطبہ شروع کیا ہی تھا۔ "خواتین و حضرات اور پیارے بچو---" کہ پیچھے سے ایک صاحب نے آ کے ہمارے نیچے سے کرسی کھینچ لی اور کہا۔ "حضور! گیارہ بج گئے، اب یہ سامان کہیں اور لے جانا ہے۔" ظالموں نے ہمیں حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کی بھی مہلت نہ دی۔ خیر اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ اس وقت حاضرین تھے کہاں کیونکہ انہوں نے شامیانے کے کھونٹے اُکھڑتے دیکھ لیے تھے۔

(ابن انشاء کی کتاب "خمار گندم" سے انتخاب)

☆☆

ایک صُبح

محمد اشفاق ایاز، جلال پور جٹاں

میاں لچھن اپنے حجرہ نما کمرے میں دفتر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ کمرہ ڈرائنگ روم بھی تھا اور میاں لچھن کے سونے کا کمرا بھی یہی ان کا سٹڈی روم تھا اور یہی پناہ گاہ بھی۔ اس کی گنجائش اڑھائی چارپائیوں سے زیادہ نہ تھی تاہم بیگم لچھن کے فتنوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس میں صرف ایک چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی کے سرہانے بیگم لچھن کے جہیز کی آخری نشانی ڈریسنگ ٹیبل رکھا تھا۔ جس کا رنگ مدتوں سے اُڑ چکا تھا۔ اس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ شیشے کا بڑا ٹکڑا ابھی تک ذرا سا ٹیڑھا ہو کر اٹکا ہوا تھا۔ باقی حصے زمانے کی دست برد سے نابود ہو چکے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے دوسری طرف دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کرسی کا بازو اور دوسری کرسی کی سیٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔ کرسی اور چارپائی کے بیچ ایک چھوٹا سا میز بھی تھا جس کی بدصورتی کو اخبار کے رنگین صفحوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ اندر ڈیوڑھی میں کھلتا تھا جبکہ باہر گلی میں اس کی کھڑکی کھلتی تھی۔ اس کھڑکی کے ذریعے میاں لچھن ہر گزرنے والی پر نظر رکھا کرتے تھے اور بیگم سمجھتیں شاید کمرا بند کیے مطالعہ فرما رہے ہیں۔

میاں لچھن صحن کے ایک کونے میں اوپن ایئر غسلخانے سے نہا کر تولیے سے بدن پونچھتے کمرے میں داخل ہوئے۔ شکستہ آئینے میں ایک نظر ڈالی بالوں پر تولیہ رگڑا اور کپڑے پہنے لگے۔ پھر انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے سامان آرائش پر نظر ڈالی۔ ڈیٹول کی شیشی میں سرسوں کا تیل ختم ہونے کو تھا۔ کنگھی کے دندانے منہ کے دانتوں سے بھی کم ہو چکے تھے۔ دس روپے والے ٹالکم پاؤڈر کا ڈبہ میاں لچھن کی اکلوتی نشانی باؤ کچھن کی دسترس میں بھی ہونے کی وجہ سے آخری دھول اُڑا رہا تھا۔

کپڑے پہن کر انہوں نے پاؤڈر کا ڈبہ اُٹھایا اور ہاتھ پر چھڑکا تاکہ گردن پر پھیلا سکیں۔ خوشبو کے ساتھ پاؤڈر کی خاک کے کچھ ذرے جونہی میاں لچھن کی ناک میں داخل ہوئے اُنہیں زوردار چھینک کی تحریک پیدا ہوئی اُنہوں نے بے اختیار پاؤڈر والا ہاتھ منہ پر رکھا۔ ناک نے پاؤڈر کی مزید مقدار قریب محسوس کی تو زوردار چھینک آ ہی گئی۔ چھینک کیا تھی ایک دھماکہ تھا اور پاؤڈر اُڑ کر چہرے بالوں اور کپڑوں پر یوں پھیل گیا۔ جیسے ایٹمی دھماکے کے بعد چاغی کا کالا پہاڑ سفید راکھ سے اَٹ گیا تھا۔ اُنہوں نے گردن ٹیڑھی کر کے آئینے کے بچے کھچے ٹکڑے میں چہرے پر نظر دوڑائی۔ بالکل یوں لگ رہے تھے جیسے کوئی ہیجڑا ودھائی لینے جانے کی تیاریوں میں منہ کو غازے کی موٹی تہہ میں چھپا لیتا ہے۔ کپڑے بھی غارت ہو چکے تھے۔ بالوں پر پاؤڈر کی تہہ یوں چپک گئی جیسے بلیک بورڈ پر چاک سے لکیریں کھینچی گئی ہوں۔ میاں لچھن نے آئینے سے نظر ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ بیگم نے نہیں دیکھ لیا ورنہ وہ یہی سمجھتی شاید عورت اندر آ گئی ہے۔ میاں لچھن نے تولیے سے منہ سر اور کپڑے صاف کیے تیل کی شیشی اُٹھا کر ہتھیلی پر تیل اُنڈیلنے لگے تو بوتل میں کوئی چیز اٹک گئی۔ اُنہوں نے چھنگلی اندر گھسیڑ کر راستہ صاف کرنے کی کوشش کی تو پریشر سے تیل کی پھوار نکلی اور اُن کی آنکھوں پر پڑی۔ میاں لچھن نے آنکھیں بھینچ لیں اور ہاتھ نیچے کر کے شیشی کو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے کی کوشش کی مگر وہ پھسل کر نیچے جا گری۔ اُنہوں نے تولیے سے آنکھیں صاف کر کے نیچے نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر ہوش اُڑ گئے کہ بوتل ٹوٹ چکی ہے اور تیل کے چھینٹے اُن کی شلوار کے پائینچوں کو اوپر تک بمع جوتوں کے داغدار کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے تیسری مرتبہ آئینے میں دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ گیلے تولیے سے آنکھیں پونچھتے وقت وہ یہ بھول گئے تھے قبل ازیں وہ سرمے کی چار چار سلائیاں آنکھوں میں پھیر چکے ہیں۔ آنکھوں پر تولیہ ملنے سے آنکھوں کے کاجل

کی سیاہی پورے چہرے پر پھیل چکی تھی۔ اُنہوں نے ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ والی الماری سے نیا اُستری شدہ سوٹ نکالا اور دوبارہ نہانے کے لیے اوپن ایئر غسلخانے کا رُخ کیا۔ تولیہ بغل میں داب' نظریں آئینے میں جمائے جونہی وہ دروازے کی طرف لپکے عین اِسی وقت بیگم ایک ہاتھ میں چائے کا پیالہ اور دوسرے میں پاپے پکڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اُنہوں نے میاں پچھن کے چہرے پر نظر دوڑائی تو کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ اُن کے منہ سے صرف یہ نکلا۔

''ہائیں! یہ آپ نے نہا دھو کر کس کے ساتھ منہ کالا کیا؟''

میاں پچھن بے دھیانی میں باہر نکلے اور دروازے میں کھڑی بیگم سے ٹکرا گئے۔ چائے کا پیالہ بیگم کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ بیگم نے گرم چائے سے بچنے کے لیے قدم اُٹھائے تو ایک پیر میاں پچھن کے پاؤں پر آن پڑا۔ میاں پچھن نے ڈکراتے ہوئے بیگم کو دھکا دے کر اپنا پیر آزاد کرایا۔ بیگم پچھن اِس غیر متوقع دوسرے حملے سے بوکھلا کر نیچے گر پڑیں۔ جہاں پیالے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اُن کے پہلو اور بازو میں دھنس گئے۔ بازو تو بُری طرح زخمی ہو کر لہو سے تر ہو گیا۔ لہو کو دیکھ کر بیگم پچھن بھینس کی طرح ڈکرانے لگیں۔ میاں پچھن تولیہ بغل میں دابے اپنا پاؤں سہلا رہے تھے۔ باپ کو کالے منہ کے ساتھ سراسیمہ کھڑا دیکھ کر اور اماں کو نیچے لہو سے رنگین بازو کو سہلاتے دیکھ کر کچھن سمجھا شاید زوردار لڑائی ہوئی ہے۔ باؤ کچھن نے غصے سے اپنے اَبا کی طرف دیکھا اور ہاتھ بلند کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ میاں پچھن چلائے۔

''مَیں نے نہیں مارا۔'' اور پیچھے ہٹے۔

''مَیں تو قمیص دُرست کرنے لگا ہوں۔'' باؤ کچھن جواباً چیخا اور اپنی اکلوتی اماں کو زمین سے اُٹھانے کے لیے جھکا بھاری بھرکم ہونے کے باوجود اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور میاں پچھن کے پلنگ پر بٹھا دیا۔ بازو سے بہتے ہوئے خون کے چند قطرے بستر کی چادر پر گرے۔ میاں پچھن نے مہینوں سے اَن دُھلے بستر کی حالت دیکھی تو منہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید وہ شکر کر رہے تھے کہ شاید اِسی بہانے اَب کے بستر دُھل جائے۔ بیگم پچھن ابھی تک چلائے جا رہی تھی ''ہائے مار دیا' ظالم مار دیا۔'' میاں پچھن نے ایک دفعہ پھر کمرے سے نکلنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ دیکھا ڈیوڑھی میں ہمسائیاں کھڑی بڑے اِنہماک سے منظر دیکھ رہی ہیں اور اپنے دوپٹے سے اپنی ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں۔ میاں پچھن کو دیکھتے ہی وہ جلدی سے باہر نکل گئیں۔

میاں پچھن اوپن ایئر غسلخانے میں پہنچے۔ یہ غسلخانہ صرف چھت کے لحاظ سے اوپن ایئر تھا ورنہ اِس کی پونے چار دیواریں برائے پردہ ضروریہ قائم و دائم تھیں اور ایک ٹوٹا چار جگہ پر پھٹا ٹمادروازہ برائے روک ٹوک مداخلت بیرونی بمع کنڈی آہن موجود تھا۔

باؤ کچھن نے اماں جان کا بازو اُٹھا کر دیکھا اپنے رومال سے لہو صاف کیا پھر دوسرے کمرے سے ڈیٹول کی شیشی اُٹھا لایا۔ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے روئی نکال کر اِس کا پھاہا ڈیٹول میں بھگو کر زخموں پر لگایا تو بیگم پچھن یوں چیخیں شاید بھینس ذبح ہو رہی ہو۔ اُنہوں نے اپنا بازو اِس زور سے چھڑانے کی کوشش کی کہ ڈیٹول والا پھاہا باؤ کچھن کے کھلے منہ میں چلا گیا۔ باؤ کچھن تھو تھو کرتے پیچھے ہٹ گئے۔ اِس وقت میاں پچھن دوبارہ نہا کر کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ باؤ کچھن بھاگ کر غسلخانے میں گئے اور پانی سے غرارے کرنے لگے۔

بیگم پچھن کی نظر جب اپنے جگ جگ جیو میاں پر پڑی تو لگیں کوسنے دینے۔ میاں پچھن نے سامنے کلاک پر نظر دوڑائی۔ دفتر کی بس آنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ اُنہوں نے قمیص پہنی اور شلوار اُٹھائی تو معلوم ہوا کہ ازار بند تو ڈالا ہی نہیں گیا اور اکلوتا ازار بند اِس گندی شلوار میں تھا جو میاں پچھن نے پہن رکھی تھی۔ اگر ازار بند نکالتے تو برہنہ ہو جاتے۔ بیگم پچھن اِس تکلیف میں بھی ہوش میں تھیں۔ ایک دفعہ پھر چلائیں۔ ''موئے غسلخانے میں چلا جا۔'' میاں پچھن نے شلوار اور ازار سلائی جو آدھی احتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ٹوٹ چکی تھی' اُٹھائی اور غسلخانے میں چلے گئے۔ ابھی اُنہوں نے شلوار اُتاری ہی تھی کہ باؤ کچھن چیخے۔ ''اَبا' اَبا!'' میاں پچھن بے دھیانی میں یہ بھول چکے تھے کہ اندر باؤ کچھن غرارے فرما رہے ہیں۔ اُنہوں نے غصے میں باؤ کچھن کو لات رسید کی اور اُسے غسلخانے سے باہر نکال دیا۔ نئی سلوار میں ازار بند ڈالا' بغیر پالش جوتا پہنا گیلے بالوں میں سوکھا کنگھا پھیرا اور بیگم کو روتا چھوڑ کر بغیر ناشتہ کیے دفتر چلے گئے۔ جہاں مزید بدحواسیاں اُن کا اِنتظار کر رہی تھیں۔

☆☆

دانت شکن

سیّد ابرار بخاری' گوجرانوالہ

پتیل کی طرح چمکتی ہوئی چندیا' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' بلیک اینڈ وائٹ داڑھی جس کو اُنہوں نے چوتھائی اِنچ سے زیادہ بڑھنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ رعشے سے کانپتے ہاتھ' پیلے پیلے دانت جو چہرے کی سیاہی کی بدولت سچے موتیوں کی مانند کرتے ہیں۔ دھان پان سا جسم'

آنکھوں کے گڑھوں کو چھپانے اور نظر کو مزید "نظر" لگنے سے بچانے کے لیے آخری نمبر کی عینک لگائے ہوئے' عینک کی کمانیاں عرصہ ہوا ان کی کمان سے نکل کر آنجہانی ہو چکی ہیں اور اب عینک کو اپنی کمان میں رکھنے کے لیے انہوں نے دونوں طرف لگا میں ڈال رکھی ہیں' اگر اب بھی ان کا کوئی واضح تصور آپ کے ذہن کے چوکھٹے پر واضح نہ ہوا ہو' تو چند لمحوں کے لیے "گاندھی جی" کی صورت ذہن کی سکرین پر اُبھار یئے۔ جناب یہ ایک مختصر خاکہ ہے ہمارے شہر کے مشہور و معروف فٹ پاتھی ڈینٹسٹ جناب محترم اے ڈی خاں صاحب کا۔

موصوف نے انتہائی صلح کل' مرنجاں مرنج اور قناعت پسند طبیعت پائی ہے۔ چپکے سے اپنی چوکی پر قدم جمائے اکڑوں بیٹھے آنے جانے والوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ بھی ان کی من موہنی صورتوں کو نہیں بلکہ ان کے جبڑوں میں جڑے دانتوں کو کہ یہ جو شخص خراماں خراماں گزر رہا ہے' اس کی اُن کے پاس یا کسی دوسرے ڈینٹسٹ کے پاس حاضری کتنے دنوں یا مہینوں کے بعد متوقع ہے' طبیعت میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قناعت و رضا' صبر و شکر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ اس کی زندہ مثال وہ عمر رسیدہ اور سالخوردہ بورڈ ہے جس پر اُنہوں نے اپنا نام' تجربہ اور عمر بمعہ ایک پری پیکر خاتون کے "رُخسار بریدہ" جبڑے کے' لکھا اور بنوار کھا ہے' آج سے تیس برس پہلے جب اُنہوں نے گھر میں بیکار پڑے زنبور سے اپنی بیکاری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا تھا' تو اس وقت اپنی عمر اور تجربہ بالترتیب' تیئس اور بیس سال لکھوایا تھا اور آج تیس سال ہونے کو آئے اُنہوں نے دونوں میں ایک سال کا اضافہ تک کرنا گوارہ نہیں کیا کیونکہ بقول اُن کے وہ اس قول پر دھڑلے سے عمل پیرا ہیں کہ "مرد کی زبان ایک ہوتی ہے۔"

اپنے سامنے ایک قطار میں اُنہوں نے آٹھ دس جام اور چینی کی بوتلوں میں روئی بھر کر اس کے اُوپر اصلی چاندی اور نقلی سونے کے دانت بطور ڈیکوریشن پیس سجا رکھے ہیں۔ ان کے ساتھ آٹھ دس چھوٹی بڑی شیشیوں میں لال اور نیلی' پیلی دوائیاں بھر کر اپنے سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ فزیشن ہونے کا بھی ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں اور اپنے سامنے کپڑے پر انواع و اقسام کے ہتھیار بھی ایک ترتیب میں لگا رکھے ہیں۔ یہ اُنہوں نے ایک انگریزی ڈینٹسٹ کے ہونہار بیٹے سے اونے پونے داموں حاصل کیے تھے۔ وہ ڈینٹسٹ بیچارا تو دانت نکالتا نکالتا اس دُنیا سے نکل گیا اور بیٹا ایسا ناہنجار اور گدھا نکلا کہ باپ جن کے "زور" اور بل بوتے پر اُسے اور دوسرے اہلِ خانہ کو کھلاتا پلاتا رہا تھا' وہ اُنہیں باپ کے مرنے کے بعد جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا۔ اچھا ہمیں یا

اے ڈی خاں صاحب کو اس سے کیا لینا دینا۔ یہ تمام اوزار ہاتھی کے دکھانے کے دانتوں کی طرح صرف دکھانے کے لیے ہیں۔ کھانے کے یعنی کام کے وقت ہمارے اے ڈی صاحب اپنے تیس سالہ ہمسفر اور یارِ غار کو اپنے گھٹنوں تلے سے نکال کر مریض کے منہ میں فٹ کر دیتے ہیں اور پھر مریض کو کلمہ شریف پڑھنے کا کہہ کر خود بسم اللہ' اللہ اکبر کہہ کر دانت نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ مریض کو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دانت نہیں کوئی اور شے بذریعہ دہن نکل کر پرواز کر گئی ہے۔ ان کے نزدیک' امیر' غریب' بادشاہ و گدا سب ایک ہیں یعنی سب کے لیے زنبور ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ ان کا زنبور انسانیت کے درمیان بھائی چارے کی زندہ مثال ہے' واقعی اس بات میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اس "زنبوری" بھائی چارے اور مسیحائی کی بدولت ایک کی بیماری دوسرے کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور یوں بھائی چارے کو بھی فروغ ملتا رہتا ہے۔

اپنے ہاتھوں میں شفایابی اور مہارت کا ڈھونڈورا پیٹنے کے لیے اُنہوں نے ایک گھی کے خالی کنستر میں وہ تمام دانت جمع کر رکھے ہیں۔ جو اُنہوں نے اپنی طویل پریکٹس کے دوران زبردستی دوسروں کے جبڑوں کی ملکیت سے نکال کر اپنی تحویل میں لیے ہیں۔ ان میں سے بعض اتنے لمبے اور نوکیلے ہیں کہ اگر یہ واقعی کسی انسان کے ہیں تو بڑی حیرت کی بات لگتی ہے کہ ہالی ووڈ والے اصلی ڈریکولا کے ہوتے ہوئے نقلی ڈریکولا کو کیوں ہر فلم میں کاسٹ کرتے رہے' کچھ اتنے موٹے' چوڑے اور پلاک میں بلاک شدہ ہیں کہ مذبح خانے سے چرائے ہوئے لگتے ہیں۔ واللہ اعلم کہیں کوئی قصائی معاوضے میں ان کو آدھا کلو دانت دے گیا ہو کہ دونوں کا کام نکل آئے یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

اپنے اشتہاری بورڈ پر اُنہوں نے ایک فقرہ انتہائی جلی حروف میں لکھوا رکھا ہے کہ "یہاں دانت بغیر درد کے نکالے جاتے ہیں" یعنی دانت ہمارا درد تمہارا۔ بھلا ایک اوزار سے دو دو چیزیں تو نہیں نہ نکل سکتیں۔ ان کا یہ بھی فرمانا ہے کہ آج کل کے نئے ڈاکٹر جو دونوں چیزیں بیک وقت نکال باہر کرتے ہیں' وہ نا سمجھی میں مریض کی ایک اور چیز بھی نکال دیتے ہیں اور وہ ہے بلند ہمتی و بہادری کہ جس نے تکلیف کا ذائقہ ہی نہ چکھا ہو۔ اس کو بے خوفی' بہادری' جوانمردی کی لذت کا کیا احساس۔ اسی بات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اہلِ وطن میں مردانگی و بہادری بذریعہ زنبور بانٹ رہے ہیں۔ ہمارے اربابِ بست و کشاد سے دردمندانہ اپیل ہے کہ قوم کے ہر فرد کو ان کے یا ان کے ہم نام و ہم کام بھائی بندوں کے پاس زندگی میں ایک دفعہ ضرور حاضری دینے کا حکم جاری کیا جائے۔ تاکہ ان کی پیدا کی گئی بہادری کی بدولت کشمیر کو جلد از

جلد آزاد کروایا جا سکے۔

ہمارا تو خود ان ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں۔ چار قسم کے تو ایکسرے کرواتے ہیں۔ ہر طرف سے ٹھونک بجا کر فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ دانت نکالے بنا چارہ نہیں۔ پرسوں تشریف لائیے گا۔ اس چیک اَپ اور تشخیص میں ڈیڑھ دو ہفتے گزر جاتے ہیں۔ اکثر غیر تمند دانت تو مالک کے اِتنا مجل خراب ہونے پر خود بخود ہی شرمندہ ہو کر گر پڑتے ہیں اور مالک ہزار بارہ سو کے خرچے پر صدمے سے نڈھال ہو کر گر جاتا ہے اور پھر یہ ڈاکٹر منہ میں اِتنے اوزار فٹ کر کے منہ کو اِن کے ذریعے اِتنا کھولتا ہے کہ اِس کھینچا تانی کی بدولت منہ کو سابقہ منہ میں تبدیل ہونے میں بھی پانچ سات دن لگ جاتے ہیں لیکن اے ڈی خان صاحب کے پاس یہ سب جھمیلے نہیں بلکہ دانت نکلوانے کے بعد دونوں طرف کے زخسر اِتنا بھر جاتے ہیں کہ ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ بھئی' کمال ہے' چار دنوں میں تمہاری صحت تو بڑی تگڑی ہو گئی ہے۔ نہ ایکسروں کا جھنجھٹ نہ دوائیوں کی بھرمار۔ بس مریض نے دانت پر اُنگلی رکھ کر اس کی نشاندہی کی۔ اُنہوں نے اُنگلی اُٹھا کر زنبور رکھا۔ بعد ازاں زور لگایا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں زور لگانے کی وجہ سے اے ڈی خان صاحب کی آنکھیں بند ہوتی جاتی ہیں اور مریض کی آنکھیں کھلتی جاتیں ہیں۔ دانت نکل جانے کے بعد معاملہ اُلٹ ہو جاتا ہے' چونکہ ڈاکٹری پیشے میں بھول چوک ہوتی رہتی ہے' بڑے بڑے ناموں والے ڈاکٹر آپریشن کے دوران مریض کے پیٹ میں قینچیاں' تولیے تک بھول جاتے ہیں۔ اِن سے بھی کبھی کبھار بھول چوک سے غلط دانت نکل جاتا ہے' یا کبھی اپنی یا مریض کی غلطی سے (جب وہ جل مچھلی کی طرح تڑپتا ہے) زنبور اصلی دانت سے چنک کر نقلی دانت کا قلع قمع کھو دیتا ہے تو یہ ذرا نہیں گھبراتے' اگلی باری میں اصلی والا بھی نکال دیتے ہیں وہ بھی سابقہ فیس میں۔ مریض بھی فائدے میں رہتا ہے کہ وہ دانت جو اِس نے پانچ سال بعد اِن سے یا کسی اور سے نکلوانا ہوتا ہے اس کے پیسے بچا لیتا ہے۔

شہر میں بڑی بڑی دوکانوں اور لمبی چوڑی ڈگریاں رکھنے والے ڈینٹسٹ مکھیوں پر مکھیاں مارتے رہتے ہیں لیکن اِن کا کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے' اِسی جلاپے میں یہ ڈاکٹر آئے دن اخبارات میں بیان دیتے اور خبریں چھپواتے رہتے ہیں۔ جلسے جلوس نکالتے اور تقریریں کرتے ہیں کہ عطائیت پر پابندی لگاؤ۔ اِسی بات کا ذکر کسی نے اس عاجزی و انکساری کے پتلے سے کیا تو انکسار سے بولے۔

''بھائی' ہم مانتے ہیں کہ ہم عطائی ہیں اور یہ ڈاکٹر غیر عطائی۔''

پوچھنے والے نے وضاحت چاہی تو وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''چونکہ یہ علم ہمیں خدا سے براہِ راست عطا ہوا۔ اس لیے ہم عطائی ٹھہرے۔ جبکہ اِن ڈاکٹروں نے ''براہِ راست'' دوسرے ڈاکٹروں سے اِس علم کو حاصل کیا اِس لیے وہ غیر عطائی ٹھہرے۔ سوال کرنے والے نے چند لمحے جواب پر غور کیا اور پھر منہ کھول کر ایک دانت پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''اِس دانت کو نکال دیجئے' بھلا کہاں خدائی علم کہاں۔۔۔''

☆☆

روداد سفر

خادم حسین مجاہد' بھابڑا (سرگودھا)

وہ ہماری زندگی کا بدترین دن تھا جب موٹر سائیکل بھائی جان لے گئے اور ہمیں ایک ضروری کام سے کوٹ مومن بذریعہ بس جانا پڑ گیا' چونکہ بس کے سفر کا پہلے کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے عام حالات کی طرح سفر کی تیاری کی۔ نہا دھو کر سفید براق لباس پہنا اور اچھی طرح چمک دمک کر بیگ کندھے سے لٹکائے خراماں خراماں بس سٹینڈ کو روانہ ہوئے وہاں پہنچے تو ہمیں کوئی بس نظر نہ آئی لوگوں سے پوچھا تو اُنہوں نے چند ڈھانچوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں بس کہنا بھی بس کی تذلیل ہو گی اور یہ دیکھ کر تو ہماری جان ہی نکل گئی کہ ہمیں بھی اِنہیں ''کھڑلیوں'' جیسی بسوں میں سے ایک میں سفر کرنا پڑے گا۔ آخر ہم نے سوچا ہمت مرداں مدد خدا اور پھر چند آیتوں کا ورد کرتے ہوئے بس میں داخل ہو گئے۔ ویسے تو ہم ازلی سٹوڈنٹ ہیں مگر اصل سٹوڈنٹ کی خصوصیات ہم میں موجود نہ تھیں اور کنڈیکٹر نے یہ بات تاڑ لی کہ ہم صرف کاغذی شیر ہی ہیں بس پھر کیا تھا اُس نے ہمیں چھت پر چڑھنے کا حکم دیا تو ہم نے اُسے سمجھایا کہ آج تک ہم کبھی گھر کی چھت پر نہیں چڑھے کہ اُس سے غیر اخلاقی پہلو نکلتا ہے۔ آخر بڑی منت سماجت کے بعد اُس نے ایک کونے میں کھڑے ہونے کی اجازت دے دی' ہمارے لیے یہی غنیمت تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسافروں کی تعداد اور ہماری تشویش میں اضافہ ہوتا گیا کیونکہ بس اُوپر نیچے سے بھر چکی تھی اور ڈرائیور کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ سب مسافر اس ڈربے میں اس طرح فٹ کر دیئے گئے کہ ہلنا جلنا ناممکن تھا اور ایک کی سانسیں دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور ایسے وقت میں مسافر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو بآسانی گن سکتے تھے مختصراً بس کی حالت بقول دلاور فگار کچھ یوں تھی۔

بس میں لٹک رہا تھا کوئی ہار کی طرح
کوئی پڑا تھا سایہ دیوار کی طرح

سہما ہوا تھا کوئی گنہگار کی طرح
کوئی پھنسا تھا مرغ گرفتار کی طرح
محروم ہو گیا تھا کوئی ایک پاؤں سے
جوتا بدل گیا تھا کسی کی کھڑاؤں سے

خدا خدا کر کے ڈرائیور آیا پہلے تو اُس نے بس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سر ہلا کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیس پچیس آدمیوں نے مل کر بس کو دھکا لگایا تو یہ مردہ زندہ ہو گیا اور کچھوے کو شرمندہ کرنے والی رفتار سے رینگنے لگا۔ سب لوگوں نے آیتوں کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ اچانک ہمارے ساتھ کھڑے شخص کو کسی کی یاد آئی اور اُس نے سگریٹ سلگائی۔ اِس گھٹن میں سگریٹ کا دھواں جب پٹرول کی بو کے ساتھ ہمارے نتھنوں میں داخل ہوا تو ہمارے معدے نے بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں ہمیں ایک روزہ توڑ تے آئی جس نے سگریٹ والے صاحب سمیت آس پاس کے خواتین و حضرات کے کپڑوں پر حسین نقش و نگار بنا دیے۔ اِس پر طیش میں آ کر ایک صاحب نے ہمیں تھپڑ مار دیا۔ جواب میں ہم نے اُنہیں معاف کر دیا کیونکہ وہ ہم سے کافی طاقتور تھا کچھ مسافروں نے صرف لعنت ملامت پر اکتفا کیا مگر ایک بڑی بی نے ہمیں وہ وہ کوسنے دیے کہ آج بھی وہ سفر یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک خاص بات جو ہم نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ ڈرائیور صاحب عوام کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ اُنہیں اگر ایک میل دُور سے کوئی آدمی آتا دکھائی دے تو بس روک دیتے ہیں کہ کہیں وہ بیچارہ لیٹ ہی نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ قبرستان کے نزدیک بھی بس روکنا ضروری سمجھتے ہیں کیا پتہ کسی نے فاتحہ پڑھنا ہو یا کوئی مردہ قبرستان ٹرانسفر کرنا چاہتا ہو۔

تھوڑی دیر بعد کنڈیکٹر صاحب انتہائی حیرت انگیز طریقے سے پھنس کر کھڑے لوگوں میں سے راستہ بناتے نمودار ہوئے اور کرایہ وصول کرنے لگے اِس دوران اُنہوں نے جو بات بھی کی اس میں نوّے فیصد عنصر گالیوں کا تھا۔ کچھ دیر بعد بس ایک جگہ روک دی گئی کیونکہ کنڈیکٹر صاحب کو اطلاع ملی تھی کہ چند مسافر بس میں سوار ہونے کے لیے گھر سے چل پڑے ہیں لوگوں نے بہت غل مچایا مگر بے سود۔

کنڈیکٹر اَب یہ کہتا تھا وہ بس چلائے کیوں
جو بس میں آ گیا ہے کرے ہائے ہائے کیوں
جس کو ہو جان عزیز میری بس میں آئے کیوں
ایسے ہی گلبدن تھے تو پیسے بچائے کیوں
کہتا تھا کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں مَیں
کیوں ریگولر چلوں مہ و اختر نہیں ہوں مَیں

آخر آدھے گھنٹے بعد ہم کو بھی وہ سواریاں نظر آنے لگیں جو کنڈیکٹر کو آدھا گھنٹہ پہلے ہی نظر آ گئی تھیں ویسے بھی ہماری نظر ذرا کمزور ہے بہرحال اِن کے سوار ہونے کے بعد بس پھر چلی تو جونہی ہماری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے بٹیر سب اُڑ گئے کیونکہ وہاں قے کے نشانات کے علاوہ مٹی اِس قدر جم چکی تھی کہ کپڑوں کا رنگ تک تبدیل ہو گیا تھا یہ سب کچھ مفت تقسیم ہونے والے پاؤڈر کا نتیجہ تھا اسی دوران ایک بچے نے ہماری طرف دیکھ کر چیخ جو ماری تو ہم سوچ میں پڑ گئے آگے پیچھے ہو کر آئینے سے نظریں ملائیں جو کہ ڈرائیور کے سامنے لگا تھا تو خود ہماری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ ہمارے چاند سے مکھڑے اور بالوں پر مٹی اِس قدر جم چکی تھی کہ ہم خود اپنے آپ کے لیے نا قابلِ شناخت ہو چکے تھے۔ اِسی دوران عورتوں میں زبانی جنگ چھڑ گئی جو اِس گھٹن کے ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی اور جتنی دیر یہ جنگ جاری رہی وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور سینکڑوں قیمتی معلومات حاصل ہوئیں اچانک بس نے ایک اعصاب شکن ہچکولا کھایا اور کئی مسافر باہم دست و گریباں ہو گئے۔ لڑنے کے لیے نہیں صرف ہچکولے سے بچنے کے لیے۔ ہم بھی کسی صاحب کی گود میں گرے جہاں سے ہمیں نہایت آرام سے پھر کھڑا کر دیا گیا۔

کوئی پکارتا تھا میری جیب کٹ گئی
کہتا تھا کوئی میری نئی پینٹ پھٹ گئی
بس میں تمام پردوں کی دیوار ہٹ گئی
ریش سفید زلف سیاہ سے لپٹ گئی
ایک اچھا خاصا مرد زنانے میں گھس گیا
گویا کہ اِک چور خزانے میں گھس گیا

بس میں کھڑے کھڑے ہماری ٹانگیں اور ڈنڈے کو پکڑے پکڑے ہماری بانہیں جواب دے چکی تھیں اِس وقت ہم پر یہ حقیقت کھلی کہ بس میں بندہ بالکل بے بس ہوتا ہے۔ منزل کا ہنوز کچھ پتہ نہ تھا دُعائیں کر کر کے ہم تھک چکے تھے ویسے بھی اگر مسافروں کی دُعائیں قبول ہوتیں ہوں تو آج کوئی ڈرائیور کنڈیکٹر زندہ نہ ہوتا۔ بس دو دو منٹ بعد چار چار منٹ رُکتی تھی ایک مسافر اُتارتی تھی اور دو مسافر چڑھا لیتی تھی آخر خدا کو رحم آ ہی گیا اور نوید ملی کہ کوٹ مومن آ گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں بس کوٹ مومن پہنچ گئی ہے مگر اسے بس سٹینڈ پہنچتے پہنچتے بھی بیس پچیس منٹ لگ گئے اُتر کر جونہی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ نیچے سے نکل آیا۔ کوئی اُستاد صفائی دکھا گیا تھا۔ جلدی جلدی کام نمٹایا ایک دوست سے اُدھار

رقم لے کر پھر اسی بس میں واپسی کے لیے سوار ہوئے خوش قسمتی سے اس مرتبہ ہمیں سیٹ مل گئی ورنہ دل تو یہ کہتا تھا---

خادم جی' اٹھو فلائنگ کوچ کرو
اس بس میں گھر کو جانا کیا

پھر تقریباً ویسا ہی سفر کر کے شام ڈھلے بھابھڑا بس سٹینڈ پر بس پہنچی جونہی سیٹ سے اٹھے قیس کی فریاد سنائی دی جو کسی پتری میں پھنس کر ٹکڑے کرا بیٹھی تھی لہٰذا ہم دامن چاک سر میں خاک گھر روانہ ہوئے اپنے سپیئر پارٹس چیک کیے کہ وہ صحیح کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ مطمئن ہونے کے بعد رفتار تیز کر دی گھر پہنچے تو دروازہ چھوٹے بھائی نے کھولا رات کے اندھیرے میں جونہی اس کی نظر ہم پر پڑی چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ چیخ سنتے ہی گھر والے بھاگے بھاگے آئے۔ ہم نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے فوراً جیب سے شناختی کارڈ نکالا اور بتایا کہ ہم کون ہیں مگر گھر والوں کو تب تک یقین نہ آیا جب تک کہ ہم نے نہا دھو کر اس زبردستی کے میک اَپ کی تہیں اُتار نہیں دیں۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی شکرانے کے نفل پڑھے اور ایک دیگ پکوا کر آنجہانی مسافروں کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے' ڈرائیوروں کنڈیکٹروں میں تقسیم کرائی اور بس میں سفر کرنے سے بمع اہلِ و عیال توبہ کر لی۔

آخر میں ہم اربابِ اقتدار کو ایک تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں کہ سنگین جرائم کے مجرموں کو بجائے عمر قید یا پھانسی دینے کے اِن کے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے کم یا زیادہ بار ہمارے علاقے کی بسوں میں سفر کرایا جائے۔ اِن شاءاللہ اُمید افزاء نتائج نکلیں گے اور جرائم کا قلع قمع ہو جائے گا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اگر کبھی اِن کے دِل میں ہمیں مہمان نوازی کا شرف بخشنے کا خیال آئے تو ہمارے گاؤں آنے سے پہلے اِس مضمون کو ضرور پڑھ لیں۔ اُمید ہے کہ آپ کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے لیکن اگر بالفرض ایسا نہ ہوا اور آپ ہمارے بلائے جان بننے پر مصر ہوں تو سفر اپنی ذمہ داری پر کریں۔ ہم کسی توڑ پھوڑ اور نقصان کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

☆☆

بھو کی ڈائری

۞ محمد سعید خان

یکم مارچ: آج مَیں سخت پریشان ہوں' جی چاہ رہا ہے کہ گڈو کے اَبا کو ٹکریں ماروں۔ بات بھی تو کچھ ایسی ہی ہے' آج میری ساس آ رہی ہے۔ ہائے' اَب مَیں کیسے جگ جگ جیوں گی' وہ تو آتے ہی اُنہیں (گڈو کے اَبا کو) اپنے بس میں کر لے گی۔ جانے بڑھیا کو کیا سوجھی کہ میرے سر سوار ہونے آ رہی ہے--- میرے مالک! مجھے بچائیو۔ آج مَیں نے اپنے نام کا صدقہ دیا ہے اور یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ گھر کی کون سی جگہ مورچے کے لیے مناسب رہے گی۔

۲ مارچ: آج مَیں ذرا دیر سے سو کر اُٹھی تو گھر میں اِک بھونچال آ گیا۔ ساس نے چیخ چیخ کر میرے سندر سپنوں کے محل پر کوسنوں کے میزائل گرائے۔ جب میری آنکھ کھلی تو پہلی آواز یہی آئی کہ "ہائے ہائے غضب خدا کا' گیارہ بجنے کو آئے ہیں اور یہ نواب زادی ابھی تک پڑی "اینڈ" رہی ہے اے' مَیں پوچھتی ہوں کیا روز ہی ایسا کرتی ہے؟ ہائے' ہائے میری بچے کے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔"--- مَیں نے ہولے سے کہا کہ نصیب ہی نہیں کئی بار سر بھی پھوٹ چکا ہے اور پھر مَیں لحاف کے پھٹے ہوئے حصے سے روئی نکال کر کانوں میں رکھی اور گنگناتی ہوئی منہ ہاتھ دھونے غسل کھانے میں آ گئی۔ ہائے قسم ہے' روئی بھی کیا خوب نعمت ہے۔

۴ مارچ: ہائے' مَیں کے مصیبت میں پھنس گئی ہوں؟! اچھی زبردستی ہے کہ برتن بھی دھوؤں اور کھانا بھی پکاؤں۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب آخر میں گڈو کے اَبا کو یہ سب کام کس لیے سکھائے تھے اِس لیے تو نہیں کہ چولہا پھونک پھونک کر اور برتن دھو دھو کر اپنی بیوٹی کا ناس ماروں۔ آج جب ساتھ والی پڑوسن شاہدہ دیوار پر آئی تو مجھے کام کرتا دیکھ کر ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔ بولی۔ "کتنا آؤٹ آف ڈیٹ سا لگتا ہے نا' تمہارا یہ برتن دھونا"--- مَیں اُس سے کیا کہتی کیونکہ وہ تو خوب مزے میں ہے اِس لیے کہ اُس کی ساس زمین پر نہیں بلکہ زمین میں ہے۔

۶ مارچ: آج مَیں نے امی کو خط لکھا ہے' اُنہیں مَیں نے لکھ دیا ہے کہ "جل رہا ہے چمن اُٹھ رہا ہے دُھواں" بس آپ جلدی سے آ جائیں ورنہ "میری داستاں بھی نہ ہو گی داستانوں میں" مَیں نے سوچا ہے کہ ذرا بڑھیا کو مزا چکھا دوں۔ دیکھو امی کب تک آتی ہیں؟

۱۰ مارچ: صد شکر کہ آج میرے خط کا جواب آ گیا ہے۔ امی نے لکھا ہے کہ "لنگ آواں گی پتن چناں دا تو فکر نہ کر میری بچی! کیونکہ کچھ بھی ہو تیری ساس کا دلیہ کریں گے ہم"--- اُنہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ تو "سیڈ" نہ ہو میری لاڈو! مَیں آ کر تیری ساس کی ایسی تیسی پھیر دوں گی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے ایسی بلند حوصلہ ماں سے نوازا ہے۔ آج مَیں نے ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز میں "مَیں پھج بتاشے ونڈاں" والا گانا بھی لگایا۔

۱۷ مارچ: آج میری گڈو کے اَبا سے تو تو مَیں مَیں ہو گئی۔ ''تو تو'' وہ کرتے رہے اور ''مَیں مَیں'' مَیں کرتی رہی۔ پھر ''تو تو'' ''مَیں نے کی اور ''مَیں مَیں'' اُن کے حصے میں آئی۔ دراصل ''یہ'' بھی آج کل ماں کے آجانے سے بہت ''چوڑ'' ہو گئے ہیں۔ جو پر مَیں نے کاٹ پھینکے تھے وہ پھر سے نکل آئے ہیں۔ مجھے کام کرتا دیکھ کر معنی خیز انداز سے مسکراتے رہتے ہیں۔ خیر مسکرالیں جتنا مسکرانا ہے' کل تو امی آہی جائیں گی۔ پھر دیکھوں گی اُن کو اور اُن کی مسکراہٹ کو۔

۱۸ مارچ: ہائے' آج مَیں کتنی خوش ہوں۔ امی آچکی ہیں' ساتھ ہی میری بہن ریحانہ بھی آئی ہے۔ کتنا مزہ آئے گا جب امی اور میری ساس کے دیرینہ تجربات آپس میں ٹکرائیں گے۔ امی نے تو آتے ہی کہا تھا کہ---

اس محفل میں ہے کوئی ہم سا
ہم سا ہو تو سامنے آئے

جواب میں میری ساس بھی تنتناتی ہوئی کمرے سے نکلی' بعدازاں گڈو نے رو رو کر اور چلا چلا کر طبل جنگ بجایا۔ خوب گھمسان کا رن پڑا جس میں ایک دوسرے کے خاندانوں کے اہم راز منکشف کیے گئے۔ امی نے میری ساس کو پھاپھے کٹنی کے لقب سے نوازا جبکہ ساس صاحبہ نے امی کو سپک سوئی اور سترخصم کرنی کے الفاظ سے نوازا۔ ریحانہ نے ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میری ساس نے فوراً یہ کہہ کر اُسے چپ کرادیا کہ ''تو چپ کر ری چڑیل'' بہرحال آج میدان میری ساس کے ہاتھ رہا۔

۱۹ مارچ: آج میری ساس نے میری نند یعنی اپنی بیٹی کو خط لکھا جسے مَیں نے کمال مہارت سے اُڑا کر پڑھا' لکھا تھا---

''چلے بھی آؤ کہ پھڈے کا کاروبار چلے''

یہ بھی لکھا تھا کہ ''بہت دِنوں سے مجھے تیرا اِنتظار ہے آجا''---وہ خط میری ساس نے گڈو کے ہاتھ میں دیا تھا جسے مَیں نے چھین لینا چاہا مگر گڈو ضد پر آمادہ ہو گیا اور خط لے کر ہی دَم لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو خط پوسٹ نہ ہوتا۔

۲۵ مارچ: آج میری ساس کو نند کی صورت میں کمک پہنچ گئی۔ ہماری آس پاس کی دیواروں پر ایڈوانس بکنگ جاری رہی کیونکہ سب جانتے تھے کہ آج اِس جوہری جنگ کا فیصلہ کن دِن ہے۔ ریحانہ آج بہت پرجوش تھی۔ امی بھی بار بار ہٹلر کو یاد کر رہی تھیں' بعدازاں ریحانہ اور میری نند (فوزیہ) کے سامنے صف آرا ہو گئی اور امی نے ساس صاحبہ کے سامنے مورچہ سنبھال لیا۔ فریقین کے پوزیشن سنبھالتے ہی طعنوں' کوسنوں اور بہتانوں کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ پہلی باڑ امی نے ماری' جواب میں ساس نے پورا راؤنڈ لیا۔ ریحانہ نے فوزیہ کے اور فوزیہ نے ریحانہ کے سینکڑوں فرضی اور غیر فرضی معاشقے از طشتِ بام کیے۔ اسی سلسلے میں فوزیہ نے ریحانہ کے خلاف ایک ایسی ناقابلِ تحریر بات کہی کہ ریحانہ زبانی جنگ کو چھوڑ کر اور خم ٹھونک کر میدانِ عمل میں کود پڑی اور دونوں دست بدست جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ریحانہ نے کپڑے دھونے والا ڈنڈا پکڑ لیا جبکہ فوزیہ باورچی خانے سے بیلن اُٹھا لائی۔ اِدھر امی اور ساس صاحبہ بھی دوبدو معرکے پر آمادہ ہو گئیں اور یوں میدانِ کارزار دھما چوکڑی کے باعث کسی اسمبلی کا منظر پیش کرنے لگا۔ فضا ''ہائے اللہ! اوئی اللہ'' اور ''ڈور دفعان'' کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ ایسے میں دروازے پر بڑے زور کا کھڑکا ہوا۔ تمام نبرد آزما فریقین جہاں کے تہاں رہ گئے۔ ایک شور اُٹھا کہ ''پولیس آگئی' پولیس آگئی'' یہ سنتے ہی ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ الغرض پولیس آئی اور تمام ''مجاہدین'' کو جنگی قیدی بنا کر لے گئی۔ دیکھیں جنگی قیدی اَب کب چھوٹتے ہیں۔

☆☆

ذرا دیکھ بھال کے

مشکل بنی ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے
بجلی گِری ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے
یہ کوچہ رقیب ہے ، خطرہ ہے جان کا
نالی کھدی ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے
پختہ نہیں ہوں عشق میں ، ڈرتا ہوں بار بار
وہ بھی ڈری ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے
شادی کے بعد صورتِ احوال اور ہے
دو دن خوشی ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے
اس دور میں تو شاعری بازاری جنس ہے
منڈی بھری ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے
اس کی گلی میں داخلہ ساحل کا بند ہے
تختی لگی ہوئی ہے ، ذرا دیکھ بھال کے

✿ ثاقب ساحل صدیقی، کوٹ چھٹہ

مردوں میں "دماغ" تلاش کرنے والوں کی تلاش ہمیشہ خالی ہی جاتی ہے ☾ نازیہ ناز نازی

پیروڈی کریں

پیروڈی ایک دقیق فن ہے اور اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی شعر میں الفاظ کا کچھ ایسا ہیر پھیر کیا جائے کہ اس کا مفہوم یکسر بدل جائے اور شعر کی "صحت" پر بھی معتزاثرات نہ پڑیں۔ اسی رہنما اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ فلمی نغموں اور فلمی وغیر فلمی نظموں' غزلوں کی دُرگت بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اصل کلام کے ساتھ اپنی کوشش ہمیں بھجوا دیجیے۔ ہم یہاں اسے شائع کریں گے تا کہ دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اپنی "کریں" اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج پیروڈی کریں تمیں روزہ "چاند" F-31 "شمع پلازہ" فیروز پور روڈ' لاہور 54600

قتیل شفائی

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھ کو
مَیں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو
مَیں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
مَیں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو
مَیں کھلے دَر کے کسی گھر کا ہوں ساماں پیارے
تو دبے پاؤں کبھی آ کے چرا لے مجھ کو
ترکِ اُلفت کی قسم بھی کوئی ہوتی ہے قسم
تو کبھی یاد تو کر بھولنے والے' مجھ کو
مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو
تو نے دیکھا نہیں آئینے سے آگے کچھ بھی
خود پرستی میں کہیں تو نہ گنوا لے مجھ کو
بادہ پھر بادہ ہے' مَیں زہر بھی پی جاؤں قتیلؔ
شرط یہ ہے' کوئی بانہوں میں سنبھالے مجھے کو

نوید ظفر کیانی

اپنے نوٹوں کی ہواؤں میں اُڑا لے مجھ کو
مَیں ہوں لوٹا' تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو
مَیں محرر ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
مَیں جو افسر ہوں تو "پپا" سے ملا لے مجھ کو
مَیں کھلی بوری میں رکھا ہوا گڑ ہوں' پیارے!
پاؤ' دو پاؤ کبھی تو بھی منگا لے مجھ کو
ایک دو نوٹ ادا کر کبھی میری خاطر
تو کبھی فون تو کر بھولنے والے' مجھ کو
مجھ سے تو پوچھ رہا ہے کہ کرپشن کیا ہے
یہ تری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو
تو نے دیکھا نہ کبھی توند سے آگے کچھ بھی
ڈرتا رہتا ہوں' کسی روز نہ کھالے مجھ کو
لاکھ' دو لاکھ ہیں کیا بنک ہی کھا جاؤں ظفرؔ
شرط یہ ہے' کوئی تھانے سے بچا لے مجھ کو

احمد فراز

اَب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں' جاناں!
یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیماں' جاناں!
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں اِنساں' جاناں!

ایس جی طارق

بجٹ کم ہونے کا نہیں کوئی بھی امکاں' جاناں!
عالمی بینک سے حکومت کا ہے پیماں' جاناں!
تجھے میک اَپ کے سوا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں اِنساں' جاناں!

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو افسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں' دل تو ہے ناداں' جاناں!

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں' جاناں!

زندگی تیری عطا تھی' سو تیرے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی' تیرا احساں' جاناں!

اَب تیرا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں' جاناں!

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہوئے اوراق پریشاں' جاناں!

ثاقب لکھنوی

ہجر کی شب نالہ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دُعا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دِل مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے' پھر ہوا دینے لگے

جز زمین کوئے جاناں کچھ نہیں پیش نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا' صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا' وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا
کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو کبھی افسر تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں' جاناں!

ہر کوئی ساس کی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سالے سے ہراساں' جاناں

زندگی بھر کی کمائی تیرے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی' تیرا احساں' جاناں!

سالی' سالے' سسر' ساس مرے گھر آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں' جاناں!

بجٹ آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہوئے اوراق پریشاں' جاناں!

شمس القمر عاکف خٹک

روز و شب بیگم اگر ایسی سزا دینے لگے
دیکھنے والے ترس کھا کر دُعا دینے لگے

نرس کی تیکھی نگاہوں' شوخ اداؤں کے سبب
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

تیری خاطر گاؤں کے ہر شخص کا مقروض ہوں
جو بھی دیکھے میرا دروازہ' صدا دینے لگے

ظالموں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن میں پتے تھے' وہی تنکے ہوا دینے لگے

ہار لے کر ہاتھ میں' دوست آ گئے وقتِ نکاح
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

معترف ہو جائے ہر بیمار اِن کے کام کا
ڈاکٹر گر فی سبیل اللہ دوا دینے لگے

اگر علامہ اقبال آج زندہ ہوتے تو آج کے "مردِ مومن" کے کرتوت دیکھ کر شاعری سے توبہ کر لیتے ☾ نازیہ ناز نازی

سندیسے

"چاند" کے شوخ و شریر ساتھیوں کی آپس میں ہنستی مسکراتی سرگوشیوں کے علاوہ چھیڑ خانی والی "تو تو میں میں" کے لئے یہ کالم مخصوص ہے۔ آپ بھی کسی کے نام اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں تو ہم بلا معاوضہ آپ کا یہ پیغام پہنچا دیں گے لیکن ذرا حدِ ادب کا خیال رہے اور طوالت کا بھی ---- سندیسے اس پتہ پر ارسال فرمایئے۔

انچارج سندیسے تیس روزہ "چاند" "شمع پلازہ" فیروز پور روڈ لاہور 54600

شاہد اطہر صاحب! آپ آج کل کہاں غائب ہیں؟---- حنیف گجر! SMS بھی کرتے رہو، سندیسے لکھنے کیوں چھوڑ دیئے؟---- شوکت علی مظفر! تم بھی سندیسے سے غائب ہو، کیا کسی ٹی وی چینل کیلئے لکھ رہے ہو؟---- بابو خان! میں تمہارے نمبر پر فون کرتا رہا، تم میرا فون بھی اٹینڈ کرنا گوارا نہیں کرتے---- آداب عرض کیلئے بھی میں نے تقریباً ہر سلسلے کیلئے تحریریں بھیجیں تھیں مگر آداب عرض میں میرا ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوا۔ آخر کیا وجہ ہے، جواب ضرور دیجئے گا؟

✿ زاہد حسین زاہد

موبائل نمبر: 0312-4070771

☆

محترم خالد بن حامد اور دیگر قارئین کی خدمت میں آداب۔ چاند آج ہی ملا ہے۔ یہاں ہمیں دو باتوں کے بے حد خوشی ہوئی۔ ایک یہ کہ تمام کالیاں اس محفل سے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب پائی گئیں اور دوسری یہ کہ کچھ گمشدہ ہستیاں چاند میں واپس آ گئیں۔ ان سب کو دلی طور پر خوش آمدید کہتا ہوں---- خادم حسین مجاہد! آپ کو تو بورڈ میں نصاب کا چیف سلیکٹر ہونا چاہئے تا کہ مجھ جیسے نالائق سٹوڈنٹ کے لئے آ-سانی ہو سکے---- منظور احمد اعوان! سرزمین حجاز پر ہمارے لئے اور اس پاک وطن کی سلامتی کے لئے دعا کرتے رہیے گا---- تحسین بھائی! کبھی آیئے نا، اس محفل میں۔ ہمیں آپ کا انتظار رہے گا---- گیلانی بھائی اور بہنیں بھی آج کل گم ہیں؟---- صابر مغل! اب آ ہی گئے ہیں تو نئے سرے سے "مغل پلس مغل" لکھیے، ہم منتظر رہیں گے---- آخر میں گنڈہ پور خان، اکبر بخاری، توصیف اور مبشر لاہور کو دل کی گہرائی سے سلام---- منظور احمد اعوان! آپ کا نمبر شائع ہوا ہے، کیا اس کے علاوہ کوئی لینڈ لائن نمبر ہے؟ ضرور بتایئے گا۔

✿ محمد فیضان، ہری پور ہزارہ

Faizan2011pk@hotmail .com

☆

جناب اکبر بخاری صاحب! اگر اسم میں ایک صیغہ واحد غائب بھی تو ہوتا ہے، آپ ہمیں وہی سمجھ لیجئے اور اگر آپ میری تلاش میں نکل پڑے تو عوام کیلئے جمع غائب ہو جائے گا---- جناب ڈاکٹر فیاض مغل صاحب! فقط والسلام ---- جناب منظور احمد اعوان صاحب! آپ کا علاج جس کے پاس ہے، وہ آپ کی سمت میں نہ ہے۔ لگتا صاف ہے کہ جناب وہ آپ کی سانسوں دھڑکنوں اور رگ رگ میں ضرور ہے---- جناب امین بابر صاحب! آپ کو شناسا نہ ملنے کا رنج ہے ہمیں درد آشناؤں کی کثرت مار ڈالتی ہے---- محمد صابر مغل صاحب! ہماری طرف سے بھی آپ کے ساتھ تشریف لانے والی تفصیل، بھائی کو ایڈوانس خوش آمدید۔ جم جم آؤ---- محمد فیضان ہری پور او دیگر احباب میں اگر تو ہمارا شمار بھی ہوتا ہو تو وعلیکم السلام---- جناب محمد تنویر عامر صاحب! آپ کی جسارت لائق تحسین ہے---- گنڈہ پور خان صاحب! آپ کو چاند لیٹ ملا، بھائی صست والی بات کی سمجھ آ گئی تو ٹھیک ورنہ رہنے دو---- معصوم جگا! آپ کی جگا شاہی ہے، ہمیں تو یاد بھی نہیں فرمایا، شکر ہے کیونکہ تھانیدار جگا اور نصیبو لال جس کو یاد کرنے لگیں، اس کی خیر نہیں ہوتی---- توصیف بھائی صاحب! ابھی تو ہے وہ اپنا پن کہ وہ ملے تو بے تکلف، نہ ملے تو بے ارادہ۔ چاند کی رونقیں ہیں ہی ایسی کہ جب بھی آ جاؤ، دل خوش ہو جاتا ہے---- چاند سندیسے کی محفل کافی مختصر رہی۔ نام لے کر سلام کہنے میں ایک قباحت ہے کہ جن احباب کے نام نہ لئے جا سکیں، وہ سمجھتے ہیں ہم سے ناراض ہیں۔ سندیسے میں جو دیار بھیں، ان کو جواب دینے میں آسانی ہے کہ دید کے جواب میں وادیہ ہو جاتی ہے مگر اس مرتبہ یہ بھی کم رہی لہٰذا اب ہم ان تمام دوست احباب، خوش ناراض، چکور چکورنیوں اور قارئین کو دل کی گہرائیوں سے السلام علیکم عرض کرتے ہیں، جو بھی بھی کہیں بھی ہمارے سندیسے کی ان سطور کو پڑھنے کی زحمت فرمائیں گے۔ حسب عادت" کچھ عرض کیا ہے" سے پہلے کہنا چاہتے ہیں کہ چاند بھی اُن اہم عوامل میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے لوگوں یا خاص طور پر ہماری زندگی میں بڑی اور دور رس تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اور ہوتی بھی ہیں۔ خدا خالد صاحب اور ان کی ٹیم کو لمبی عمر اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ حسب عادت عرض کیا ہے----

دل بے حال ہے نالہ سحر چھوٹ گیا
اس قدر جلد چلے ہم کہ سفر چھوٹ گیا
تم نے کچھ ایسے مہربان، ہمیں جھڑکا ہے
جزز جاں ذکر تمہارا تھا مگر، چھوٹ گیا
چارہ گر آبلہ پائی سے آگے نہ بڑھے
جان کا روگ تھا جو زخمِ جگر چھوٹ گیا
تیری ہمدردیاں صیاد، سر آنکھوں پہ میرے
تیر اب تیری کمان سے تو مگر، چھوٹ گیا
یاد کرکے تجھے یادیں میری روتی ہیں، رضا
بعد تیرے میری یادوں سے بھی گھر چھوٹ گیا

✿ مستر ڈب کلاں

☆

یہ مردوں کے کمال کا ہی نتیجہ ہے کہ ملک آج تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے ☾ غزل رانی

قابلِ صد احترام، محترم القام جناب خالد بن حامد صاحب! آداب وتسلیمات۔ چاند آنکھوں میں سمایا ہے، پیارے، صرف بالغ ہی پریشان حال نہیں، بچے اور بوڑھے بھی پریشان ہیں۔ "لیڈروں" نے مہنگائی کا تیر چلا کر انسان کو چھید چھید کر دیا ہے۔ زندگی اجیرن ہی نہیں، قابلِ رحم ہو گئی ہے۔ یہ عالمی سرمایہ داری نظام جو وسائل کو چند ہاتھوں میں سمیٹ لینے کا جادو ہے، بڑا خطرناک اور انسان کش اور انسانیت کش حربہ ہے۔ جو حرص، و آزار کے نت نئے پھندے بُن کر انسان سے اس کی انسانیت چھینتا جا رہا ہے۔ عنقریب یوں ہوگا کہ گوداموں میں نوٹ بھرے ہوں گے اور اناج چٹکیوں میں بکنے لگے گا۔ ایسے چکر بلکہ محض چکر شیطان نے ترتیب دیئے کہ ہر موڑ پر قہقہے لگانے کا سامان اکٹھا ہو گیا ہے---"نگاہ انتخاب" محمد سعید خان کے صدقے، حُسنِ نظر ہو تو ایسا۔ مزہ آ گیا۔ سندیسے کی محفل اس بار پھیکی پھیکی سی ہے، شاید اس لئے کہ صفحات کچھ کم ہیں۔ بھئی، صفحات بڑھاؤ۔ سندیسے تو چاند کی جان کی چاند کی جان ہیں بلکہ یہ صفحات تمام چکوروں اور چکورنیوں کی روح ہیں---ثاقب ساحل صدیقی! ہمارا مطب خالص طب یونانی کی ادویات پر چلتا ہے۔ یہ مینٹل ہسپتال میں پیارے، جہاں انگریزی ایک ایک فٹ لمبی سرنجوں کے دماغی امراض کے مریضوں کے علاج کیا جاتا ہے۔ بھئی، یہاں تو ان مریضوں کو بھیجنا جو "اُم الامراض" کا شکار ہوں---محمد صابر مغل عیدو پوری! خوش آمدید پیارے---گنڈہ پور خان! استاؤ پیارے! کیا شاگرد بنو گے؟---قمیر اللہ خان کھوسو! پیارے، آپ کی شخصیت میں خلوص ومحبت کی جولانی قدرتی عطیہ ہے۔ اسے کبھی ضائع نہ ہونے دینا---فضل کریم شگفتہ! یہ پروین شاکر کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہو؟ کسی قدر شاعر کو بھی پکڑو۔ خیر، بحر خوب گی ہے---حنیف گجر! مان جاؤ، چاند کے بغیر گزارہ نہیں ہووے گا---بشر حسین شاہ اور پیارے ایاز! کدھر ہو بھائی، چلو آؤ، انٹری دو۔ آپ کا کردار آ گیا ہے---چاند کے سب باسیوں کی خدمت میں ایک پیام اور وہ پیام ہے انسانیت کا۔ دوستو! انسان ہو تو انسان سے پیار کرنا بھی سیکھو، زندگی بہشت بریں بن جائے گی۔ آؤ مل کر زندگی کو جنت نظیر بنا دیں۔

✪ اکبر بخاری، شجاع آباد

☆

انکل خالد بن حامد اینڈ آپی عصمت ضیاء! میں آپ کو ملا، بہت خوشی ہوئی---انکل خالد بن حامد! آپ اب بھی دبنگ سلمان خان کی طرح نوجوان ہو۔ دو ماہ سے بزی تھا اس لئے چاند میں نہیں لکھ سکا---چاندنی سحرش جی! آپ کیسی ہیں؟ آپ نے جو چکوروں کو سٹریل کہا، ان چکوروں کی وجہ سے تو چکورنیوں میں حسن ہے۔ جیسے پھولوں میں خوشبو ہے، ایسے ہی چکوروں سے چکورنیاں ہیں۔ لڑکیاں جو میک اپ اور فیشن کرتی ہیں، صرف اور صرف لڑکوں کیلئے کرتی ہیں ورنہ کیا انہوں نے اپنا حسن بندروں کو دکھانا تھا؟---سبحان خان نیازی! وعلیکم السلام۔ آپ کیسے ہو اور آج کل کہاں بزی ہو؟---انکل تنویر پھول! آپ کو بہت پیار اور سلام---عمران ہاشمی! آپ بہت اچھے اچھے SMS کرتے ہو، اس کیلئے تھینکس۔ لگے رہو---فرہاد مزمل صدیقی صاحب! کیا بھابی نے چاند میں لکھنے سے روک دیا جو آپ نہیں لکھ رہے؟---منظور احمد اعوان! آپ نے اتنی دور جا کر بھی یاد کیا، اس لئے بہت بہت شکریہ۔ آپ جہاں رہو خوش رہو۔ میری اللہ سے یہی دُعا ہے---مسٹر ڈنکلاں جی! خواب دیکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا اس لئے لڑکیوں کو خواب دیکھنے دو کہ وہ چکوروں کو چاند سے بھگا دیں گی---وسیم شہزاد بھائی! انشاء اللہ، کبھی ملیں گے، زندگی نے وفا کی تو---ایم حنیف گجر صاحب! ہم آپ کو بہت مِس کرتے ہیں، آپ واپس آ جاؤ---مہک خان! آپ کیسی ہو اور آپ کی فرینڈ کا کیا حال ہے؟ آجکل بزی ہونے کی وجہ سے رابطہ نہیں ہو سکا---صوفیہ غزل! آپ پیشانیاں اچھی لکھتی ہو پر لڑکوں کے خلاف جو لکھتی ہو، جھوٹ لکھتی ہو---اینڈ بس پھوپھا مشتاق، بشر شاہ، دلاور خان، SH ساگر، ٹارزن 421، زاہد حسین زاہد، اکبر بخاری، ڈاکٹر فیاض مغل، توصیف! آپ سب کو دل کی گہرائیوں سے سلام!

✪ ثاقب ساحل صدیقی

موبائل نمبر: 0313-6678000

☆

تمام کاکے اب خبردار ہو جائیں کیونکہ شہلا کے بعد میری کزن رضیہ بھی "چاند" کی سرزمین پر قدم رکھ رہی ہے اور ہم سب کاکیوں کا مشن ہے کہ "چاند" کی سرزمین سے تمام کاکوں کو بھگانا ہے---توصیف بھائی! ویلکم کیلئے شکریہ۔ آپ نے کہا کہ کاکوں کو بھگانے کی بجائے پیار بانٹنے کی بات کرتی؟ آپ خود بتائیں کہ اگر کسی کاکے سے سیدھے منہ بات بھی کر لو تو وہ اپنے آپ کو شاہ رخ یا شاہد کپور سمجھنے لگتا ہے اور پھر نمبر بنانے کیلئے دوستوں کو بتاتے ہیں کہ فلاں لڑکی میری دوست ہے۔ واہ، آفرین ہے آپ سب کاکوں پر---معصوم جگا! میرا خیال ہے، آپ نے ہم کاکیوں کو بدنام کیا ہوا ہے کیونکہ اگر آج کے لڑکوں کا فیشن دیکھا جائے تو چھلا ہوا آلو لگتے ہیں۔ میک اپ تو لڑکیوں سے بھی زیادہ کرتے ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ نقاب اور چوڑیاں پہن لو تو آپ میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں رہے گا---گنڈہ پور خان! اگر لڑکیوں میں اکڑ ہوتی تو آج تم سب جوتی کی نوک پر ہوتے اور رہی بات سر جھکانے کی تو شادی کے بعد بے چارہ مرد سر جھکا کر بیٹھا رہتا ہے۔ عورت تو فرمانبرداری کی ایک لاجواب مثال ہے۔ جس گھر میں عورت کا سایہ نہ ہو، وہ گھر ویران ہوتا ہے---تنویر عامر! لڑکیاں غصہ بھی کریں تو کس پر کریں اور اگر غصہ کیا تو تم کاکے "چاند" کی سرزمین سے دُم دبا کر بھاگ جاؤ گے---مسٹر ڈنکلاں! آپ کو چاند میں دیکھ کر خوشی ہوئی---ثاقب ساحل صدیقی کا اینڈ فرہاد مزمل صدیقی! ویلکم ان "چاند A" آپ پیشانیاں اچھی لکھتے ہیں۔ آئندہ لڑکیوں کے خلاف مت لکھنا ورنہ---اس کے علاوہ تمام کاکے اپنے دماغ کے تمام ڈھیلے نٹ کسوا لیں، پھر کہیں یہ نہ سمجھنا کہ خبر نہ ہوئی اور چاند کی سرزمین پر کاکیوں کی حکومت قائم ہو گئی---انکل خالد اینڈ آنٹی عصمت ضیاء کو سلام!

✪ شہلا، کوٹ چھٹہ

☆

ڈیئر عصمت آپی، سویٹ چکورنیو! کیسی ہیں

آپ؟---- حاضر خدمت ہوں۔ جن لوگوں نے مجھے یاد کیا، اُن کا بہت بہت شکریہ اور کچھ احمقوں کی رائے تھی کہ "نازی" ہم سے ڈر کر چلی گئی ہے حالانکہ سب کو پتہ ہے کہ نازیہ ناز نازی کسی سے ڈرنے والی نہیں۔ ان احمقوں کی خدمت میں عرض ہے کہ عقل کے ناخن لو، نازیہ آپ کے سینوں پر مونگ اور دوسری کئی دالیں دلنے کے لئے آ گئی ہے۔ یقیناً اب تم لوگ راہِ فرار حاصل کرنے کی کوشش کرو گے مگر کسی کو بھاگنے نہیں دیا جائے گا، تمام کاگوں کا احتساب ہوگا۔ تم نے ہماری غیر حاضری میں بہت بڑھکیں لگائیں، اب تمہاری ایک نہیں چلے گی۔ سویٹ چکورنیو! اب کاگوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اب ہمارا نام دیکھتے ہی کاگوں کے پسینے چھوٹنے لگیں گے---- حنیف گجر! آپ سے فون پر بات کر کے خوشی ہوئی۔ اب آپ چاند میں واپس آ جائیں---- چاندی! جی آیاں نوں---- شبانہ گیلانی! ہم حاضر ہیں---- شہلا! ویلکم ان چاند۔ دیکھنا ہمارا نام دیکھتے ہی کاگوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے---- پھوپھا مشتاق! آپ کو چاند میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خالہ زبیدہ اور بابا رونقی اور آخری درویش کو بھی ساتھ لے آتے۔

✪ کاگوں کے چھکے چھڑانے والی، نازیہ ناز نازی

میر پور خاص

☆

سرزمین چاند کے پُرستاروں کو محبت اور عقیدت بھرا اسلام۔ کافی عرصہ سے دور رہنے کے بعد ایک بار پھر ناطہ جوڑ رہا ہوں۔ جن دوستوں نے یاد کیا اُن کا بہت بہت شکریہ---- ڈھمی گڑیا! آپ نے یاد کیا، آپ کا بہت بہت شکریہ خوش رہنا سیکھیں---- فیضان! بہت مصروف رہتے ہو؟---- مظہر حسین بھٹی! آپ آواز ہ توازہ مت کریں۔ جو کام کہا تھا، کر دیں---- حنیف گجر! آپ کو ٹھیک کرنے کے لئے آنکس استعمال کرنا پڑے گا کیونکہ آپ سدھرنے والے نہیں ہیں---- ابرار گیلانی! ہر وقت یاد رکھنے کا بہت بہت شکریہ---- فضل کریم شگفتہ! سر، آپ بالکل ہی خاموش ہو گئے ہیں، کہیں اکیلے ہی کالا باغ ڈیم بنانے کے چکر میں تو نہیں ہیں؟---- منظور احمد اعوان صاحب! وہاں جا کر لوگوں کے حالات خراب کیوں ہو جاتے ہیں؟---- ابرار بخاری! سر، اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔ پیر جی! غصہ لازمی کرنا---- اکبر بخاری! صدقہ دینے سے سب بلائیں ٹل جاتی ہیں سوائے بیوی کے---- مہک خان! کبھی لیہ، کبھی پشاور، کبھی سعودی عرب، یہ کیا ماجرا ہے؟---- محمود گیلانی! آپ سے دو نہیں، تین ہاتھ کرنا پڑیں گے۔ بہت بول لیا آپ نے---- عمران ہاشمی! غم نہ کرو، آپ بھی گل خان کے کندھوں پر جنت میں جاؤ گے---- S.H ساگر! تم پاس ہو کر بھی بہت دور ہو ہم سے---- مبشر حسین! آپ کو خدا تعالیٰ صحت دے لمبی عمر اور ڈھیر ساری خوشیاں عطا فرمائے---- ثاقب ساحل! ہم ناراض نہیں ہیں، بس احتشام سے اجتناب کرتے ہیں---- صابر مغل! مفت کا ادب آپ کو مل گیا، اب ذرا جلدی سے اپنا بوریا بستر اٹھا کر چاند پر واپس آ جائیں۔ ہا، ہا، ہا---- شہلا! خوش آمدید---- صوفیہ غزل، بینی خان، گلشن فاطمہ، فتنہ، چاندی سحرش، مستجاب زیدی، ثمیرا ارم، غزالہ ثاقب، عائشہ مغل اور وہ تمام کاگیاں جو اپنے آپ کو اپسرا سمجھتی ہیں، ایسے ہیں جیسے کملیوں کا نمبر۔ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں آتا آپ کو۔ ہر کوئی تمہیں بے وقوف بنا جاتا ہے جبکہ تم چلی ہو چاند پر حکومت کرنے کا ٹھیکہ لینے۔ دو ماہ بعد کوئی ایک کاگی سندیسہ لکھتی ہے لیکن ہر بار دُم دبا کر وادی نازیہ کے پاس بھاگ جاتی ہے---- چاند میں اکثر کاگے اور کاگیاں ڈبل رول کرتی ہیں۔ اب چند ایک کو تو ہم اچھی طرح جان گئے ہیں اور جو باقی رہ گئی ہیں، ان کو بھی جان جائیں گے۔ اب آپ سب اپنے حال سے آگاہ کریں۔ آخر میں خالد صاحب اور آنٹی عصمت ضیاء اور ان تمام دوستوں کو جن کا نام نہ لے سکا، کو پیار بھرا اسلام!

✪ ماڈرن مولوی

موبائل: 0345-7084007

adnan-jazeb@yahoo.com

☆

سر کی جوئیں رینگنے بلکہ دوڑنے لگیں جب انہوں نے میرا نام پڑھا لیکن چکور اور چکورنیوں آپ کو شیکسپیئر کا وہ قول تو یاد ہوگا جس میں وہ کہتا ہے کہ گلاب کو کسی بھی نام سے پکاریں، وہ رہتا گلاب ہی ہے لیکن اک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ گلاب خان کو کس نام سے پکاریں؟---- محترم وسیم شہزاد! سفید بینگن کو آپ انڈا کہہ سکتے ہیں مگر صرف ایک بار، کیا سمجھے؟---- چڑیلوں کی دادی، نازیہ ناز نازی! تمہاری تو مت ہی ماری گئی ہے جو اس طرح روپوش ہو گئی ہو۔ اگر ہمت ہوئی تو مجھ سے ضرور ٹکرا لینا، میں آپ کی ساری اکڑ نکال کے رکھ دوں گا---- سارہ نازیہ سحر، پروین! آپ کو بھی پُر خلوص سلام قبول ہو۔ نام کی وجہ سے غلط مطلب نہیں لینا کیونکہ میں ہوں بندہ ذرا "وکھری" ٹائپ دا---- حنیف گجر! آپ کی تو چاند سے منہ ماری کی وجہ سے کٹی سی ہو گئی ہے۔ ذرا بتایئے، آپ تو ہمیشہ جاتے وقت ریٹرن ٹکٹ بھی ساتھ ہی لے لیا کرتے تھے تو چاند کے معاملے میں ایسا کیوں نہیں ہے؟---- قاسم تنویر اعوان! پھر کب رونق افزائی کا موقع "عنایت" فرماؤ گے؟

✪ عمران ہاشمی

موبائل: 0333-5547990

blyff.master128@yahoo.com

☆

ماہنامہ چاند سے تعلق رکھنے والے تمام لکھنے پڑھنے والوں کو سید ابرار گیلانی کا خلوص و محبت بھرا سلام۔ جناب خالد بن حامد صاحب! اسلام علیکم ---- پچھلے دو عدد سندیسے آپ نے شاید ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے؟---- تمام لکھنے والے بہت خوب لکھتے، ماشاء اللہ---- سدرہ ناز صاحبہ! آپ نے موبائل کے متعلق اپنے سندیسے میں لکھا۔ ہر چیز کا استعمال انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ موبائل ایک مفید چیز ہے۔ اگر اس کا استعمال صحیح کیا جائے تو۔ اس کا استعمال تو اپنے اپنے ہاتھ میں ہے---- صبا اساور! آپ کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کے زورِ قلم میں اضافہ فرمائے---- تمام دوستوں کو دعا و سلام!

✪ سید ابرار گیلانی، راولپنڈی

موبائل: 0306-5042603

☆☆

شکل دکھائی نہیں دی۔ میں تمہارے ہی بچوں کی (بھیانک) شکلیں دیکھ دیکھ کر اُکتا گیا ہوں۔ اَب میرا دل اِس اُجڑے چمن میں نہیں لگتا ہے۔ میں تمہارے گھر کی ٹیوشن چھوڑنا چاہتا ہوں' میرے لئے منڈی کا کام ہی کافی ہے۔"

"نہ بیٹا! نہ--- مایوسی گناہ ہے۔" چاچا نے پیار سے سمجھایا۔ "تم جوان آدمی ہو' حوصلے اور صبر سے کام لو۔ بچے اِن شاءاللہ بڑھ جائیں گے' منہ کو ٹیڑھا میڑھا کرنے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے ہیں لہٰذا تم اپنا موڈ ٹھیک رکھا کرو اور ہاں' رہی میرے بچوں کی ٹیوشن چھوڑنے کی بات تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ آئندہ کبھی ایسا سوچنا بھی مت۔ ہم بلوچ لوگ ذرا وکھری ٹائپ کے ہوتے ہیں' ذرا ذرا سی بات پر خون خرابے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی گزند پہنچے۔" اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں دھمکی دی۔ آج چاچا بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ میں اندر ہی اندر لرز اُٹھا۔

چند روز بعد چاچا کہنے لگا۔

"میرا ایک یار ہے فضل دین۔ میرے گھر سے دو گھر چھوڑ کر اُس کا گھر ہے۔ اُس کی تین جوان جہان بچیاں ہیں' بیٹا کوئی نہیں ہے۔ بیوی اُس کی حرکتوں سے عاجز آ کر گزشتہ برس زہر کھا کر مرگئی تھی۔ وہ بچیوں کو پڑھانا چاہتا ہے۔ میں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے میں دیکھوں گا' پرکھوں گا' پھر بتاؤں گا کہ یہ ماسٹر رکھنا ہے یا نہیں رکھنا ہے۔ تم اِدھر سے فارغ ہو چکو تو اُس کے پاس چلیں گے۔ ٹرائی کر کے دیکھتے ہیں' شاید کام بن جائے۔"

میں نے چاچا کا شکریہ ادا کیا جس نے میری خاطر اتنی بھاگ دوڑ کی تھی۔ ٹھیک نو بجے ہم چاچا فضل دین کی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اِس بیٹھک کی حالت چاچا غلام رسول کی بیٹھک سے قدرے بہتر تھی۔ چاچا فضل دین' چاچا غلام رسول کا ہم عمر لگتا تھا۔ اُس کی داڑھی اور مونچھیں لال تھیں۔ وہ خوب گورا چٹا اور ہٹا کٹا تھا--- وہ ہم سے بیحد اخلاق سے پیش آیا۔ ابھی وہ خیر خیریت دریافت کر ہی رہا تھا کہ اندر سے تالی کی آواز سنائی دی۔ وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ پھر "ابھی آیا" کہہ کر اُٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ٹرے میں چائے اور بسکٹ لے آیا۔ بسکٹ کھانے اور چائے کی چسکیاں لینے کے دوران باتیں ہونے لگیں۔

"برخوردار! تمہاری تعلیم کتنی ہے؟" چاچا فضل دین نے پوچھا۔

"چاچا! میں نے ایم اے کیا ہوا ہے۔" میں نے بتایا۔

"یہ ایم اے کیا ہوتا ہے---؟" اُس نے استفسار کیا۔ "میں اَن پڑھ اور سیدھا سادہ بندہ ہوں' تم مجھے سیدھے لفظوں میں بتاؤ۔"

"چاچا! میں سولہ جماعتیں پڑھا ہوا ہوں---" میں نے اُسے آسان لفظوں میں بتایا۔ "درمیان میں سی۔ ٹی کا کورس بھی کیا تھا۔"

"سی۔ ٹی کا کورس---؟" اُس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "بھلا سی۔ ٹی کے لئے کورس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے دیکھو میں نے کوئی کورس نہیں کیا ہے لیکن سیٹی اچھی خاصی بجا لیتا ہوں۔" اُس نے یکایک منہ میں اُنگلیاں رکھ کر تیز سیٹی بجائی۔ "میں سیٹی کسی گیت کی دھن پر بھی بجا سکتا ہوں' کہو تو سناؤں؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "چاچا! ایسی سیٹی نہیں بلکہ اُستاد بننے کے لئے ایک کورس ہوتا ہے' اُس کورس کا نام سی۔ ٹی ہے۔"

"اچھا' اچھا---" وہ کھسیانا ہو کر بولا' پھر کہنے لگا۔ "تم اتنے پڑھے لکھے ہو' یہاں پردیس میں کیوں جھک مار رہے ہو' کیا پاکستان کی حکمت والوں نے تمہیں کوئی نوکری نہیں دی؟"

"چاچا! نوکری وہ دیتے تھے--- وہ مجھے وزیرِاعظم بنانا چاہتے تھے مگر میری ضد تھی کہ میں صدر بنوں گا اِس لئے بات نہیں بنی۔" میں نے جل کر کہا۔

"کیوں' وزیرِاعظم بننے میں کیا حرج تھا؟ اُس کی بھی اچھی خاصی اپروچ ہوتی ہے--- کیوں' غلام رسول؟" اُس نے چاچا غلام رسول سے تصدیق چاہی۔

"ہوتا ہوگا مگر اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔" میں نے اِس تکلیف دہ موضوع سے جان چھڑانے کی خاطر کہا۔

"غلام رسول! یہ عربی جانتا ہے؟"

چاچا فضل دین نے چاچا غلام رسول سے عربی میں پوچھا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ دل میں تجسس جاگا کہ اَب ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں---" چاچا غلام رسول نے بھی عربی میں اپنا خیال ظاہر کیا۔ "اِسے پاکستان سے آئے چند ماہ ہوئے ہیں' اتنی جلدی کوئی مائی کا لعل عربی نہیں سیکھ سکتا ہے۔"

پھر دونوں بزرگ' عربی میں گٹ پٹ کرنے لگے۔ میں یوں لاتعلق سا بنا بیٹھا رہا جیسے واقعی عربی زبان سے نابلد ہوں۔

"پہلے بھی ایک ماسٹر رکھا تھا---" چاچا فضل دین بتا رہا تھا۔ "مگر مجھے اُس کے لچھن ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ کم بخت روزانہ یوں بن ٹھن کر آتا تھا جیسے پڑھانے نہیں بلکہ لڑکیوں کو رجھانے کے لئے آتا ہو۔ میں نے بھانپ لیا کہ اِس کی نیت ٹھیک نہیں ہے سو میں نے اُسے چند ہی دنوں میں چلتا کر دیا۔ اب لڑکیاں روتی ہیں اور رو رو کر کہتی ہیں